# قصر الحمراء

تصنیف

واشنگٹن ارونگ

آئینہ ادب ○ لاہور

# قصص الحمرا

اچھی
کتاب
کا
نکھار
ہمیشہ
قائم
رہتا
ہے

# قصصِ الحمرا

(قصرِ الحمرا کے افسانے اور داستانیں)



مصنّف

واشنگٹن ارونگ

مترجم

سیّد وقار عظیم



ناشران:- آئینہ ادب، چوک مینار، انار کلی، لاہور

This is a translation of THE ALHAMBRA by Washington Irving, originally published in the United States of America in 1832.

طبع اوّل ۱۹۵۹ء

تعداد ۱۱۰۰

قیمت فی جلد سات روپے ۸ر

طابع م، ع، سلام

مطبع استقلال پریس لاہور

کتابت محمد سرور صدیقی

ناشر

م، ع، سلام۔ مالک آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور

بہ اشتراک

مکتبۂ فرینکلن لاہور ــــ نیویارک

# فہرس

## قصرِ الحمرا



## الحمرا کی داستانیں

سیاحت کے آخری لمحے

# پیش لفظ

**اَلحمرا** ــــــ تاریخ کے اوراق میں یہ دل نشین نام لکھا ہوا نظر آتا ہے تو عظمت و شکوہ کے بے شمار مرقعے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔

اور جب کوئی داستان طراز کہتا ہے "الحمرا" تو سُننے والے کا دل دھڑکنے اور مچلنے لگتا ہے۔ تصور صدیوں پہلے کے رومان انگیز اور طلسمی ہسپانیہ کے طواف میں مصروف ہو جاتا ہے۔

**ہسپانیہ** ــــــ جُرأت و مردانگی کے حقائق کا گہوارہ۔

**ہسپانیہ** ــــــ پُراسرار دفینوں اور رغز بیوں کی سرزمین۔

**ہسپانیہ** ــــــ محبت کی شیریں کہانیوں اور دل آویز نغموں کی آغوشِ گرم۔

مغرب کے سحر طراز افسانہ نگار واشنگٹن اروِنگ نے الحمرا کی داستانوں میں جُرأت و مردانگی کی یہی حقیقتیں آشکارا کی ہیں، پُراسرار دفینوں اور رغز بیوں کی یہی کہانیاں لکھی ہیں اور دل آویز نغموں میں ڈوبی ہوئی یہی شیریں داستانیں سُنائی ہیں اور ایک ایسی لَے میں سُنائی ہیں جس میں حقیقت، شاعری، طلسم و افسوں کا حسین ترین امتزاج ہے۔ اسی لئے یہ کہانیاں پڑھ کر پڑھنے والا ایک ایسی دُنیا کی سیر کرتا ہے جس میں ہر طرف رومان ہیں، طلسم ہیں، اَسرار ہیں اور ایک ایسی جنت جو صرف خوابوں کو رنگین بناتی ہے اور چشمِ ظاہر سے پوشیدہ رہتی ہے۔ الحمرا کی داستانوں نے

ہمیں تمناؤں کی اِس جنّت کا جلوہ دکھایا ہے ۔

اِس جنّت کا جلوہ دیکھ کر ہمارا دل اِس آرزو سے بے قرار ہو جاتا ہے کہ کاش ! ہم الحمرا کی اِس جنّت کو دیکھ سکتے ۔

الحمرا کی داستانیں پڑھ کر اِس آرزو کی تکمیل ہوتی ہے ۔ اور طلسم و افسوں کا خوابِ دلنشیں حقیقت بن کر سامنے آتا ہے ۔

ترجمہ کرتے وقت میں نے کوشش کی ہے کہ اُس طلسم کی تاثیر باقی رہے جو الحمرا کی داستانوں کے مصنّف نے باندھا ہے ۔ لیکن اصل اور ترجمہ میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اروِنگ کی آپ بیتی مترجم کے لئے جگ بیتی ہے ۔

اِروِنگ نے اپنے بچپن کے کھیلوں میں غرناطہ کے طلسمی خوابوں کو حقیقت بنانے کے جو خواب دیکھے تھے اُن کی پہلی منزل ہسپانیہ کا وہ سفر تھا جو اُس نے ۱۸۲۹ء میں کیا ۔ اروِنگ کا شوق اُسے قصرِ الحمرا میں لے گیا اور وہاں اُس نے خاصا عرصہ " فرزندانِ الحمرا " کی معصوم اور مخلصانہ محبّت کی آغوش میں بسر کیا ۔ معصومیت ، محبّت اور طلسم و رومان کے اِس ماحول میں رہ کر اُس نے جو داستانیں جمع کی تھیں اُنھیں کا نام " الحمرا کی داستانیں " ہے ۔ اِنھیں داستانوں کا انتخاب یہ مجموعہ ہے ، اور یہی داستانیں ہیں جن کی بدولت اِروِنگ کو افسانہ گوئی کی دُنیا میں بقائے دوام حاصل ہوئی ہے ۔۔۔ اور یہ بقائے دوام اُسی کے حصّے میں آتی ہے جو قصّے کہانی کو بھی ایسی واردات سمجھے جو صرف شعر کے سانچے میں ڈھلتی ہے ۔

وقار عظیم

یونیورسٹی اورینٹل کالج

لاہور

۲۳ ، اکتوبر ۵۷ء

# تعارف

"امریکی ادب" نے ہمارے عہد کی ایک باوقار اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ کچھ مدت پہلے تک انگریزی کا ادب خواہ اس کی تخلیق نئی دنیا میں ہو یا پرانی دنیا میں "انگریزی ادب" تھا، لیکن ادب کی مختلف اصناف میں امریکہ کے لکھنے والے کبھی کبھی ایسی بلندی پر پہنچے کہ انگلستان کے ادیبوں کو اپنی پُر ثروت اور عظیم روایت کے باوجود اُن کی رفعت و عظمت تسلیم کرنی پڑی، اور اب تو بلا شبہ "امریکی ادب" کی اپنی روایت بھی ایسی ہے کہ اس پر امریکہ والے ناز کر سکتے ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ امریکہ کا بڑا کارنامہ ہے، اس لئے کہ گو امریکی ادب کی ابتدا سترھویں صدی کے بالکل شروع میں ہو چکی تھی لیکن پہلا امریکی ادیب جسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی انیسویں صدی کے شروع میں لوگوں کی نظر کے سامنے آیا — یہ پہلا ادیب واشنگٹن اروِنگ تھا۔

اروِنگ ۱۷۸۳ء میں شہر نیویارک میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ لوہے کے سامان کا ایک بڑا تاجر تھا۔ اروِنگ چونکہ اپنے کئی بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے اپنی ماں کا بڑا چہیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پرورش لاڈ پیار کی فضا میں ہوئی اور اُس کی تعلیم اس باضابطہ اور منظم طریقے سے نہیں ہوئی جیسی اُس کے

بڑے بھائیوں کی سولہ سال کی عمر تک مدرسے میں اُس کی گنڈے وار پڑھائی ہوتی رہی۔ اورنگ نے گو مدرسے کی پڑھائی کی طرف کبھی توجہ نہیں دی، لیکن اپنے طور پر وہ ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اُسے نظم و نثر دونوں چیزیں لکھنے کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر سے پہلے وہ کچھ نظمیں اور ایک ڈراما لکھ چکا تھا۔ تھیئٹر دیکھنے کا بھی اُسے بے حد شوق تھا اور باپ کی مرضی کے خلاف اس نے اسے بھی اپنی دلچسپی کا مشغلہ بنا لیا تھا چونکہ ارونگ کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی، اس لئے والدین اس پر کسی طرح کی سختی کرنے سے گریز کرتے تھے اور بعض اوقات اس کے لئے سیر و سفر کے مواقع مہیا کرنے تھے چنانچہ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۴ء میں اس نے امریکہ کے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔ اسی دوران میں اس کی نسبت ایک امریکی دوشیزہ سے ہوئی، لیکن ۱۸۰۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اور اس غم میں ارونگ نے کبھی شادی نہیں کی۔ اپنی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت اور تصنیف و تالیف میں گزارا اور اسی کی بدولت شہرت دوام حاصل کی۔ ارونگ جیسا کہ ابھی کہا گیا، پہلا امریکی ہے جو امریکہ سے باہر کی دنیا میں بھی معروف و مقبول ہوا اور جس نے اپنے بعد ادب کی ایک ایسی روایت بھی چھوڑی جس کی تقلید ذوق و شوق سے کی گئی۔

ارونگ کی تصانیف کو زمانے کے اعتبار سے پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور اس کی اُن تخلیقات کا ہے، جنہیں اس کے شوق اور ادب سے فطری مناسبت اور لگاؤ کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ابتدائی دور اُس وقت سے پہلے کا ہے جب ارونگ نے ادب کو ایک مستقل شغل اور پیشے کی طرح اختیار کیا۔ دوسرا دور اُن تخلیقات کا ہے، جنہیں (SKETCH-BOOK-GROUP) کا نام دیا گیا ہے یہ چیزیں ایڈیسن کی تقلید اور پیروی میں لکھی گئیں اور ان کا زمانہ ۱۸۰۲ء تا ۱۸۰۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے آغاز کے بعد ارونگ نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں سے دلچسپی پرکئی ایسی چیزیں لکھیں جنہوں نے اُسے نہ صرف امریکی ادب میں ایک مستقل حیثیت دی، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی معروف کیا۔ اسی دور میں ارونگ نے نکر باکر (DIEPRICH KNICKER BOCKER) کے فرضی نام سے نیویارک کی تاریخ لکھی۔ اس کتاب کو امریکی ادب کا ایک اہم سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ ارونگ کی تصانیف کے تیسرے دور یا گروہ میں اُس کی وہ تخلیقات شامل ہیں، جو اسپین سے متعلق ہیں۔ الحمرا کی داستان اسی گروہ کی کتاب ہے۔ چوتھے اور پانچویں گروہ کی

کتابوں کا موضوع علی الترتیب مغربی امریکہ کی زندگی اور متفرق سوانحی تصانیف ہیں

اروِنگ کی ان مختلف اور گوناگوں تصانیف کے موضوعات بھی مختلف ہیں اور وقت کے ساتھ ان کے اسلوب میں بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے، لیکن اس فرق کے باوجود بعض باتیں ایسی ہیں جو اس کی ہر طرح کی تصانیف اور تخلیقات میں مشترک ہیں۔ نقادوں نے اس کے بدلتے ہوئے اسالیب کا ایک مشترک اور نمایاں پہلو یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے طرز میں ہر جگہ ایڈیسن، اسٹیل، اسٹرن، ہیگنزبی اور گولڈسمتھ وغیرہ سے بہت متاثر ہے، اور یہ سب اٹھارھویں صدی کے ایسے لکھنے والے ہیں، جن کے طرز میں ہر جگہ جذبے اور خوش ذوقی کا بڑا لطیف امتزاج ہے۔ اروِنگ کے طرز کی دوسری اہم خصوصیت جو حقیقت میں اس کے مزاج اور مذاق کی خصوصیت ہے، یہ ہے کہ اس کے لیے ہر اس چیز میں کشش ہے جو قدیم ہے اور جس پر رومان کی رنگینی اور سحر کا سایہ ہے یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے اُس کے مجموعی کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اروِنگ کی کشش اس میں نہیں کہ اس نے کیا لکھا ہے، بلکہ اس میں ہے کہ اس نے کیسا لکھا ہے۔ گو موضوع اور اسلوب کو ایک دوسرے سے الگ کرنا کسی مصنف کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ لیکن یہ ناانصافی اروِنگ کے معاملے میں جائز رکھی گئی ہے۔ اس خیال کو ایک اور بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے اور وہ یہ کہ امریکہ کے لکھنے والوں میں اروِنگ ایک لحاظ سے اُن لکھنے والوں کا پیش رو ہے، جنہوں نے اپنی تحریروں کو "اصلاحی مقصد کی آلائش سے محفوظ رکھا ہے"۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے، جن کا موضوع زندگی کے گوناگوں پہلو ہیں، ہر طرح کے پڑھنے والے کے لیے دلچسپ اور اس کی فرصت کے وقت کا بڑا اچھا مشغلہ ثابت ہوئے ہیں۔ اور یہ بات اس کی ان تحریروں کے متعلق اور بھی زیادہ یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے جن کا موضوع اسپین کی رومان انگیز سرزمین ہے، اس لئے کہ اس سرزمین کی داستانیں لکھتے وقت اروِنگ کے رومان پسند تخیل کی جولانیوں کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ اروِنگ کو ہر اُس چیز سے جو قدیم ہے والہانہ محبت ہے اور اس محبت کا اظہار اس نے ہمیشہ ایسی خوش ذوقی اور نفاست سے کیا ہے۔ جو نازک اور لطیف ہونے کے باوجود نسوانیت سے دور اور مردانگی سے قریب تر ہے۔

اروِنگ کی ہسپانوی دور یا گروہ کی تصانیف میں فتح غرناطہ (CONQUEST of GRANADA)

فتح سپین کی داستانیں (LEGENDS OF CONQUEST OF SPAIN) حیاتِ کولمبس اور الحمرا کی داستانیں وغیرہ شامل ہیں۔ اسپینی دور کی تصانیف کے موضوعات کے انداز اور ارونگ کے رومانیت پسند مزاج میں ایسی مناسبت اور ہم آہنگی ہے کہ اس نے ان موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے اُسے خواص اور عوام دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ارونگ کے لیے ماضی میں جو کشش اور دلچسپی ہے اس کی بنا پر اس نے تاریخ اور سیرت کے موضوع پر بار بار قلم اٹھایا ہے، لیکن اس کی رومان پسندی اور رنگینیٔ تخیل نے تاریخ و سیرت کی صداقتوں میں جو رنگ آمیزی کی ہے اُس نے اس کی کاوشوں میں جا بجا افسانے کا رنگ پیدا کر دیا ہے اور اس کے باوجود کہ اس کی تاریخ اور سیرت کی کتابیں گہری تفتیش تحقیق اور جستجو کا نتیجہ ہیں، انہیں دربارِ عالم کے بجائے بزمِ افسانہ میں جگہ ملی ہے تاریخ و سیرت لکھتے وقت وہ اہم اور غیر اہم میں امتیاز کئے بغیر صرف ان چیزوں پر توجہ کرتا ہے جو نظر فریب اور دل آویز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہسپانوی گروہ کی تصانیف میں اور خصوصاً الحمرا کی داستانوں میں اس کی شخصیت، اور مزاج کا پورا چاؤ اور اس کی رنگینیٔ ذوق کا پورا پرتو نظر آتا ہے۔

الحمرا کی داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکی ادب کے ایک مورخ نے ایک پتے کی بات لکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس کتاب میں ارونگ کو پوری آزادی سے یہ موقع ملا ہے کہ وہ مورخ کی حق جوئی اور حق گوئی سے بے نیاز ہو کر اپنے مشاہدات میں تخیلات کی رنگ آمیزی کرے۔ مشاہدے میں تخیل کی یہ گہری رنگ آمیزی الحمرا کی داستانوں کی دل آویزی کا ایک سبب ہے، گو اس دل آویزی کے اور بھی کئی سبب ہیں۔

الحمرا کی داستانیں مئی ۱۸۳۲ء میں چھپی تھیں۔ اس کتاب کو ارونگ نے ایک خط کی صورت میں اپنے دوست ڈیوڈ ولکی کے نام معنون کیا ہے جو الحمرا کی رومانی مہموں میں ان کے شریک اور ہم سفر تھے۔ اس خط کی عبارت اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں اس جذباتی کی نمایاں جھلک ہے جو ارونگ نے الحمرا کی رومانی فضا سے قائم کیا ہے۔ خط کی عبارت یہ ہے:-

محترم دوست!

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے ہسپانیہ کے بعض قدیم شہروں خصوصاً طلیطلہ اور اشبیلیہ کی سیر کرتے ہوئے محسوس کیا تھا کہ ان پر اس تہذیب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے جو موروں کے عہد کی یادگار ہے۔ ان

شہروں کے کوچہ و بازار میں گھومتے پھرتے ہماری نظریں بار بار ایسے مناظر اور واقعات سے دوچار ہوتی تھیں جن سے "الف لیلہ" کی داستانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر آپ نے ایک دن یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میں کوئی ایسی چیز لکھوں جس میں ان رنگین مشاہدات کا عکس ہو، جس کا اسلوب ہارون الرشیدی انداز کا مظہر ہو اور جس میں عرب حکایت کی وہ لذت ہو جس سے ہسپانیہ کی ہر چیز سرشار ہے۔ یہ سب باتیں میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اس کتاب کے محرک آپ ہیں، جس کی بنیاد میں نے اُن مشاہدات اور ان روایتی افسانوں پر رکھی ہے جو ہم نے اس محل میں رہ کر کئے اور سنے تھے جو ہسپانیہ بھر میں اس رومانی روایت کا بہترین مظہر ہے جسے ہم موری ہسپانوی روایت کہتے ہیں۔

یہ اوراق میں آپ کے نام معنون کرتا ہوں، ان حسین مناظر کی یاد میں جو ہماری نظروں نے ایک ساتھ جانبازی کی اس رومان انگیز سرزمین میں دیکھے . . . . . .

خط کی اس عبارت سے اروِنگ کے مزاج کی جو کیفیتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک والہانہ محبت، بلکہ عشق کا وہ جذبہ ہے جو ماضی کی ہر یاد کے لئے اُس کے دل میں موجزن ہے۔ گزری ہوئی تاریخ اور اُس کے واقعات میں اروِنگ نے یوں تو عموماً ایک کشش محسوس کی ہے لیکن ایک ایسا ماضی جس میں رومان کا کیف اور رنگینی بھی شامل ہو اس کے شوق میں وارفتگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس وارفتگی شوق کا اظہار اس خط میں ہے۔ ان دو چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز جس کی لہر اس خط کے ہر لفظ میں نظر آتی ہے اُس کی تخیل پسندی ہے۔ مشاہدات کو اور خصوصاً ایسے مشاہدات کو جن میں رومان و جانبازی کی جھلک بھی ہو، اروِنگ کی رنگینیِ تخیل حیاتِ جاوداں بخشتی ہے۔

اروِنگ نے الحمرا اور اس کی سرزمین سے جو گہرا جذباتی تعلق قائم کیا ہے اس کا اظہار الحمرا کی داستانوں میں قدم قدم پر ہوتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ہر واقعہ کے بیان اور ہر کردار کے ذکر میں اپنی آواز کے شیریں نغمے شامل کر دیتی ہیں۔ چنانچہ الحمرا کی داستانیں شروع کرنے سے پہلے اس نے جو تمہیدی باب لکھا ہے وہ ایک طرف تو اُس کے تاریخی اور افسانوی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے اور دوسری طرف اس والہانہ شیفتگی کا غماز ہے جو اس نے الحمرا کے پورے ماحول سے کے ساتھ قائم کی ہے۔

"جن سیاحوں کے دل تاریخی مناظر کا شکوہ اور شاعرانہ حسن دیکھتے ہی دھڑکنے اور مچلنے لگتے ہیں، ہسپانیہ

کی رومان انگیز سرزمین اور اس سرزمین پر بنا ہوا قصر الحمرا اُن وارفتگانِ شوق کی زیارت گاہ ہے۔ جرأت و مردانگی کے نہ جانے کتنے حقیقی و غیر حقیقی افسانے ان پر شکوہ ایوانوں میں پوشیدہ ہیں اور حسن و محبت کے نہ جانے کتنے شیریں و دل آویز نغمے ان کے بام و در میں گونج رہے ہیں۔

اس حسین اور سراپا مشرقی منظر کو دیکھ کر تصور گزرے ہوئے رومانوں کی رنگینی میں ڈوب جاتا ہے جالی کے پیچھے کبھی اُسے کوئی دستِ سیمیں جنبش کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی کسی پراسرار شہزادی کی چشمِ سیاہ افسوں بکھیرتی نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسین شہزادیاں کل تک ان قبوں میں مکین تھیں لیکن وہ دونوں پُراسرار شہزادیاں کہاں گئیں؟ ثریا اور لندداخا کہاں ہیں؟

فن کار جب تک اپنے موضوع کے ساتھ گہرا جذباتی تعلق نہ پیدا کرے، جب تک اپنے فن پارے کے ماحول اور اُس ماحول سے تعلق رکھنے والی ہر چیز میں اُسے حسن کی ایک نئی جھلک نہ دکھائی دے اور جب تک ہر نئی جھلک میں اُس کے لئے مسرت و شادمانی سے بھی بڑھ کر دیوانہ بنا دینے کی کیفیت نہ ہو، اس وقت تک اپنے موضوع کو دوسروں کے لئے زندہ اور مؤثر نہیں بنا سکتا، اس کے دکھائے ہوئے مناظر دوسروں کے لیے وارفتگی و دیوانگی کا سرمایہ مہیا نہیں کر سکتے، ارونگ کی داستانوں میں محبت اور شیفتگی کا یہ رنگ کبھی کبھی اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ داستانیں پڑھنے والا بھی جذبات کی ان لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ داستانوں کے دو ٹکڑے پڑھ کر اس شیفتگی اور اس کے پیدا کئے ہوئے پرخلوص تاثر کا اندازہ کیجئے:۔

"جب میں مشرقی شکوہ کے ان ایوانوں میں چلتا پھرتا ہوں تو اُس کے فواروں کی جھنکار اور بلبلوں کی چہکار مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ جب الحمرا کے گلابوں کی خوشبو میری ناک میں پہنچتی ہے اور جب یہاں کی فرحت بخش اور خوشگوار ہوا مجھے ایک حیات تازہ کا احساس دلاتی ہے تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں جنت میں آ گیا ہوں اور گداز جسم والی ننھی معصوم اور شوخ ڈولرس اس جنت کی ایک حور ہے جو میری مسرتوں کو دوام و کمال عطا کرنے کے لیے خلق ہوئی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ جب ارونگ نغمہ رومان کی اس جاں نواز سرزمین سے رخصت ہوا تو فراق کے احساس نے اسے تڑپا دیا، اور اپنی اس تڑپ کی مصوری بڑے سادہ اور دل نشین انداز میں کر کے اس نے اپنے قاری کو بھی پوری طرح اپنا ہم خیال بنا لیا۔ جو زندگی خود ارونگ کے لیے زندگی سب سے حسین خواب تھی، اس کے خلوص نے اُسے قاری کے لیے بھی ایک حسین

خواب بنا دیا جس کی یاد کے مزے اس خواب کے ذکر کے بعد بھی مدتوں لیتا رہتا ہے :۔

"غروب ہوتا ہوا سورج حسبِ معمول الحمرا کے سُرخ برجوں پر غمناک کرنوں کا سایہ ڈالتا ہوا رخصت ہو رہا تھا رخصت ہوتی ہوئی کرنوں کی دھندلی روشنی میں مجھے بُرجِ قمارش کا وہ دریچہ نظر آ رہا تھا جہاں میں بارہا اپنے آپ کو شیریں خوابوں میں گم کر چکا تھا۔ سورج کی آخری شعاعیں شہر کے کنجوں اور بوستانوں پر خیاضی سے اپنا سونا نچھاور کر رہی تھیں۔ گرمیوں کی نشیلی شام کا قرمزی دھندلکا میدان کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ ہر چیز حسن کی رنگینی میں ڈوبی ہوئی تھی، لیکن میری وداعی نظر کو اِس حسن میں سوگ کی ایک جھلک دکھائی دی اور میں نے اپنے دل میں سوچا مجھے اس حسنِ سوگوار کو اپنی آنکھوں میں لبسانے یہاں سے فوراً رخصت ہو جانا چاہیئے۔ میں اپنے تصوّر کو سدا اس حسن و رعنائی سے رنگین اور آباد رکھوں گا!

یہ سوچا اور تیزی سے نظریں اس حسین منظر کی طرف سے ہٹا لیں۔ گاڑی چند قدم آگے بڑھی اور غرناطہ اور الحمرا کا حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، اور اس طرح میری زندگی کا سب سے حسین خواب تمام ہوُا........

ایک حسین منظر کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں لبسا لینے اور تصور کی دُنیا میں آباد کرنے کی یہ خواہش کسی طرح کے فن کار کے دل میں پیدا ہو اس کا نتیجہ ہمیشہ ایسی تخلیق ہوتا ہے جو ناظر، قاری اور مخاطب ہر ایک کے لیے دلکش ہوتی ہے۔ اور اگر یہ صورت کہانی میں پیش آئے تو واقعات کے لیے ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں پڑھنے والے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ ہر حسین منظر اُن کے لیے خود فراموشی اور گم گشتگی کا ایک عارضی وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہی صورت الحمرا کی داستانوں کی ہے ارونگ نے اپنی داستانیں بیان کرتے ہوئے مناظر کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے ان میں کسی طرح کا جادو ہے اور اس نے افسانہ نگار کے دل اور زبان دونوں کو اپنے سحر میں مبتلا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بیان کئے ہوئے مناظر اکثر جگہ سحر کی اس طلسمی تاثیر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان مناظر پر رومان کا ایسا سایہ ہے جس میں ماضی کی جھلک بھی ہے اور حال کا عکس بھی۔ دو ایک مناظر کی جھلک دیکھ لیجئے :۔

"پانی کبھی دھیمے اور کبھی تیز سروں میں اپنے گیت سناتا، کبھی نالیوں میں گھنٹیاں بجاتا، کبھی فواروں میں سوتی بکھیرتا، الحمرا کے ہر گوشے اور کُنج کو رنگِ بہار دیتا ہوا مدام اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ الحمرا کی پہاڑیوں میں تھی

کرتی ہوئی فرحت بخش نسیم اور وادی کے سبزے کی خنک تازگی میں جو لطف و مسرت ہے اس کا اندازہ صرف انہیں ہو سکتا ہے جنہوں نے جنوبی علاقے کو اپنا مسکن بنایا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں بسنے والا غرناطہ جب نصف النہار کی گرمی میں پگھلتا ہے، سرانوادا کی طرف سے آنے والی سبک ہوائیں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی ہیں اور قصر کا گوشہ گوشہ پھولوں کی شیریں مہک سے معطّل ہو جاتا ہے، گرد و پیش کی ہر چیز خوابِ نوشیں کی دعوت دیتی ہے۔ نیند سے جھکتی ہوئی بوجھل آنکھیں سایہ دار دریچوں سے روشن وادی کا نظارہ کرتی ہیں اور شاخوں کی سرسراہٹ اور چشموں کی گنگناہٹ لوری بن کر کانوں میں آبستی ہے۔"

---

مرمریں فرش کے بیچ میں سنگِ موسیٰ کا فوارہ تھا جس کے گرد خوشبودار پھولوں کی خوبصورت جھاڑیاں تھیں۔ فوارے میں سے پانی کا ایک جھرنا پھوٹتا تھا جس سے پوری عمارت میں خوشگوار خنکی پیدا ہو جاتی تھی اور فضا میں ہر طرف ایک خواب اور موسیقی بکھر جاتی تھی۔

---

الحمرا کے قدیم تاریخی ماحول اور اس کی رومانی فضا سے ارونگ نے والہانہ محبت کا جو رشتہ جوڑا ہے اور اس کے مناظر کی رنگینیوں میں ڈوب کر اپنے اوپر جو وارفتگی طاری ہے اس میں اس وقت اور بھی شدت پیدا ہو جاتی جب وہ اپنی کسی کہانی کے کسی کردار کے غم کی روداد سناتا ہے یوں تو یہ روداد بجائے خود دل دوز ہوتی ہے لیکن رومان انگیز فضا کا پس منظر غم کی کیفیت کو اور زیادہ ابھارتا ہے:-

"الحمرا محبت کرنے والوں کی بہشت ہے، اس بہشت میں تنہا رہنا کتنا بڑا ستم ہے۔"

---

"دن، ہفتے، مہینے، گزرتے چلے گئے اور کسی نے غلام کی کوئی خبر نہ سنی، انار پک گئے، انگوروں کی بیل خوشوں سے لدگئی، خزاں کی بارشوں کے طوفانوں نے پہاڑوں سے میدانوں کا رُخ کیا، سرانوادا کی پہاڑیوں نے برفانی فرغل اوڑھے اور سرد ہواؤں کا شور الحمرا کے ایوانوں اور دالانوں میں گونجا، لیکن وہ نہ آیا۔ سردیاں رخصت ہوئیں اور بہار آفریں بہار نغموں، پھولوں اور

خوشبوؤں کے قافلے کے ساتھ ایک بار پھر لوٹ کر آئی۔ پہاڑوں کی سفید برف پگھلی اور نوادا کی بلند و بالا چمکتی ہوئی چوٹیوں کے سوا اُس کا کہیں نام و نشان نہ رہا، پھر بھی کسی نے اُسے بھولنے والے کی کوئی خبر نہ سنائی ۔" (الحمرا کا گلاب)

---

الحمرا کی داستانوں کی مقبولیت کا ایک اور راز وہ خوش دلی ہے جو ہر جگہ رومان و نغمے اور وارفتگی و شوق کی فضا کو مکمل کرتی ہے۔ یہ خوش دلی اِن داستانوں میں طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ کبھی وہ ایسے الفاظ کا جامہ پہنتی ہے جو اَدونگ کی زبان سے نکلتے ہی کلیے اور کہاوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، کبھی وہ ایسی واقعہ نگاری بن کر سامنے آتی ہے جس میں مشاہدہ اور تخیّل پوری طرح شیر و شکر ہوتے ہیں۔ کبھی وہ ایسا لطیف مزاح بنتی ہے جس کی آغوش میں مسرّت و شگفتگی کی پرورش ہوتی ہے اور کبھی مزاح کی حد سے گزر کر وہ اُس طنز کی تیزی پیدا کرتی ہے جس میں صداقت، خلوص اور معصومیت ایک ہی حقیقت کے مختلف نام معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے عشق و محبّت کی دُنیا کے کچھ کلیے سنیئے:

"دل جب پہلے پہل محبت کی سرگوشی سُن لے تو کوئی بڑے سے بڑا نگہبان بھی اُس کا محافظ نہیں بن سکتا۔"

---

"نیک دل خاتون کو شاید اس کی خبر نہیں تھی کہ سادہ دل دوشیزاؤں کیلئے چاندنی راتوں کے گیت پند و وعظ سے کہیں زیادہ شیریں اور دلکش ہوتے ہیں ۔"

---

"لیکن بڑھاپے کا عشق مشورے اور انجام دونوں سے بے نیاز ہوتا ہے ۔"

---

"عاشق بوڑھا ہو تو وہ عموماً دریا دل ہوتا ہے ۔"

---

"مرد کی بے قرار اور ہرجائی محبت کی حقیقت کیا ہے؟ ایک بہتی ہوئی ندی جو تھوڑی دیر ساحل سے لگے ہوتے ہر پھول سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے اور پھول فراق کے غم میں آنسو بہاتے رہ جاتے ہیں۔

---

محبت کرنے والوں کی راہ میں سنگِ گراں حائل ہوں تو حُسن کی کشش زیادہ بڑھتی اور آتشِ شوق

زیادہ بھڑکتی ہے۔ محبت کا پھول کانٹوں میں اُلجھ کر زیادہ شگفتہ اور آتشِ فراق میں تپ کر زیادہ رنگین ہوتا ہے۔"

---

"جو دو دل سچ مچ ایک دوسرے کے گرویدہ ہوں اُن میں بڑی آسانی سے صلح ہو جاتی ہے۔ محبت پہلی ہی ملاقات میں سارے گلے شکوے بھلا دیتی ہے۔"

---

زہرہ جبینوں کی حفاظت صرف اژدھے کر سکتے ہیں۔

---

اور اب اُس لطیف مزاح کے کچھ جلوے دیکھئے جو واقعات کے بیان میں بھی حقیقت کی مصوری کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اور کرداروں کے ذکر میں بھی۔

ارونگ نے اسپین کے اور خصوصاً الحمرا کے قیام میں وہاں کی زندگی کے جن مناظر اور جن واقعات کا مشاہدہ کیا اور اس سفر اور قیام کے دوران میں وہاں کے جن لوگوں سے ملا اُن سے دوستی، بے تکلفی اور محبت کا رشتہ قائم کیا۔ واقعات کے مشاہدے اور کرداروں کے روابط میں اُس کے سامنے جو چیزیں آئیں اُن میں ہنسنے ہنسانے اور شگفتہ رہنے کے بے شمار پہلو ہیں۔ ارونگ نے اپنے مختصر قیام میں زندگی کے اِن شگفتہ پہلوؤں سے جس طرح خود لطف و سرور حاصل کیا ہے اُس نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے اپنے قاری کو بھی اس میں شریک کرنے کی کوشش کی ہے اور اس لئے جب وہ اپنے تبسم آمیز لہجے میں ان واقعات کا بیان اور کرداروں کا ذکر کرتا ہے تو پڑھنے والا اِن واقعات کو اپنے مشاہدات اور ان کرداروں کی واردات کو اپنے دوستوں اور ہم جلیسوں کی روداد سمجھ کر پڑھتا ہے۔ چونکہ اُسے افسانہ نگار کے تجربات اپنے تجربے معلوم ہوتے ہیں اس لئے وہ جذباتی حیثیت سے ہر قدم پر افسانہ نگار کا ہم سفر رہتا اور اُس کے خندہ ہائے زیرِ لب میں اُس کا برابر کا شریک ہوتا ہے۔

---

"اُس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں تقدس کا جو رنگ تھا وہ کتّوں کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں تھا اور اس لئے جدھر سے پادری سائمن گزرتا وہ اپنی اپنی کمین گاہوں سے بھونک بھونک کر اُس کا خیر مقدم کرتے۔"

---

لوگوں کا خیال تھا کہ اپنی ظاہری سنجیدگی کے باوجود غزالی آنکھوں اور گداز جسم والی حسینہ نے عابد کے فولادی دل کے کسی نرم گوشے میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی اور اُس پر پوری طرح قابض تھی بلکہ [illegible]

چھوڑیئے ان باتوں کو، ہمیں بڑے لوگوں کے ذاتی اور گھریلو معاملات پر اس طرح نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

---

"ایک ہی وقت میں تین بیٹیاں ایک ایسے آدمی کے لیے خاصا کارنامہ ہے جو بوڑھا بھی ہو اور لجباً بھی۔"

---

بڈھے پادری کی روح اب بھی اس گھر پر قابض ہے اور تم جانتے ہو کہ مُردوں سے کرایہ وصول کرنا ناممکن ہے۔

---

"ان خوبیوں کے علاوہ بھی اُس میں بہت سی خوبیاں تھیں —— وہ پھوہڑ تھی، تن آسان اور آرام طلب تھی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ درجے کی گپ باز اور افواہ پسند بھی تھی۔"

---

لیکن غریب بخیل اپنے بیوی بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ اسی تحمل اور اطاعت گزاری سے اُٹھاتا تھا جیسے اُس کا گدھا پانی کے بھرے ہوئے مٹکے۔ وہ تنہائی میں چاہے جتنی جی کی بھڑاس نکال لے لیکن بیوی کے سامنے اُسے پھوہڑ کہنے کی جرأت اُس میں ہرگز نہیں تھی۔"

---

پھر لطف یہ تھا اُس کے دل میں بات اتنی دیر بھی نہ ٹھہرتی تھی جتنی دیر چھلنی میں پانی۔ مشہور تھا کہ بہ ناتی سوتے میں بھی اپنی ایک آنکھ اور ایک کان کھلا رکھتا تھا کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اسے دیکھتا اور سُنتا رہے۔

---

"دوشیزہ کا غصّہ، اگر واقعی اسے غصّہ کہا جا سکے، فوراً دُور ہو گیا لیکن اُس کی اُلجھن اور پریشانی کم نہ ہوئی۔ اُس کے شرمیلے چہرے کی سُرخی برابر بڑھتی رہی اور نیچی نظریں کیے وہ ریشم کو سُلجھانے کے بجائے اُسے اُلجھاتی رہی۔"

---

مزاح کے ان سادہ معصوم حملوں کا نشانہ اُن داستانوں کے اشخاص ہیں جنھوں نے روایت کی آغوش میں پرورش پائی ہے اور جن کی حیثیت نہ تاریخ کی مشہور و معروف شخصیتوں کی ہے اور نہ روزانہ زندگی کے جانے بوجھے اور دیکھے بھالے کرداروں کی۔ لیکن ارونگ نے ان نیم تاریخی اور نیم حقیقی شخصیتوں کے ساتھ بھی اُنس و محبت کا ایسا رشتہ قائم کیا ہے کہ اُن کے متعلق اچھی بُری ہر بات ہنس ہنس کر اور مزے لے لے کر کہی ہے اور اس ہنسی، دل لگی اور

مزے میں قاری کو برابر اپنا شریک رکھا ہے۔ یہ صورت اُن اشخاص و افراد کے معاملے میں اور بھی نمایاں نظر آتی ہے جن کے ساتھ اروِنگ کو بے تکلفی سے رہنے سہنے کا موقع ملا تھا۔ اِن کرداروں میں سے دو ایک کا ذکر سن لیجئے:

اس پُر اسرار پستہ قد بڑھیا کے قبضے میں پریوں کی دُنیا کا کوئی نہ کوئی طلسم ضرور ہے۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اپنی انتہائی پستہ قامتی، بدصورتی اور مفلسی کے باوجود اُسے ساڑھے پانچ شوہروں کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ ساڑھے پانچ اس لئے کہ ایک نوجوان شادی کا وعدہ کرکے اُسے ایفا کرنے سے پہلے ہی اس دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

---

رہا ماتیو، جس کی عمر اس وقت کوئی ۳۵ سال کی ہے تو اس نے پُوری کوشش سے خاندانی عسرت و ناداری کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

---

حسب دلخواہ اُسے (میمنوں کو) مارنے یا جلانے کی سند مل گئی تھی ...... اُس شام کو تائی انطونیہ کے سب پڑوسیوں نے اُس پر مبارکباد کی بارش کی اور اُس سند یافتہ طبیب کی خدمت میں اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا، جس کے ہاتھ میں اب اُن کی زندگی کی باگ ڈور تھی۔

---

اروِنگ کے مزاح کی حدیں کبھی طنز سے جا ملتی ہیں، لیکن ایسی طنز سے جس میں تلخی نام کو نہیں۔ اس پر بھی ہر جگہ اُس خوش دلی کا عکس نمایاں ہے جو اُس کے مزاج اور اُس کے بیانیہ انداز کی روح ہے۔ اس طنز کا نشانہ کبھی کبھی داستانوں کے کردار ہیں اور اکثر اوقات ہسپانوی زندگی اور اس زندگی کے مزاج اور کردار کی وہ بنیادی اور امتیازی خصوصیات جنھوں نے ہسپانیہ کی سرزمین کو انفرادی طور پر مشرقی رنگ دیا ہے۔ اس مشرقی رنگ میں خیر و شر کی قدریں اس طرح گھلی ملی ہیں کہ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ ایک کی حد کہاں ختم اور دوسرے کی کہاں شروع ہوتی ہے:

وہ غریب بدخیلی کی گاڑھی کمائی اپنے بناؤ سنگار پر اڑاتی اور اتوار کے علاوہ چھٹی کے اُن بے شمار دنوں میں جو اسپین والوں کی زندگی میں کاروباری دنوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ......

---

بلکہ مجرم کو قانون کی مضبوط گرفت میں کس طرح لایا جاتا ہے؟ اس لئے کہ مجرم کو پکڑ کر صرف تختۂ دار کا مضمون لیا جاسکتا تھا اور لوٹی ہوئی دولت پر قبضہ کرکے قاضی کی تجوری بھری جاسکتی تھی ——

اور اُس کے مسلکِ انصاف کے نزدیک دوسرا راستہ عدل کے اعلیٰ مقصد سے قریب تر تھا۔

---

"غریب بھشتی نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر طرح کی قسمیں کھائیں۔ سب سینٹوں اور ولیوں کو اپنی معصومیت پر گواہ بنایا۔ لیکن افسوس! اُن میں سے کسی نے وہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کی اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ آکر بھشتی کی طرف سے گواہی بھی دیتے تو قاضی اُن کی شہادت پر یقین نہ کرتا"!

---

کسی آدمی کو مجرم ٹھہرا کر جب کسی نفع کی اُمید باقی نہ رہے تو انصاف کو، اسپین جیسے ملک میں بھی، غیر جانب دار ہونا پڑتا ہے"۔

---

"اور مجھے قسمت کی ستم ظریفی پر ہنسی آتی ہے کہ اُس نے اُندلسی شجاعت کے علمبردار الفنسو اجیلار کے نام اور منصب کا محافظ اس دریوزہ گر کو بنایا جو قصر کے سربلند و مغرور سایے میں فقر و فاقے کی زندگی بسر کر رہا ہے، لیکن قسمت کے کھیل شاید ہمیشہ سے ایسے رہے ہیں۔ شاید ٹرایے کے کھنڈروں میں اجامنون اور اُخیلو کے وارثوں نے بھی حیرانی و سرگردانی کے ایسے ہی دن بسر کئے ہوں گے"۔

---

"لوگوں کی دو قسمیں ہیں، جن کے لئے زندگی ایک مسلسل تفریح و تماشا ہے، جو بہت غریب ہیں اور جو بہت امیر ہیں۔ ایک کے لئے یوں کہ اُنہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اور دوسرے کے لئے یوں کہ اُن کے پاس کچھ کرنے کو نہیں، لیکن دُنیا میں شاید کوئی طبقہ ایسا نہیں جو کچھ نہ کرنے اور کچھ نہ کر کے جینے کا فن اسپین کے غریب طبقے سے بہتر جانتا ہو ........ ایک ہسپانوی کو گرمیوں میں سایہ دیدیجئے اور سردیوں میں دھوپ، اور اس کے علاوہ تھوڑی سی روٹی، تھوڑی سی شراب، ایک پیاز، ایک پُرانا فرغل اور ایک ستار اور اس کے بعد اُسے اس سے غرض نہیں کہ دُنیا کدھر جا رہی ہے۔ اُس سے مفلسی و ناداری کی باتیں کیجئے تو وہ یہ باتیں بڑی بے نیازی سے سُنے گا۔ مفلسی و ناداری اُسے اتنی ہی عزیز ہے جتنا اپنا پُرانا فرغل۔ وہ صحیح معنوں میں حال مست ہے ........ وہ کوئی کام نہیں کرتے اُن کے کیسے خالی ہیں، لیکن وہ مگن ہیں۔ وہ پورے ہفتے بیکار رہتے ہیں، لیکن چھٹی کے دن جی کھول کر تفریح کرتے ہیں، جیسے ہفتہ بھر کام کرتے کرتے شل ہو گئے ہوں ..... اُن کی بے شغل و بے مصرف زندگی نے اُنہیں آسمان پر مچھلیوں کا شکار کھیلنے کا فن سکھا دیا ہے"۔

---

ارونگ نے عہدِ رفتہ کی طلسمی زندگی پر پڑے ہوئے پردے اُٹھا کر بے تکلفی سے اُس کے ایوانوں کی سیر کی ہے۔ اِن ایوانوں کے طلسم کو اپنے سینے میں بسایا اور اپنے آپ کو اس کی رنگینیوں میں ڈبو دیا ہے اور اس کے بعد اِس عہد کی جو داستانیں لکھی ہیں وہ نغمہ و رومان کی تصویریں بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ارونگ کو اِس ماضی سے جو والہانہ شیفتگی ہے اُس کی بدولت ان روایتی کہانیوں کے واقعات اور ان کے کردار ہمیں حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے نمونے معلوم ہوتے ہیں۔ ارونگ کے جذبات کی گرمی اور گداز، اُس کا خوش دلانہ اور تبسم آمیز مزاح، اُس کی سادہ و معصوم طنز اور ان سب سے بڑھ کر اُس کے بیان کی بے تکلف اور بے تکان روانی جو برابر تخیل کی رنگینیوں کو اپنا ہم عنان و ہم سفر رکھتی ہے، ان روایتی داستانوں کی دلکشی کے گوناگوں پہلو ہیں، لیکن ایک اور چیز جو حقیقت میں ارونگ کے احساسِ فن کی مظہر ہے، یہ ہے کہ اُس نے داستانیں لکھتے وقت قاری کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔ اُسے رومان و تخیل کی اِس سیرِ گلگشت میں ہر قدم پر اپنے ساتھ رکھا ہے اور ہر قدم پر اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ جو داستانیں اُسے سنائی جا رہی ہیں، ہر چند کہ اُن کا ماخذ روایت ہے، اُنھیں سچ جاننے میں کسی طرح کا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ زندگی کی حقیقت اور فن کی حقیقت اور مشاہدے کے سچ اور تخیل و تصور کے سچ میں جو نازک فرق ہے اُس کا احساس ارونگ کو پوری طرح ہے، لیکن اپنے قاری کا مکمل اعتماد حاصل کرنے کے لئے اُس نے اپنی داستانوں میں جا بجا ایسے فنی حربے استعمال کئے ہیں جن سے اُس کے نازک فنی احساس کا پتا بھی چلتا ہے، اور جس سے بلاشبہ داستان گو کو اپنے مخاطب کا وہ مکمل اعتماد بھی حاصل ہوتا ہے، جسے اچھی کہانی کی کامیابی کا راز سمجھنا چاہیئے۔ ارونگ نے مختلف داستانوں میں اپنے اس فنی نقطۂ نظر کو کیا کیا شکلیں دی ہیں، اس کا اندازہ کچھ مثالوں سے کیجئے۔

تین شہزادیوں کی داستان میں یہ اتفاق پیش آیا کہ تین سرداروں نے جب تین شہزادیوں کو دیکھا تو اُن میں سے ہر ایک نے مختلف شہزادی کو اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ ارونگ کو یہ احساس ہے کہ اس طرح کا اتفاق جو ظاہر ہے کہ کہانی کو ایک خاص نہج پر چلانے کے لئے ضروری تھا، باریک بین اور نکتہ چین قاری کی نظر میں پسندیدہ نہیں، اس لئے اس طرح کے قاری کے دل میں پیدا ہونے والے شبہ کو اپنے ایک دانشمندانہ فقرے سے دور کر دیتا ہے:

"یہ بات ذرا عجیب ضرور ہے لیکن ہے سچ کہ تینوں سردارزادوں کی نظرِ انتخاب مختلف شہزادیوں پر پڑی "

---

طلسمی سپاہی کی داستان جہاں آکر بظاہر ختم ہوجانی چاہیئے تھی وہاں پہنچ کر اروِنگ کو محسوس ہوتا ہے کہ قاری کی تجسّس پسند فطرت کے دل میں کچھ سوال اُبھر کر خلش پیدا کر رہے ہوں گے، اس لئے بات کو بڑی ہوشیاری اور بظاہر بڑی سادگی سے یوں آگے بڑھاتا ہے :

"طلسمی سپاہی کی داستان کا جتنا حصہ مستند سمجھا جاتا ہے وہ اس جگہ آکر ختم ہوجاتا ہے، لیکن روایت نے اس میں اتنا اضافہ اور کیا ہے ..........

---

"الحمرا کا گلاب" خاصی طویل داستان ہے اور داستان کے بعض ٹکڑے ایسے ہیں جنہیں اگر کہانی کے متن میں شامل کرلیا جاتا تو اُس کے بہاؤ اور روانی میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی اور یہ رکاوٹ لازمی طور پر تاثر کی وحدت میں مخل ہوتی اس لئے اروِنگ نے ایسی چند باتوں کو بیچ میں سے نکال کر کہانی کی باقی کڑیوں کو جوڑ دیا اور یہ کہانی ایک مربوط زنجیر بن گئی، لیکن کہانی کی ان کڑیوں کے جُڑ جانے کے بعد بھی کچھ باتیں یقیناً ایسی رہ گئیں جن سے قاری کے جی میں کھٹک پیدا ہونی لازمی تھی - اروِنگ نے اس کھٹک کا اندازہ لگایا اور کہانی کو اُس کے انجام تک پہنچا کر چھُٹی ہوئی باتیں بیان کرنے کا ایک ایسا انداز اختیار کرلیا جس میں بیک وقت سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی :

"لیکن ذرا ٹھہرو! اتنی تیزی اچھی نہیں - میرے کانوں میں قاری کی آواز گونج رہی ہے، وہ مجھ سے کہہ رہا ہے، اس طوفانی رفتار سے کہانی کے انجام تک پہنچنا تو بڑا عجیب سا ہے، پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ عشق نے حسن کے سامنے اپنی اس طویل سرد مہری کا کیا عذر پیش کیا ؟"

اروِنگ نے اس سوال کا جواب دے کر ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھی اور اُس کے لئے ذرا بدلا ہوا

لیکن وہی بے تکلّفی کا انداز اختیار کیا جس میں بے تکلّفی کے باوجود فنکارانہ چابک دستی بھی ہے:-

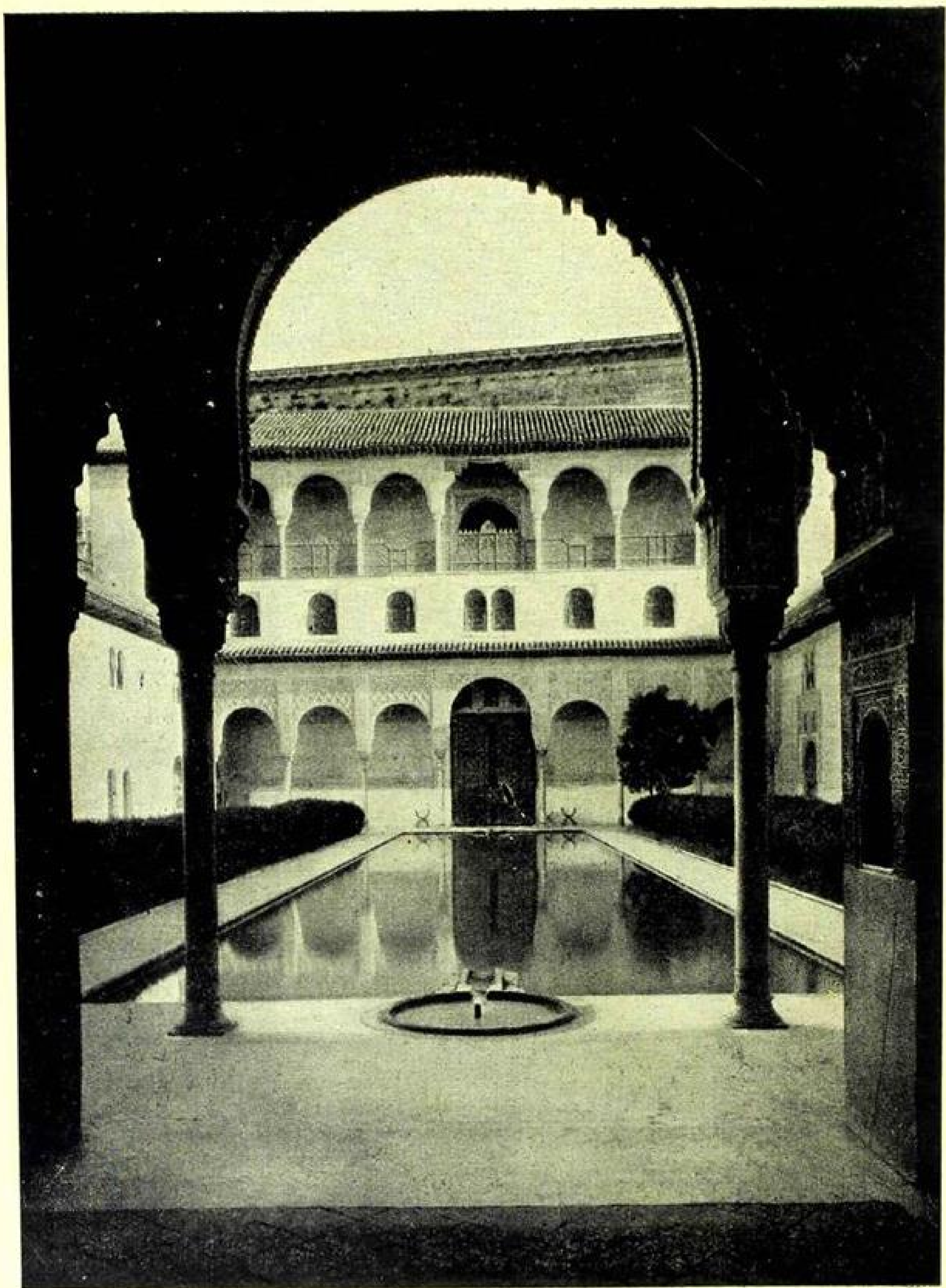
"اور اب ایک بات آپ کے کان میں کہنے کی ہے۔ لیکن دیکھئے یہ بات کسی اور سے نہ کہیئے گا۔ یہ ساری دُنیا اب بھی اُس رباب کی طلسمی تاثیر میں مبتلا ہے — اب بھی محبّت کا سودا ہر سر میں سمایا ہُوا ہے۔"

ارونگ کی اِن طلسمی، رومانی، تخیّلی، رنگین اور دلکش داستانوں کی تاثیر ہر زمانے میں اسی لئے قائم رہے گی کہ یہاں روایت پہ ہر جگہ حقیقت کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور یہاں ہر بات قاری کا اعتماد حاصل کر کے اُس کے کان میں کہی گئی ہے اور یہی چیز ہے جس نے اِس روایت کو تاریخ سے زیادہ قابل یقین بنایا ہے۔

وقارِ عظیم

یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور

# قصر الحمرا



صحنِ قمارش

# قصرِ الحمرا

جن سیّاحوں کے دل تاریخی مناظر کا شکوہ اور شاعرانہ حسن دیکھتے ہی دھڑکنے اور مچلنے لگتے ہیں، ہسپانیہ کی رومان انگیز سرزمین اور اس سرزمین پر بنا ہوا قصرِ الحمرا اُن وارفتگانِ شوق کی زیارت گاہ ہے۔ جرأت و دیوانگی کے نہ جانے کتنے حقیقی و غیر حقیقی افسانے اِن پُرشکوہ ایوانوں میں پوشیدہ ہیں اور حسن و محبّت کے نہ جانے کتنے شیریں و دل آویز نغمے اِن کے بام و در میں گونج رہے ہیں۔

الحمرا ہسپانیہ کے مسلمان حکمرانوں کا شاہی محل تھا۔ اِس پُرشکوہ، نفیس، نازک اور حسین جنّتِ ارضی میں رہ کر یہ حکمران ہسپانیہ کی سرزمین پر اسلامی اقتدار کا سکّہ چلا رہے تھے۔ قصرِ شاہی قلعۂ شاہی کا ایک حصّہ تھا، جس کی بے شمار بُرجوں سے ڈھکی ہوئی دیواریں جبل الثلج کے ایک حصّے کو گھیرے کھڑی ہیں اور اُن کے دامن میں غرناطہ کا معروف شہر آباد ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو یہ قلعہ بُرجوں اور فصیلوں کا ایک بے ہنگم ہجوم نظر آتا ہے جس میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ حسنِ تعمیر اور اس لئے اُسے ہرگز یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اِس ظاہر کا باطن اتنا حسین اور اتنا دلکش ہوگا۔

مسلمان حکمرانوں کے عہد میں قلعے کی فصیل کے اندر چالیس ہزار فوج رہ سکتی تھی۔ کبھی کبھی یہ حکمران اِس قلعے کو اپنی باغی رعایا کے خلاف حصار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ سلطنت کے عیسائیوں کے ہاتھ میں چلے جانے کے بعد بھی اَلحمرا شاہی قیام گاہ رہا۔ شہنشاہ چارلس پنجم نے الحمرا کے اندر ایک شاندار محل کی تعمیر شروع کی تھی لیکن پیہم زلزلوں نے اسے مکمل نہ ہونے دیا۔ فلپ پنجم اور اُس کی حسین ملکہ اُلحمرا کے آخری شاہی مکین تھے جنھوں نے اِس قصر کو اپنے قیام سے زینت بخشی۔ یہ واقعہ اٹھارھویں صدی کے شروع کا ہے۔ شاہی مکینوں کا استقبال بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا تھا۔ قصر اور ملحقہ باغوں کی نئے سرے سے مرمّت ہوئی۔ شاہی مہمانوں کے لئے ایک نیا حِصّہ تعمیر کیا گیا اور اِس کی آرائش کے لئے اطالوی فن کار طلب کیے گئے۔ لیکن یہ شاہی مکین قصر میں زیادہ عرصے مقیم نہیں رہے اور اُن کی رُخصت کے بعد قصر پر پھر ویرانی چھا گئی۔ تاہم قلعے کو فوجی ضرورتوں کے لئے مخصوص کر لیا گیا اور شاہوں کی جگہ اب یہاں گورنر کا قیام رہنے لگا۔ گورنر غرناطہ کے زیر اثر ہونے کے بجائے خود صاحبِ اختیار تھا اور اُس کا اقتدار قلعے اور اُس کے گرد و نواح کے علاقے تک پھیلا ہُوا تھا۔ گورنر کے ماتحت ایک اچھی خاصی فوج بھی تھی۔ اُس نے قدیم مسلمان شہنشاہوں کے قصر کے سامنے والے حِصّے کو اپنا مسکن بنا یا تھا۔ جب کبھی وہ اِس شاہانہ مسکن سے شہر غرناطہ میں جاتا تو نمایاں فوجی تزک و احتشام کے بغیر نہ جاتا۔ حقیقت میں اب قلعہ بجائے خود ایک چھوٹا موٹا شہر بن گیا تھا اور اُس کی چار دیواری میں متعدد آباد سڑکوں کے علاوہ ایک خانقاہ اور ایک گرجا بھی تھا۔

اِس تھوڑی سی چہل پہل کے باوجود، الحمرا سے بادشاہوں کی بے تعلّقی اُس کے لئے پیغامِ اجل ثابت ہوئی۔ اُس کے حسین ایوان سنسان و ویران ہو گئے، باغوں پر خزاں آ گئی اور فوّاروں کے رقص کا خاتمہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ ایوان اوباشوں کا اڈّا بن گئے۔ چوروں، اُچکّوں اور لٹیروں نے قصر کو اپنی جائے پناہ بنا لیا، جہاں سے وہ غرناطہ اور اُس کے گرد و نواح کو آسانی سے تاراج کر سکتے تھے۔ لیکن بالآخر قانون کے آہنی پنجے نے اُنھیں اپنی گرفت میں لیا اور ایسے سب رہنے والے الحمرا سے باہر نکال دیئے گئے۔ صرف ایسے لوگوں کو رہنے کی اجازت دی گئی جو نیک تھے اور یہاں رہنے کا حق رکھتے تھے۔ اکثر مکان منہدم کر دیئے گئے اور گرجے اور خانقاہ کے علاوہ یہاں بس ایک چھوٹی سی بستی رہ گئی۔

آگے چل کر جب اسپین کے سیاسی انتشار کے دنوں میں فرانسیسی کمانڈر نے الحمرا کو اپنی جائے قیام بنایا تو فرانسیسیوں کے حسنِ ذوق نے ایک بار پھر اس ویرانے میں وہی رونق اور آب و تاب پیدا کر دی جو مسلمانوں کے عہد میں اس کا حصہ تھی۔ سقف و بام کی مرمت ہوئی اور اُسے موسم کے گرم و سرد سے محفوظ کیا گیا۔ باغوں میں پھر بہار آئی، نہریں پھر جاری ہوئیں اور فواروں نے پھر چمکیلے موتی بکھیرنے شروع کر دیئے۔

فرانسیسی رخصت ہوئے تو قصر پر پھر زوال آیا۔ بہت سی برجیاں منہدم ہو گئیں اور فصیل میں جا بجا شگاف آ گئے۔ قلعے کی فوجی اہمیت بھی کم ہو گئی اور اب یہ صرف چند ناکارہ سپاہیوں کی قیام گاہ رہ گیا، جن کا کام اُن برجیوں کا پہرہ دینا ہے جن سے کبھی کبھی قید خانے کا کام لیا جاتا ہے۔ گورنر بھی الحمرا کی بلند و بالا پہاڑی کی سکونت ترک کر کے اب غرناطہ میں رہنے لگا ہے کہ یہاں رہ کر اُسے اپنے فرائض کی انجام دہی میں سہولت ہوتی ہے۔

غرناطہ پہنچنے کے بعد ہمارا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اِس مشہور تاریخی قصر کی زیارت کریں۔ چنانچہ اگلے دن ہم اپنی اِس دلچسپ مُہم پر روانہ ہوئے۔ اُس مشہور چوک سے گزر کر جس سے مسلمانوں کے عہد میں بازی گاہ کا کام لیا جاتا تھا اور جہاں اب بارونق بازار ہے، ہم نے اَلسقائین پر چلنا شروع کیا۔ اسلامی عہد میں یہ غرناطہ کا سُوق الکبیر یا بڑا بازار تھا اور یہاں کی تنگ گلیوں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں پر اب تک مشرقی رنگ چھایا ہوا ہے۔ حاکمِ شہر کے محل کے سامنے والے میدان میں ہو تے ہوئے ہم ایک ایسی تنگ اور پیچدار گلی میں پہنچے جسے دیکھ کر غرناطہ کے عہدِ شجاعت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس گلی کا نام سکۃ قمارش ہے اور عرب کے ایک ایسے گھرانے سے موسوم ہے جس کا ذکر تاریخوں اور گیتوں میں بار بار آیا ہے۔ اس گلی نے ہمیں بابِ کبیر تک پہنچا دیا۔ بابِ کبیر چارلس پنجم کا بنوایا ہُوا یونانی طرزِ تعمیر کا وہ شاندار پھاٹک ہے جس میں ہو کر ہم الحمرا کے حدود میں داخل ہوتے ہیں۔

اِس پھاٹک پر تین شکستہ حال بوڑھے سپاہی پتھر کی بنچوں پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ اُن کے چہرے اور قد و قامت کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ بنی زکریا اور بنی سراج کے جانشین ہیں۔ اِن سپاہیوں کے پاس ہی ایک دُبلا پتلا، لمبے قد کا فلاکت زدہ نوجوان دھوپ میں کھڑا گپ لڑا رہا تھا۔ اِس کا بھورا اور بوسیدہ لبادہ

اُس کی شکستہ حالی کا پردہ پوش تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہماری طرف آیا اور بولا "جناب! کیا میں آپ کو قلعے کی سیر کرا سکتا ہوں؟" میں سیاح ہوں اور مجھے آثارِ قدیمہ کے رسمی رہبروں سے نفرت سی ہے۔ علاوہ بریں مجھے اِس نوجوان کا لباس بھی کچھ پسند نہ آیا۔ تاہم میں نے اُس سے پوچھا۔

"کیا تم اِس جگہ سے اچھی طرح واقف ہو؟"

"جناب! مجھ سے زیادہ بھلا اس جگہ سے اور کون واقف ہو سکتا ہے؟ سچ پوچھئے تو میں الحمرا کا فرزند ہوں۔"

عام ہسپانیوں کا اندازِ گفتگو یقیناً بڑا شاعرانہ ہے۔ میں نے سوچا "الحمرا کا فرزند!"۔ اِس شاعرانہ نام نے فوراً میرے دل میں جگہ کر لی اور نوجوان کا بوسیدہ لباس میری نظر میں محترم بن گیا۔ میرے لئے وہ قصرِ الحمرا کی ویرانیوں کی علامت بن گیا۔ میں نے اپنے رہبر سے چند سوال اور پوچھے اور مجھے یقین آ گیا کہ اُس نے "فرزندِ الحمرا" کا لقب بجا طور پر اختیار کیا ہے۔ فتح ہسپانیہ کے بعد سے اُس کا خاندان نسلاً بعد نسلٍ وہاں رہتا آیا تھا۔ اُس کا نام ماتیو اکیسمن تھا۔ اُس کا نام سُن کر میں نے اُس سے پوچھا "تو شاید تم پادری اکیسمن کے خاندان سے ہو؟" اُس نے سادگی سے جواب دیا "جناب! ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو لیکن میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ الحمرا کے بسنے والوں میں ہمارا خاندان سب سے پُرانا ہے۔ میں خالص عیسائی ہوں، میرے جسم میں یہودیوں یا مسلمانوں کا ایک قطرہ بھی نہیں اور میرا تعلق کسی اُونچے گھرانے سے ہے۔ آپ مجھ سے اس گھرانے کا نام پوچھیں تو نہیں بتا سکتا۔ یہ سب باتیں میرے والد کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ قلعے کے اندر ہماری جھونپڑی میں اُن کی خاندانی ڈھال اب تک موجود ہے۔"

ہسپانیہ کے باشندوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اپنا سلسلہ کسی معزز خاندان سے نہ ملاتا ہو۔ لیکن اور سب باتوں سے قطع نظر مجھ پر تو اس لقب نے ــــ فرزندِ الحمرا ــــ جادو کا اثر کیا تھا اور اس لئے میں نے خوشی سے اُس کی رہبری کی پیشکش قبول کر لی۔

اپنے نوجوان رہنما کی رہبری میں ہم ایک تنگ گھاٹی میں پہنچے، جس میں جا بجا حسین کنج تھے۔ گھاٹی کے بیچ میں ایک ڈھلوان رہ گزر تھی، جس میں سے کئی پیچدار تنگ ڈنڈیاں کٹ کر اِدھر اُدھر جاتی تھیں۔ رہ گزر کے

کناروں پر جا بجا پتھر کی نشستیں بنی ہوئی تھیں اور فوارے موتی بکھیر رہے تھے۔ ہمارے بائیں طرف الحمرا کے بلند و بالا برج و مینار آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ وادی کے دوسری جانب ایک اونچی پہاڑی پر کچھ اور برج ان کے مدمقابل بنے کھڑے تھے۔ ہمارے رہبر نے ہمیں بتایا کہ ان برجوں کو قرمزی برج کہتے ہیں اور ان کا یہ نام اُن کے قرمزی رنگ کی وجہ سے ہے۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ یہ برج کب بنے اور کس نے بنوائے۔ یہ بات البتہ یقینی ہے کہ وہ الحمرا سے بہت پہلے کے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ رومنوں کے بنوائے ہوئے ہیں اور کچھ کے نزدیک وہ فینیقیوں کی بستیوں کے آثار ہیں۔

ڈھلوان، سایہ دار رہ گزر پر چڑھ کے ہم مسلمانوں کے بنوائے ہوئے ایک مربع برج کے قریب پہنچے، جو الحمرا کے لئے ایک طرح کی فصیل ہے اور قلعہ میں جانے والی شاہراہ یہیں سے ہو کر گزرتی ہے۔ فصیل کے اندر ہمیں کچھ اور بوڑھے اور ناتواں سنتری ملے۔ ان میں سے ایک پھاٹک پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا اور باقی اپنے بوسیدہ لبادوں میں ملبوس پتھر کی بنچوں پر پڑے سو رہے تھے۔ اس پھاٹک کا نام "باب العدل" ہے، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ جگہ ایک ایسی عدالت کے لئے مخصوص تھی جو چھوٹے چھوٹے مقدموں کا فیصلہ کرتی تھی۔ اس شاندار فصیل کی پیش دہلیز نعل کی شکل کے ایک وسیع عربی طرز کے محراب سے بنی ہے، جس کے قوس کی بلندی برج کی نصف بلندی تک پہنچتی ہے۔ محراب کی ڈاٹ پر ایک بہت بڑے ہاتھ کا نقش کندہ ہے۔ اور فصیل کے اندر پیش دہلیز کی ڈاٹ پر ایک بہت بڑی کنجی کی شکل تراش کر بنائی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ اور آثار کا علم رکھنے والوں کے نزدیک محراب کی ڈاٹ پر کندہ کیا ہوا ہاتھ یا پنجہ اسلام کے پانچ شرعی اصول کی علامت ہے، کنجی اُن کے نزدیک اقتدار کی مظہر اور کلید داؤد کی نشانی ہے۔

لیکن فرزندِ الحمرا نے اِن علامتوں کی جو توضیح کی وہ عوام کے اُس تصور سے مطابقت رکھتی ہے جسے مسلمانوں کی ہر چیز اسرار و افسوں کے رنگ میں ڈوبی دکھائی دیتی ہے اور جس نے مسلمانوں کے اس قصر کی ہر چیز کے گرد اوہام کا جال بُن رکھا ہے۔ ماتیو تک یہ بات اُس کے بزرگوں سے منتقل ہوتی ہوئی پہنچی تھی کہ ہاتھ اور کنجی وہ ساحرانہ وسیلے تھے جن پر الحمرا کی قسمت کا انحصار تھا۔ جس مسلمان بادشاہ نے یہ قصر بنایا تھا وہ بہت بڑا ساحر تھا اور اُس نے اس کے گرد ایک طلسم باندھا تھا۔ اِسی طلسم کی قوت نے اِسے اُن تمام طوفانوں اور زلزلوں سے محفوظ رکھا ہے جن سے گرد و پیش

کی ساری عمارتیں تباہ و برباد ہوگئیں ۔ اِس تصویر اور روایت کے نزدیک اس طلسم کی تاثیر اُس وقت تک باقی رہیگی جب تک یہ ہاتھ بڑھ کر کنجی کو اپنی گرفت میں نہ لے ۔ جس دن ایسا ہوا قصر کی ساری عمارت ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی اور مسلمان بادشاہوں کے سارے پوشیدہ دفینے لوگوں کو نظر آنے لگیں گے ۔

موتیو کی اس ہولناک پیشین گوئی کے باوجود ہم ہمت کر کے اس طلسمی دروازے میں سے گزرے اور دیواروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک تنگ گلی میں داخل ہوگئے ۔ اس گلی کے راستے اوپر چڑھ کر ہم ایک کھلے میدان میں پہنچے جسے ساحت الاجباب یا حوضوں کا میدان کہتے ہیں ۔ اس میدان کا یہ نام اُن حوضوں کی وجہ سے پڑا جن میں عرب پہاڑوں کو کاٹ کر، نہروں کے ذریعے چشموں کا پانی لائے تھے ۔ اِس جگہ ایک بہت گہرا کنواں بھی ہے، جس کا شفّاف پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے ۔ یہ کنواں عربوں کے ذوق کی اُس نفاست اور نزاکت کا نمونہ ہے جس کی قوّت سے وہ زمین کا سینہ چیر کر پاکیزہ شفّاف پانی تک پہنچتے تھے ۔

اِس میدان کے سامنے اُس قصر کے آثار ہیں جس کی بنیاد چارلس پنجم نے ڈالی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ اِس قصر کی تعمیر کا مقصد مسلمانوں کے قصر کے شکوہ کو گھٹانا اور اُس کی آب و تاب کو کم کرنا تھا ۔ مسلمان بادشاہ قصر کے جس حصّے کو سردیوں میں استعمال کرتے تھے ، نیا قصر تعمیر کرنے کے لئے اُس کا بیشتر حصّہ منہدم کر دیا گیا تھا ۔ باب الکبیر کو اینٹیں چُن کر بند کر دیا گیا ہے اس لئے ہمیں کونے میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے میں ہو کر قصرِ شاہی میں داخل ہونا پڑا ۔ چارلس پنجم کا بنایا ہوا قصر، اپنی عظمت اور حُسنِ تعمیر کے باوجود ہمیں ایک گستاخانہ اقدام معلوم ہوا اور ہم اِس پر حقارت سے نظر ڈالتے ہوئے اسلامی قصر کے آستاں پر پہنچ گئے ۔

قصر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہم تھوڑی دیر باہر ٹھہرے ۔ ہمارے خود ساختہ رہنما نے ہمیں بتایا کہ شاہی قصر کی نگرانی ایک بوڑھی خاتون کے سپرد ہے ، جس کا اصلی نام تو بڑا لمبا چوڑا ہے لیکن اُسے لوگ عموماً بے تکلفی سے تائی انطونیا کہتے ہیں ۔ یہی بوڑھی خاتون سیّاحوں کو شاہی محلوں اور باغوں کی سیر کراتی تھی ۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک گداز جسم اور سیاہ چشم اُندلسی حسینہ نے دروازہ کھولا ۔ موتیو نے چپکے سے میرے کان میں کہا ، " یہ تائی انطونیہ کی بھتیجی ہے " مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ یہی حسین پری ہمیں طلسمی قصر کی سیر کرانے پر مامور ہوئی ہے اِس حسین رہبر کی رہنمائی میں ہم نے آستاں کے اندر قدم رکھا اور ہمیں یہ محسوس ہوا کہ جیسے کسی جادوگر نے اپنی جادو

کی چھڑی پھیر کر ہمیں ماضی کی کسی طلسمی سرزمین میں پہنچا دیا ہے اور کسی عربی افسانے کے پُرکیف مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ آستان کے باہر جو مناظر ہم ابھی دیکھ چکے تھے اُن میں اور اندر کے پُرکیف مناظر میں کتنا تضاد تھا! ہماری آنکھوں کے سامنے ایک کشادہ صحن تھا، ڈیڑھ سو فٹ لمبا اور اسی فٹ چوڑا۔ سفید سنگِ مرمر کے اس وسیع و عریض صحن کے دونوں جانب ہلکے ہلکے ستونوں کی قطاریں تھیں۔ ایک طرف ستونوں کے سہارے ایک خوبصورت، جالی دار بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ کارنسوں کے حاشیوں اور دیواروں کے مختلف حصّوں پر نازک نقش و نگار کندہ تھے اور ان کے ساتھ کوفی اور عربی خطوں میں جا بجا یا تو قصر کے بانی شہنشاہوں کے اقوال درج تھے یا ایسی عبارتیں جن میں ان کے شکوہ و عظمت کی تعریفیں کی گئی تھیں۔ صحن کے وسط میں ۱۲۴ فٹ لمبا اور ۲۷ فٹ چوڑا اور پانچ فٹ گہرا ایک حوض تھا۔ اس حوض میں سنگِ مرمر کے دو پیالے بنے ہوئے تھے جن میں سے نکل کر پانی حوض میں آ رہا تھا۔ اس خوبصورت حوض کا نام البیرقہ تھا۔ اس کے نقرئی پانی میں بےشمار سنہری مچھلیاں پھدکتی پھر رہی تھیں اور کناروں پر لگے ہوئے گلاب کے پھولوں کا عکس اسے اور رنگین بنا رہا تھا۔

البیرقہ کے کشادہ صحن میں ہوتے ہوئے ہم ایک محراب کے نیچے سے گزرے اور اُس معروف میدان میں پہنچے جسے شیروں والا صحن کہتے ہیں۔ قصر کے کسی حصّے کو دیکھ کر عہدِ شاہی کے حسن و شکوہ کی یاد اتنی تازہ نہیں ہوتی جتنی اس میدان کو دیکھ کر، اس لئے کہ صرف یہی حصّہ ہے جو زمانے کی دستبُرد سے محفوظ رہا ہے۔ اس کے وسط میں وہ حسین فوّارہ ہے جس کا ذکر افسانوں میں بھی ملتا ہے اور گیتوں میں بھی۔ سنگِ جراحت کے پیالے اب بھی یہاں پہلے کی طرح چمکدار ہیرے اُگل رہے ہیں اور شیروں کے منہ سے اب بھی پانی کی وہ نقرئی نہریں جاری ہیں جو ابی عبداللہ کے عہد میں جاری تھیں۔ وہ بارہ شیر جن کے سہارے یہ دونوں پیالے رکھے ہوئے ہیں البتہ اُس شہرت کے مستحق نہیں ہیں جو زمانے نے اُنھیں دی ہے۔ ان کی بناوٹ انتہائی بھدّی ہے اور وہ غالباً کسی عیسائی قیدی کے بنائے ہوئے ہیں۔ میدان میں جہاں پہلے سنگِ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھروں کی روشیں تھیں اب رنگین پھولوں کے تختے ہیں۔ یہ تبدیلی اُن فرانسیسیوں کی بدمذاقی کی مظہر ہے جو مسلمانوں کے بعد غرناطہ پر قابض ہوئے تھے۔ شیروں والے میدان کے چاروں طرف عربی طرز کے بنے ہوئے دالان ہیں، جن میں سفید

سنگِ مرمر کے نازک ستون ہیں۔ دالانوں میں جا بجا طلائی نقوش ہیں اور خیال ہے کہ کسی زمانے میں ستونوں پر بھی سنہری کام بنا ہوا تھا۔ قصر کے اندرونی حصّوں کی طرح اس حصّے کا طرزِ تعمیر پُرشکوہ ہونے کے بجائے نفیس و نازک ہے اور ذوق کی نفاست و پاکیزگی اور مزاج کی عیش پسندی کا آئینہ دار ہے۔ دالان اور ستونوں کے جو آثار اس وقت تک باقی ہیں اُن کی نزاکت اور دیواروں پر بنے ہوئے نفیس و نازک نقوش کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ چیزیں صدیوں کے سرد و گرم، زلزلوں کے صدمات، جنگوں کی تباہ کاریوں اور سیّاحوں کی دست بُرد سے کس طرح محفوظ رہیں۔ اس حیرت کا بظاہر ایک ہی جواب ہے کہ سحر و طلسم کی کسی غیر معمولی قوّت نے اِن کی حفاظت کی ہے۔

میدان کے ایک طرف ایک مرصّع پھاٹک ہے۔ یہ پھاٹک ایوان بنی سراج میں کھُلتا ہے، جو بنی سراج کے اُن جانبازوں کے نام سے موسوم ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں قتل کیے گئے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ محض افسانہ ہے لیکن ہمارے چھوٹے رہنما کو اس کی تاریخی صداقت پر پُورا یقین تھا۔ اُس نے اپنے خیال کی تائید میں ہمیں فرش پر پڑے ہوئے چند بڑے بڑے سُرخ دھبّے دکھائے۔ عام روایت کے مطابق یہ بنی سراج کے مقتولوں کے خُون کے دھبّے ہیں، جنھیں کوئی چیز مٹا نہیں سکتی۔

ہمارے رہنما نے جب یہ محسوس کیا کہ ہم اُس کی ہر بات کو بلا پس و پیش سچ سمجھ لیتے ہیں تو اُس نے ہمیں بتایا کہ شیروں والے میدان میں کبھی کبھی رات کے وقت کچھ دھیمی دھیمی آوازیں سُنائی دیتی ہیں جیسے بہت سے لوگ سرگوشی میں باتیں کر رہے ہوں۔ اِن دھیمی دھیمی آوازوں میں بعض اوقات دُور سے آتی ہوئی زنجیروں کی جھنکار بھی شامل ہو جاتی ہے۔ روایت کے مطابق یہ آواز بنی سراج کے مقتولین کی ہے جن کی روحیں رات کے وقت اپنے مقتل میں آتی اور اپنے قاتلوں کے خلاف اللہ سے انتقام طلب کرتی ہیں۔

یہ آوازیں، جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا، اُس پانی کی ہیں جو زمین دوز نہروں کے ذریعہ چشموں سے فوّاروں تک لایا جاتا ہے۔ لیکن میں نے اپنی اس دریافت کا تذکرہ جان بوجھ کر اپنے رہنما اور الحمرا کے فرزند سے نہیں کیا۔

جوں جوں فرزندِ الحمرا کو اس بات کا یقین ہوتا جاتا کہ اُس کی ہر بات کو میں ایمان کی طرح قبول کر لیتا

ہوں وہ مجھے نئے نئے افسانے سُناتا جاتا۔ چنانچہ اُس نے مجھے ایک دن اپنے پردادا کی زبانی سُنا ہوا یہ قصّہ سُنایا۔

" عرصہ ہوا ایک بوڑھا سپاہی اس خدمت پر تعینات تھا کہ وہ سیّاحوں کو الحمرا کی سیر کرائے۔ ایک دن جھٹ پٹے کے وقت شیروں کے میدان میں سے گزرتے ہوئے اُس نے ایوانِ بنی سراج میں کچھ پیروں کی آہٹ سُنی۔ سپاہی نے سوچا کہ شاید کچھ اجنبی ایوان میں گھس آئے ہیں اس لئے وہ اُن سے باز پرس کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن ایوان میں پہنچ کر اُسے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ چار مسلمان سردار، تلواروں اور زرہ بکتروں سے مسلّح ہاتھوں میں چمکیلے جڑاؤ خنجر لئے، ایوان میں امیرانہ شان سے ٹہل رہے تھے۔ مسلّح سردار بوڑھے سپاہی کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوئے لیکن سپاہی پر اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور اُس کے بعد پھر کبھی الحمرا میں قدم نہ رکھا۔"

موتیو کا خیال تھا کہ مسلمان سردار بوڑھے سپاہی کو کسی مدفون خزانے کا راز بتانا چاہتے تھے لیکن یہ خزانہ سپاہی کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں بوڑھے سپاہی کے ایک جانشین نے زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیا۔ وہ الحمرا میں آیا تو مفلس و نادار تھا لیکن کچھ ہی عرصے بعد یہاں سے رخصت ہوا تو اُس کے پاس خاصی دولت تھی۔ وہ اب بھی ملاگا کے علاقے میں امیرانہ شان سے رہتا ہے اور اُس کا شمار وہاں کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُن پُراسرار خزانوں کا صدقہ ہے جن کا بھید اُسے عرب سرداروں کی رُوحوں نے بتایا تھا۔

بوڑھے سپاہی کا یہ قصّہ سُن کر "فرزندِ الحمرا" کی رہنمائی کی قدر و قیمت میری نظر میں اور بھی بڑھ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارا رہنما الحمرا کی اُس غیر منقول تاریخ سے پوری طرح واقف ہے، جس کی میری افسانہ پسند طبیعت کو تلاش تھی۔ اُس کا دماغ ایسی بے شمار معلومات کا بیش بہا دفینہ تھا جنھیں احتیاط پسند مؤرخ اور فلسفی غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایوانِ بنی سراج کے عین مقابل ایک بے حد مرصّع اور مزیّن پھاٹک ہے۔ یہ پھاٹک ایک دوسرے ایوان میں کھلتا ہے۔ اس بلند و بالا پھاٹک کی تعمیر انتہائی حُسن و نزاکت سے ہوئی ہے۔ اس کا فرش سفید سنگِ مرمر کا ہے۔ یہ ایوان "دو بہنوں کا ایوان" کہلاتا ہے اور اس نام کے ساتھ کئی شاعرانہ و غیر شاعرانہ افسانے

وابستہ ہیں۔

اِس ایوان کے دونوں طرف قبّے بنے ہوئے ہیں جن سے بادشاہ استراحت گاہ کا کام لیتے تھے۔ ان قبّوں میں باہر کی ہلکی روشنی چھَن چھَن کر اندر آتی ہے۔ قبّوں کے اندر جا کر کانوں کو ایک طرف شیروں والے فوارے کا فرحت بخش نغمہ سُنائی دیتا ہے اور دوسری طرف گُستان لندراخا میں گرنے والے آبشار کی زم جھنکار گونجتی ہے۔

اِس حسین اور سرتاسر مشرقی منظر کو دیکھ کر تصوّر گزرے ہوئے رومانوں کی رنگینی میں ڈوب جاتا ہے۔ جالی کے پیچھے کبھی اُسے کوئی دستِ سیمیں جنبش کرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے اور کبھی کسی پُراسرار شہزادی کی چشمِ سیاہ افسوں بکھیرتی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسین شہزادیاں کل تک اِن قبّوں میں مکین تھیں — لیکن وہ دونوں پُراسرار شہزادیاں آخر کہاں گئیں؟ ثریّا اور لندراخا کہاں ہیں؟

مسلمان بادشاہوں کے زمانے کی بنی ہوئی زمین دوز نالیوں کے راستے پہاڑی چشموں کا پانی قصر کے ہر حصے میں بڑی فراوانی سے پہنچتا ہے اور حمّاموں، تالابوں اور فوّاروں میں ہر جگہ اس کی چمک دکھائی اور جھنکار سُنائی دیتی ہے۔ پانی سنگِ مرمر کے فرش کو شفّاف بناتا اور قصرِ شاہی کے گلستانوں بوستانوں کو شاداب کرتا ہُوا اُس طویل نہر کا رُخ کرتا ہے جو شہر کی طرف جاتی ہے — پانی کبھی دھیمے اور کبھی تیز سُروں میں اپنے گیت سُناتا، کبھی نالیوں میں گھنٹیاں بجاتا، کبھی فوّاروں میں موتی بکھیرتا الحمرا کے ہر گوشے اور ہر کُنج کو رنگِ بہار دیتا ہُوا مُدام اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

الحمرا کی پہاڑیوں میں رقص کرتی ہوئی فرحت بخش نسیم اور وادی کے سبزے کی خنک تازگی میں جو لطف و مسرّت ہے اُس کا اندازہ صرف اُنھیں ہو سکتا ہے جنھوں نے جنوبی علاقے کو اپنا مسکن بنایا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں بسنے والا غرناطہ جب نصف النّہار کی گرمی میں پگھلتا ہے، سرانوادا کی طرف سے آنے والی سُبک ہوائیں قصرِ الحمرا کے ایوانوں میں اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہیں اور قصر کا گوشہ گوشہ پھُولوں کی شیریں مہک سے معطّر ہو جاتا ہے۔ گرد و پیش کی ہر چیز خوابِ نوشیں کی دعوت دیتی ہے۔ نیند سے جھپکتی ہوئی بوجھل آنکھیں سایہ دار دریچوں سے روشن وادی کا نظارہ کرتی ہیں اور شاخوں کی سرسراہٹ اور چشموں کی گنگناہٹ لوری بن کر کانوں میں آبستی ہے۔

# ابی عبداللہ کا تختِ شاہی

ہم نے شعر و رومان کی اس سر زمین کی سیر میں تقریباً سارا دن گزارا اور بادلِ ناخواستہ شام کے قریب اس حُسن و دلکشی سے جُدا ہو کر شہر میں واپس آئے۔ رات ایک ہسپانیوی سرائے کی بے رنگ و بے کیف تنہائی میں بسر کی اور اگلے دن الحمرا کے گورنر سے جا کر ملے ـــــ گورنر کے نام ہم جو سفارشی خط لائے تھے وہ اُسے دینے کے بعد بڑے جوش و مسرّت سے اُن مناظر کی تعریف کی جو ہم نے کل کی سیر میں دیکھے تھے۔ باتوں باتوں میں ہم نے اس بات پر سخت حیرت ظاہر کی کہ الحمرا کی جنّتِ ارضی کو چھوڑ کر گورنر نے شہر کی گھٹی ہوئی فضا میں رہنا کیوں پسند کیا۔ ہماری حیرت پر گورنر کا جواب یہ تھا کہ شہر میں رہ کر اُسے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں سہولت ہوتی ہے۔ آخر میں گورنر نے مسکراتے ہوئے کہا "محلوں میں رہنا بادشاہوں کو زیب دیتا ہے اس لئے کہ اُنھیں اپنی حفاظت کے لئے مضبوط چار دیواریوں کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ لیکن جناب! اگر آپ کو محلوں میں رہنا اس قدر پسند ہے تو آپ شوق سے الحمرا کے ایوانوں میں قیام فرما سکتے ہیں۔"

اپنے مہمانوں سے یہ کہہ دینا کہ میرا گھر آپ کا گھر ہے اہلِ اسپین کے حسنِ اخلاق کا ایک ادنےٰ معمول ہے۔

مہمان اگر بھولے سے بھی گھر کی کسی چیز کی تعریف کر دے تو میزبان فوراً کہتا ہے "یہ چیز آپ کی ہے۔ لیجئے حاضر ہے"۔ لیکن دوسری طرف اس حسنِ اخلاق کے جواب میں میزبان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لینے کے بجائے محض شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کرے۔ چنانچہ جب گورنر نے ہمارے رہنے کے لئے قصرِ شاہی کی پیش کش کی تو ہم نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کر دیا۔ لیکن گورنر کی پیش کش میں خلوص تھا۔ اس نے ہمارے شکریے کو تکلف سمجھ کر اپنی پیش کش پر اصرار کیا اور کہا "قصر کے کمرے خالی اور ویران ہیں۔ لیکن آپ نے وہاں کا قیام پسند فرمایا تو تائی انطونیہ انھیں تھوڑا بہت سجا دے گی اور قیام کے دوران میں آپ کے آرام کا بھی خیال رکھے گی۔ اگر آپ کو یہ سادہ مہمانی پسند ہے تو شاہی قصر کے ایوان آپ کے لئے حاضر ہیں"۔

اس مرتبہ ہم نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ گورنر کا شکریہ ادا کر کے اس سے رخصت ہوئے اور تیزی سے ڈھلوان راستہ طے کر کے خاتون انطونیہ سے ملنے کے لئے باب الکبیر میں ہوتے ہوئے وہاں پہنچ گئے جہاں ہمیں اپنے میزبان سے ملنا تھا۔ لیکن اس مختصر سفر میں ہماری کیفیت بالکل ایسی تھی جیسے ہم خواب دیکھ رہے ہوں، ایک ایسا خواب جس کی تعبیر ہرگز خوشگوار نہیں ہوگی۔ مگر ایک چیز تھی جس سے ہمارے دل کو ڈھارس تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ خاتون انطونیہ کے گھرانے میں ہمارا ایک دوست ہے۔ ہم ایک دن پہلے خاتون انطونیہ کی حسین بھتیجی ڈولورس سے مل چکے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ اس کی مسکراتی ہوئی سیاہ آنکھیں کل کی طرح آج بھی ہمارا خیر مقدم کریں گی۔

ہم نے خاتون انطونیہ کے دروازے پر دستک دی اور تھوڑی دیر میں سب مرحلے آسانی سے طے ہو گئے۔ قصر کے دو کمرے بڑی سادگی سے ہمارے لئے سجا دیئے گئے۔ ہماری دیکھ بھال کے فرائض ننھی ڈولورس کے سپرد ہوئے اور ہم نے اگلے دن سے محل میں رہنا شروع کر دیا۔ میں اور میرا ساتھی اس اتفاق و اتحاد سے بادشاہی کرنے لگے کہ بادشاہ بھی ہمارا سکون دیکھتے تو انھیں ہم پر رشک آتا۔ کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ یہاں تک کہ میرے دوست کو اپنے سرکاری کاموں کے سلسلے میں میڈرڈ واپس جانا پڑا اور یہ بے تخت و تاج کی حکومت تنہا میرے تصرف میں آ گئی۔

میں کسی ہم سفر اور ہم عناں کے بغیر سیاحی کے لطف اٹھانے کا عادی ہوں۔ اس لئے کئی دن تک لوگوں کی نظریں بچا کر، بحرِ حیرت میں غرق، حسرت و افسوس کی اس دنیا کا نظارہ کرتا رہا۔ اس تنہائی میں صرف ایک

خیال میرا رفیق رہا اور وہ یہ کہ مجھے اپنے قاری کا پُورا اعتماد حاصل ہے اور میری باتیں شوق اور یقین کے ساتھ سُنی جائیں گی - اور اِس لئے اپنی اِس بے شرکت بادشاہی میں میرے تصوّر، تخیّل اور مشاہدے نے جو کچھ مجھے دکھایا ہے اُس کی ایک جھلک اپنے قاری کو بھی دکھاؤں گا - اگر میرا بیان اِس پُر اسرار ماحول کے دل نشین نقش اُس کے تصوّر میں روشن کر سکا تو مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ الحمرا کے رومانی ایوانوں میں کچھ دن بسر کر کے وہ پچھتائے گا نہیں -

لیکن سحر و افسوں کے اِس طلسماتی ماحول کی تصویر پیش کرنے سے پہلے شاید اپنے رہنے سہنے کا تھوڑا سا حال بتانا ضروری ہے - میرا رہن سہن اُن بادشاہوں کے مقابلے میں یقیناً بہت سادہ تھا جو مجھ سے پہلے اس سرزمین کے آقا رہ چکے تھے - لیکن اِس سادگی کا قابلِ تسکین پہلو یہ تھا کہ ایسے کسی طرح کے انقلاب کا اندیشہ نہیں تھا -

میرے کمرے گورنر کی اقامت گاہ کے ایک سرے پر، محل کے عین مقابل واقع ہیں اور حوضوں والے وسیع میدان کے رُخ کھلتے ہیں - کمرے نئی وضع کے بنے ہوئے ہیں - میری خواب گاہ کے مقابل والا کنارہ آن نیم افریقی، نیم ہسپانوی وضع کے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے جھنڈ سے ملحق ہے جس میں خاتون انطونیہ اور اُن کا گھرانا رہتا ہے - قصر کو صاف ستھرا رکھنے کے عوض خاتون انطونیہ کو سیاحوں سے انعام لینے اور قصر کے باغوں کے سب پھل پھول حسبِ دلخواہ برتنے کا حق حاصل ہے — گو اُن سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً باغ کے پھلوں کی ڈالی گورنر کی نذر کرتی رہیں -

خاتون انطونیہ کا خاندان تین افراد پر مشتمل ہے - ایک خود وہ، دوسرے اُن کا بھتیجا میتول اور تیسری گداز جسم اور کالی آنکھوں والی ننھی ڈولرس - میتول صحیح معنوں میں ہسپانوی خوبیوں کا ہونہار نوجوان ہے - وہ کچھ عرصے فوج میں ملازم رہ چکا ہے اور اس توقع پر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے کہ اس کی تکمیل کے بعد وہ قلعہ کا طبی مشیر مقرر ہو جائے گا - ننھی ڈولرس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خاتون انطونیہ کی جانشین اور اُس کے بیش قیمت اندوختے کی وارث ہوگی اور اس لئے فرزندِ الحمرا اُسے بڑے رشک کی نظر سے دیکھتا ہے - میتول اور ڈولرس آپس میں چچا زاد بھائی بہن ہیں اور اس لئے ہمارے معتبر رہنما کا خیال ہے کہ ڈاکٹری کی

سند ملتے ہی میںنول کی شادی غزال چشم حسینہ سے ہو جائے گی۔

خاتون انطونیہ میری ہر طرح کی آسائش کا پورا اہتمام کرتی ہیں اور جو سادہ غذا مجھے اس اہتمام کی بدولت ملتی ہے میں اُس سے بے حد مطمئن ہوں — خصوصاً اس لئے کہ خوش شمائل اور خوش خصلت ڈولرس کھانے کے وقت میرے پاس موجود رہتی ہے اور صبح شام میرے کمرے کی صفائی بھی کرتی ہے۔ ایک دراز قامت نوجوان جس کے بال زرد رنگ کے ہیں اور جو ہکلا ہکلا کر باتیں کرتا ہے، میری ٹہل خدمت پر مامور ہے۔ اس کا نام پپی ہے۔ پپی کا اصل کام باغ کی دیکھ بھال کرنا ہے لیکن اس کے علاوہ اُس کا دوسرا کام میرے احکام کی تعمیل ہے حالانکہ اُسے اِن احکام کی تعمیل کا موقع مشکل ہی سے کبھی ملتا ہے اس لئے کہ مونتیا کیمن، "فرزند الحمرا" نے یہ خدمت خود بخود اپنے ذمے لے لی ہے اور اُس دن کے بعد سے جب الحمرا کے پھاٹک پر میری اُس کی پہلی ملاقات ہوئی اُس نے بیک وقت خادم، رہنما، مشیر اور محافظ کے منصب اختیار کر کے مجھے ہر بار سے سُبکدوش کر دیا ہے۔ ان بہت سی خدمات کے عوض میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اُسے اُس کے بوسیدہ لبادے سے سُبکدوش کر کے اُسے ہسپانوی طرز کا ایک ہیٹ اور جیکیٹ خرید دی ہے۔ مونتیو کا یہ قیمتاً معزز لباس اُس کے لئے وجہِ سکون اور اُس کے ہم سِنوں کے لئے باعثِ رشک ہے۔ مونتیو میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اُس کا واحد عیب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کارآمد اور کارگزار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے اس بات کا شدید احساس ہے کہ میری خدمت کے مختلف عہدوں اور منصبوں پہ اُس نے اپنے آپ کو خود ہی مامور کیا ہے اس لئے وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مفید ثابت کرنے کے منصوبے بناتا اور اُن پر عمل کرتا رہتا ہے اور اس طرح میں گویا اُس کے حاکمانہ جذبۂ خدمت گزاری کا شکار بن کر رہ گیا ہوں۔ میں محض چہل قدمی کے خیال سے کبھی قصر کے اطراف میں جا نکلتا ہوں تو میرا یہ مستعد رہنما فوراً میری خدمت میں آ موجود ہوتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھوں اُس کی توضیح و تشریح کرتا رہے۔ اور جب کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ گردوپیش کی پہاڑیوں پر ہوا خوری کروں تو وہ محافظ کی حیثیت سے میرے ساتھ چلنے پر اصرار کرتا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر خدانخواستہ مجھے کسی قسم کا خطرہ درپیش ہو تو وہ اپنے مضبوط بازوؤں کے بجائے اپنی لمبی ٹانگوں سے کام لے کر زیادہ خوش اور مطمئن ہوگا۔ ان کمزوریوں کے باوجود مونتیو ایک دلچسپ ساتھی ہے۔ وہ طبعاً سادہ اور حد درجہ خوش مزاج ہے۔ دیہاتی

نانیوں کی طرح اُسے آس پاس کے لوگوں کے متعلق ہر طرح کی بُری بھلی باتیں معلوم ہیں اور اُس میں اِن باتوں کو مزے لے لے کر بیان کرنے کا پُورا سلیقہ ہے۔ لیکن جس بات پر خود اُسے فخر ہے وہ قلعے اور اُس کے گرد و نواح کے متعلق معلومات کا وہ ذخیرہ ہے جو اُس کے سینے میں محفوظ ہے۔ قلعے کے ہر بُرج و مینار اور ہر در و دیوار کے متعلق اُس کے پاس بے شمار عجیب و غریب داستانیں محفوظ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی صداقت پر اُسے پُورا ایمان ہے۔

داستانوں کا یہ ذخیرہ، خود اُس کے بیان کے مطابق، اُسے اُس کے دادا سے ورثہ میں ملا ہے۔ اُس کا دادا درزی تھا۔ اُس نے سو برس کی عمر پائی اور اِس مدت میں صرف دو مرتبہ قلعے کی حد سے باہر نکلا۔ اِس گزری ہوئی صدی کے بڑے حصے میں اُس کی دُکان داستانوں اور افسانوں کا مرکز رہی۔ لوگ یہاں جمع ہوتے اور آدھی رات تک بیٹھے قلعے کی گزری ہوئی زندگی کے حیرت انگیز افسانے سُناتے اور پوشیدہ راز افشا کرتے۔ اِس پستہ قامت تاریخی درزی کا فکر و عمل اور اُس کے حرکات و سکنات قلعے کی دیواروں تک محصور و محدود تھے۔ وہ انھیں کے زیرِ سایہ پیدا ہوا، پلا بڑھا اور جیا۔ اُس کے ہر نفس پہ، اُس کی پُوری ہستی پر اِن کا سایہ تھا۔ انھیں کے سائے میں اُس نے موت کو لبیک کہا اور یہیں کی خاک میں دفن ہوا۔ لیکن آنے والی نسلوں کی خوش نصیبی سے اُس کی طلسمی داستانیں اُس کے ساتھ دفن نہیں ہوئیں۔ معتبر اور مستند ماتیو بچپن ہی سے اپنے دادا کی زبان سے یہ طلسمی داستانیں سُنتا اور دکان میں سُنے ہوئے افسانوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا۔ اس طرح اُس کا سینہ الحمرا کے متعلق ایسی بے شمار معلومات اور افسانوں کا بیش بہا خزینہ بن گیا جو کسی کتاب میں درج نہیں۔ اور اس لئے ہر متجسس اور مشتاق سیاح کے لئے اُس کی ذات عجیب گونہ دلچسپیوں کا مرکز تھی۔

یہ ہیں میرے شاہی مسکن کے مکین۔ اور مجھے یقین ہے کہ مجھ سے پہلے جتنے بادشاہ اس کے مکین رہ چکے ہیں، اُن کی خدمت بھی اس سے زیادہ وفاداری سے نہیں کی گئی ہوگی جتنی مجھے حاصل ہے۔ میں اپنے شاہی مسکن میں بے حد مطمئن اور مسرور ہوں۔

جب میں صبح سویرے سو کر اُٹھتا ہوں تو ہر کلا پی کِھلے ہوئے خوش رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ میری

خدمت میں پیش کرتا ہے۔ ان پھولوں کو ڈولرس کے نازک اور باسلیقہ ہاتھ بعد میں گلدانوں میں سجا دیتے ہیں۔ میرے کھانے کے لئے نہ کوئی جگہ مخصوص ہے اور نہ وقت مقرر ہے۔ میں جب اور جہاں بیٹھ کر چاہتا ہوں کھانا کھاتا ہوں ـــــ کبھی شاہی ایوانوں میں، کبھی شجروں والے صحن کے کسی کنج میں، پھولوں اور فواروں کی حسین صحبت اور ہم نشینی میں۔ میں جب گھر سے باہر نکلتا ہوں تو مونبو جیسا رہنما مجھے پہاڑی کے پوشیدہ رومانی گوشوں اور وادی کی فرحت بخش تنہائیوں کی سیر کراتا اور وہ حیرت انگیز افسانے سناتا ہے جو ان گوشوں اور تنہائیوں سے وابستہ ہیں۔ گو دن کے بڑے حصے میں میں تنہا رہنا پسند کرتا ہوں لیکن شام کو کبھی کبھی خاتون انطونیہ کی گھریلو صحبتوں میں بیٹھ کر اپنا دل بہلاتا ہوں۔ عام طور سے یہ صحبتیں شاہی زمانے کے ایک وسیع ایوان میں منعقد ہوتی ہیں، جو خاتون انطونیہ کے لئے بیک وقت نشستگاہ، خوابگاہ اور باورچی خانے کا کام دیتا ہے۔ شاہی عہد میں اس ایوان کا شکوہ یقیناً قابلِ دید رہا ہوگا۔ لیکن اب اس ایوان کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ اب اس کے ایک کونے میں آتشدان بنا ہوا ہے، جس کے دھوئیں نے دیواروں کا رنگ بدل دیا ہے اور پرانے نقش و نگار اس کی سیاہی میں چھپ کر رہ گئے ہیں۔ شہ نشین پر بنی ہوئی ایک کھڑکی وادی کے رُخ کھلتی ہے اور وادی کی خنک ہوا اسی میں ہو کر کمرے میں آتی ہے۔ رات کی سادہ و بے تکلف صحبتوں میں میں یہیں بیٹھ کر کھانا کھاتا اور اپنے میزبانوں کی فرحت بخش گپ میں شریک ہوتا ہوں۔ اسپین کے باشندوں میں، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، خواندہ ہوں یا ناخواندہ، فطرتاً یہ خوبی ہے کہ آدمی اُن سے مل کر اور اُن کے ساتھ بیٹھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُن کے اندازِ گفتگو اور رہن سہن میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں۔ قدرت نے اُن کی سیرتوں کو ایک خاص طرح کا وقار بخشا ہے۔

تائی انطونیہ اپنی کم علمی کے باوجود بڑی ذہین خاتون ہے اور چمکیلی آنکھوں والی ننھی ڈولرس نے گو تین چار کتابوں سے زیادہ نہیں پڑھیں لیکن اس کی شخصیت سادگی و شوخی کا بڑا دلکش مجموعہ ہے۔ کبھی کبھی اُس کی بے لوث حاضر جوابی مجھے حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ میٹول کبھی کبھی کوئی پرانا طربیہ پڑھ کر صحبت میں ادبی رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ گو ایسے موقعوں پر کسی اور کو متاثر کرنے سے زیادہ ڈولرس کو خوش کرنے کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ حالانکہ بیچارے میٹول کے لئے ہمیشہ یہ بات بڑی دل شکن اور مایوس کُن ہوتی ہے کہ طربیہ کا پہلا باب ختم ہونے سے پہلے ہی ڈولرس

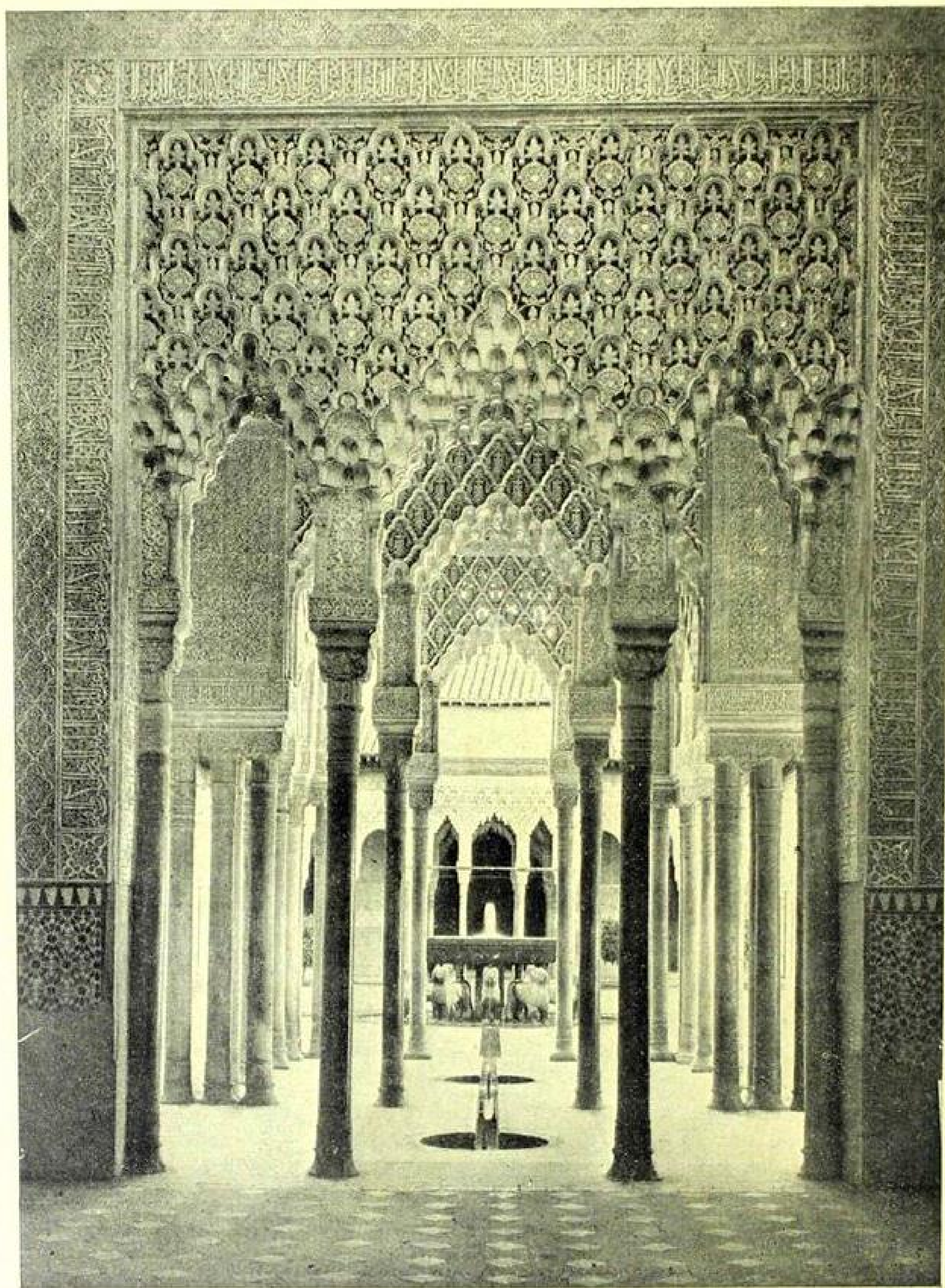
کو نیند آجاتی ہے ۔

تائی انطونیہ کے دوستوں اور جاننے والوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ ہے ۔ اِس حلقے میں آس پاس کے گھروں کے سیدھے سادے رہنے والے اور بوڑھے سپاہیوں کی بیویاں شامل ہیں ۔ تائی انطونیہ کے گھر آنے والے اُس کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار میں ہمیشہ تازہ بہ تازہ خبریں اور افواہیں اُس کی نذر کرتے ہیں ۔ مجھے بھی بارہا بہ تازہ بہ تازہ خبریں اور نو بہ نو افواہیں سُننے کا موقع مِلا ہے اور اِن میں مجھے مقامی باشندوں کے مزاج اور اُن کے ماحول کا رنگین عکس نظر آیا ہے ۔

اِن خبروں اور افواہوں کی تفصیلات ہسپانیہ کے باشندوں کی مسرّتوں اور اُن کے غموں کی تفصیلات ہیں ۔ مسرّت اور غم کے اسی عکس نے انھیں دلچسپ بھی بنایا ہے اور اہم بھی ۔

الحمرا کے اِن ایوانوں میں میرے لئے ذرا بھی اجنبیت نہیں ۔ میں نے بارہا تصوّر میں ان رومانی فضاؤں کی سیر کی ہے ۔ اپنے بچپن میں جب سے دریائے ہڈسن کے ساحل پر بیٹھ کر میں نے غرناطہ کی جنگوں اور بنی سراج اور بنی زکریا کے باہمی تفرقوں کا حال پڑھا ، غرناطہ اور اُس کے اطراف سوتے جاگتے میرے خوابوں کا پس منظر بن گئے ۔ تصوّر میں میں نے بارہا الحمرا کے ایوانوں کی سیر کی ہے اور اب میرے خوابوں کی تعبیر یہ ہے کہ میں الحمرا کے ایوانوں میں مکین ہوں ۔ کبھی کبھی مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب محض خواب ہے ۔ مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا کہ ابی عبداللہ کا محل آج میرا محل ہے اور اُس کی شہ نشین میں بیٹھا میں عہدِ شجاعت کے غرناطہ کا نظارہ کر رہا ہوں ۔ جب میں مشرقی شکوہ کے ان ایوانوں میں چلتا پھرتا ہوں تو اس کے فوّاروں کی جھنکار اور بلبلوں کی چہکار مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے ۔ جب الحمرا کے گلابوں کی خوشبو میری ناک میں پہنچتی ہے اور جب یہاں کی فرحت بخش اور خوشگوار ہوا مجھے ایک حیاتِ تازہ کا احساس دلاتی ہے تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنّت میں آگیا ہوں اور گداز جسم والی ، ننھی معصوم اور شوخ چشم ڈولرس اس جنّت کی ایک حور ہے ، جو میری مسرّتوں کو دوام و کمال عطا کرنے کے لئے خلق ہوئی ہے ۔

# الحمرا کی داستانیں



صحنِ اسود

# مرمریں مجسموں کا راز

اَلحمرا کے ایک ویران کمرے میں کسی زمانے میں ایک پستہ قد اور زندہ دل آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام لوپ سانچیز تھا۔ سانچیز باغ میں کام کرتا اور اپنے ہلکے پھلکے پھُرتیلے جسم کے ساتھ سارے دن باغ میں اِدھر اُدھر پھدکتا پھرتا تھا۔ دن بھر اِدھر سے اُدھر کام کرتے پھرنا اور گانا، یہی اُس کا مشغلہ اور معمول تھا۔ وہ ایک لحاظ سے قلعے کی روحِ رواں تھا۔ اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد وہ باغ میں پتھر کی کسی بنچ پر بیٹھ جاتا اور اپنے ستار پر کسی نہ کسی ہسپانوی ہیرو کی تعریف میں کوئی شیریں نغمہ بجانے لگتا۔ قلعے کے بوڑھے سپاہی اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور اُس کے نغمے سُن کر خوش ہوتے۔ کبھی کبھی وہ زیادہ سُریلی دُھن شروع کر دیتا اور قلعے میں رہنے والی بچیاں اس دُھن پر ناچنے لگتیں۔

سب پستہ قد آدمیوں کی طرح لوپ کی بیوی بھی ایک موٹی تازی اور بھدّی سی عورت تھی۔ وہ چاہتی تو لوپ کو اپنے دامن کے گھیر میں چھپا لیتی اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ لوپ غریب ہونے کے باوجود ایک بات میں غریبوں سے مختلف تھا۔ دس اولادوں کے بجائے اُس کے صرف ایک اولاد تھی۔ یہ اولاد کوئی بارہ برس کی ننھی

سنچکا تھی۔ سنچکا کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ وہ بھی لوپ کی طرح ہنس مکھ اور خوش مزاج اور اپنے باپ کی بے حد چہیتی تھی۔ لوپ باغ میں کام کرتا تو وہ اُس کے قریب ہی کھیلتی پھرتی۔ وہ کام سے فارغ ہو کر ستار بجاتا تو وہ اُس کی دُھن پر ناچتی اور الحمرا کے کنجوں، روشوں اور ویران ایوانوں میں ہرنی کی طرح دوڑتی پھرتی۔

آج سینٹ جان کے تہوار کی شام تھی اور الحمرا کے تفریح پسند مرد، عورتیں اور بچے تہوار منانے کے لئے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ چاندنی رات تھی اور پہاڑوں کا دامن نکھری ہوئی روپہلی چاندنی سے مالا مال تھا۔ شہر کے بُرج و مینار پہاڑوں کے سائے میں محوِ استراحت تھے۔ غرناطہ کی سرزمین اِس دھوپ چھاؤں کے کھیل میں پرستان معلوم ہو رہی تھی، اور سایہ دار کنجوں میں سے جھانکتے ہوئے چشمے اندھیرے میں اُجالا پھیلا رہے تھے۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر، پرانی رسم کے مطابق لوگوں نے ایک الاؤ روشن کیا تھا۔ پہاڑ کے دامن کی چھوٹی چھوٹی میدانی بستیوں میں بھی اسی طرح کے الاؤ جل رہے تھے اور چاندنی کے رنگ میں ہر طرف آگ کی زرد روشنی سونے کا رنگ گھول رہی تھی۔

لوپ سانچیز جو تہواروں اور جشنوں کے موقعے پر معمول سے زیادہ مگن ہوتا تھا، سرخوشی میں اپنا ستار بجا رہا تھا اور لڑکیاں ستار کی دُھن پر رقص کر رہی تھیں۔ ناچ ہو رہا تھا کہ ننھی سنچکا نے اپنی کچھ سہیلیوں کو ساتھ لیا، وہ چپکے چپکے سے مسلمانوں کے زمانے کے ایک قلعے کے کھنڈر میں جا گھسی اور چکنے چکنے پتھر چُننے شروع کر دیئے۔ پتھر چُنتے چُنتے اُسے سیاہ پتھر کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا ہاتھ ملا۔ ہاتھ کی مٹھی مضبوطی سے بند تھی۔ سنچکا اپنی خوش نصیبی پر حد درجہ مسرور، دوڑی دوڑی اپنی ماں کے پاس آئی اور وہ ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ سیاہ پتھر کے اس ہاتھ کو دیکھ کر لوگوں نے اُس کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔ اکثر نے اِسے شُبہ کی نظر سے دیکھا۔ ایک نے گھبرا کر کہا "اسے پھینک دو۔ یقین جانو کہ یہ ہاتھ جادو کا ہے اور اِس میں ضرور کوئی نہ کوئی شر چھپا ہوا ہے" دوسرا بولا "نہیں نہیں، تم اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکے۔ سقاطین کے کسی جوہری کو دکھاؤ۔ وہ تمہیں اس کی اچھی قیمت دے دیگا" گندمی رنگ کا ایک بڈھا سپاہی آگے بڑھا۔ اُس نے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور تھوڑی دیر میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ "میں نے اپنے افریقہ کے قیام میں اس طرح کی چیزیں بارہا دیکھی ہیں۔ اِسے ایک طرح کا تعویذ سمجھو، جو تمہیں بُری نظر سے اور ہر طرح کے ٹونے، ٹوٹکے اور جادو کے اثر سے محفوظ

رکھے گا۔ عزیز لوپ! مبارک ہو! یہ سیاہ ہاتھ تمہاری بیٹی کے لئے ایک نیک فال ہے۔"

بوڑھے سپاہی کی یہ باتیں سن کر لوپ کی بیوی نے اُس ننھے سے ہاتھ کو ایک ربن میں باندھ کر اپنی بیٹی کے گلے میں ڈال دیا۔

اس تعویذ نے تہوار کی ساری فضا بدل دی۔ لوگوں کے دل میں مُوروں کے متعلق جو طرح طرح کی باتیں جمع تھیں وہ ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ رقص و سرود بند ہو گیا، لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں زمین پر بیٹھ گئے اور وہ پُرانی داستانیں دُہرائی جانے لگیں جو لوگ اپنے بزرگوں سے سُنتے چلے آئے تھے۔ بعض طلسمی داستانوں کا پس منظر وہی پہاڑی تھی جہاں اِس وقت سب جمع ہوئے تھے۔ ایک بڑی بوڑھی نے بڑی تفصیل سے پہاڑی کے غاروں میں بنے ہوئے ایک محل کا حال بتایا جس میں ابی عبداللہ اور اُس کے سب درباری کسی سحر کی تاثیر سے اب تک قید ہیں۔ "سامنے کے کھنڈروں میں" اُس نے پہاڑ کے ایک دُور اُفتادہ حصّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایک گہرا اور تاریک غار ہے جو پہاڑ کے سینے کو چیرتا ہوا اُس کی اندرونی تہہ تک چلا گیا ہے۔ کوئی غرناطہ کے سارے خزانے بھی مجھے دے ڈالے تو میں اس غار میں نہ جھانکوں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ الحمرا کے ایک غریب آدمی کی ایک بکری پہاڑی پر چرتے چرتے اس غار میں گھس گئی۔ بکری والا بکری کے پیچھے پیچھے اس غار میں گھس گیا۔ لیکن جب وہ غار میں سے نکلا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ غار کے اندر اُس نے جو عجیب و غریب چیزیں دیکھی تھیں، جب وہ اُن کا ذکر لوگوں سے کرتا تو لوگ سمجھتے کہ ضرور اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ دو ایک دن تک لوگوں سے کہتا رہا کہ غار کے اندر مسلمان جشنیوں کے بھوت ہیں اور انھوں نے اُس کا پیچھا کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ مدّتوں بکریاں چرانے پہاڑی پر نہیں گیا۔ لیکن ایک دن ہمّت کر کے اُوپر گیا تو پھر نیچے نہیں اُترا۔ لوگوں کو اُس کی بکریاں کھنڈروں میں چرتی ہوئی ملیں۔ اُس کی ٹوپی اور لبادہ غار کے مُنہ کے پاس پڑا تھا لیکن غریب چرواہے کو اس کے بعد کسی نے نہیں دیکھا۔"

ننھی سنچکا غریب چرواہے کی داستان بڑے غور سے سُن رہی تھی۔ وہ دم بخود تھی۔ جب داستان ختم ہو چکی تو اُس کے دل میں اس خطرناک غار کا حال معلوم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ ابھی لوگ بوڑھے چرواہے

کی کہانی کے خیال میں گم تھے کہ وہ وہاں سے اُٹھی اور اُن کھنڈروں کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی جہاں حبشی عکمرانوں کی رُوحیں منڈلا رہی تھیں۔ اُسے بہت جلد وہ کھنڈر اور غار کا دہانہ مل گیا اور اُس نے بڑے اشتیاق سے اُس کے اندر جھانکا۔ لیکن وہاں تاریکی اور اتھاہ گہرائی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ خوف سے اُس کے خون کی روانی رُک گئی، جسم ٹھنڈا پڑگیا اور وہ پیچھے ہٹ آئی۔ پہلے تو اُس نے وہاں سے بھاگ چلنے کا ارادہ کیا لیکن پھر جیسے اُسے اپنے خوف میں بھی ایک عجیب سی لذّت محسوس ہوئی اور اُس کے قدم ایک بار پھر غار کے دہانے کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ پھر اُس پر جھک کر اُس کی تاریکی اور گہرائی میں جذب ہوگئی۔ بالآخر وہ وہاں سے اُٹھی اور بڑا سا پتّھر سرکا کر غار کے دہانے پر لائی۔ زور لگا کر اس پتّھر کو غار کے اندر سرکا دیا۔ پتّھر کچھ دیر خاموشی سے اس بھیانک تاریکی میں نیچے گرتا رہا، پھر کسی پتھریلی چیز سے ٹکرایا اور گنبد کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتا اور ٹکراتا اور بادلوں کی سی گرج پیدا کرتا رہا اور آخر ایک زوردار چھپاکے کے ساتھ پانی میں گر پڑا ——— غار کی اتھاہ گہرائیوں میں سے ایک آواز سفر کرتی ہوئی باہر نکلی اور پھر ہر طرف خاموشی چھاگئی۔

لیکن یہ خاموشی زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ ایسا معلوم ہُوا کہ پتّھر کے چھپاکے نے غار کی سوتی ہوئی دُنیا میں ہلچل مچادی۔ غار کی تہ سے آہستہ آہستہ بھن بھناہٹ کی ایسی آوازیں باہر نکلنے لگیں جیسے کسی نے مکھیوں کے بہت سے چھتّوں کو چھیڑ دیا ہو۔ بھن بھناہٹ کی آواز رفتہ رفتہ تیز ہوتی رہی اور بڑھتے بڑھتے اُس نے سرسراہٹ اور بڑبڑاہٹ کی صُورت اختیار کرلی۔ غار کے اندر سے بے شمار آدمیوں کے بولنے اور چلنے پھرنے کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں، پھر اِن آوازوں میں ہتھیاروں کی دھیمی جھنکار بھی شامل ہوئی اور غار کے اندر سے جلاجل کی کھنک اور دَفوں کی دھمک کا مِلا جُلا شور باہر نکلنے لگا، جیسے غار کی طلسمی دُنیا میں کوئی فوج جنگ کے لئے آراستہ و صف بستہ ہو رہی ہے۔

ننھی سنچکا پر ہیبت طاری ہوگئی اور وہ بھاگ کر اُس جگہ پہنچ گئی جہاں تھوڑی دیر پہلے اُس نے بوڑھے چرواہے کی کہانی سُنی تھی۔ وہاں اب کوئی نہ تھا۔ الاؤ کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی اور چاندنی کے نکھار میں دھوئیں کے آخری حلقے بَل کھا رہے تھے۔ وادی اور پہاڑی کے دامن میں تھوڑی دیر پہلے تک جو الاؤ روشن تھے

وہ بجھ چکے تھے اور فضا پر بلند مُسلّط تھی۔ سنچکا نے اس تنہائی میں اپنے ماں باپ کو اور نام لے لے کر اپنی سہیلیوں کو آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ گھبرا کر اُس نے نیچے کی طرف بھاگنا شروع کیا اور باغوں کے سائے سائے درختوں کی اُس روش تک پہنچ گئی جو الحمرا کی طرف جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ ایک بنچ پر بیٹھ کر سانس لینے لگی۔ الحمرا کی پہرہ چوکی سے بارہ کا گھنٹا بجا۔ ہر چیز محوِ خواب و استراحت تھی —— الحمرا کے اس گھنٹے کی آواز اور جھاڑیوں میں بہتے ہوئے کسی شبک سیر چشمے کی سوا جس کی رفتار فضا میں گھنگھرو سے بجا رہی تھی۔ فضا کی خواب آور شیرینی اُسے لوریاں دے رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں کہ اُسنے ذرا فاصلے پر ایک چمک سی دکھائی دی۔ آہستہ آہستہ یہ چمک قریب ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک لشکرِ جرار پہاڑی سے نیچے اُتر کر سایہ دار روشوں کے راستے الحمرا کی طرف آ رہا ہے۔ لشکر کے سواروں میں سے کچھ نیزوں اور ڈھالوں سے مسلّح ہیں، کچھ کے ہاتھوں میں نیزے اور جنگی کلہاڑیاں ہیں۔ سواروں کے جسم چمکیلے خودوں اور زرہوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور چاندنی کی روشنی میں اُن کے جسم آئینے کی طرح چمک رہے تھے۔ اُن کے رہوار ناز سے اِترا اِترا کر چل رہے تھے لیکن اتنے سُبک رو تھے کہ اُن کے پیروں کی چاپ کی آواز بھی بہ مشکل سُنائی دیتی تھی۔ سواروں کے چہروں پر البتہ موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اِن کے جِلو میں ایک شہزادی کا گھوڑا تھا۔ شہزادی کے سر پر موتیوں کا تاج تھا اور اُس کے لمبے گیسوؤں کا ہر تار موتیوں کی لڑی بنا ہوا تھا۔ اُس کے خوبصورت گھوڑے کی سُرخ مخملی جھول جس پہ زردوزی کا کام بنا ہوا تھا دونوں طرف زین پر لٹک رہی تھی۔ شہزادی کے چہرے پر افسردگی تھی اور اُس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔

فوجی دستہ سواروں کے پیچھے درباریوں کا قافلہ تھا، جن کے سروں پر رنگ برنگے صافے اور جسموں پر بیش قیمت بوقلموں ملبوس تھے۔ پُرشکوہ درباریوں کے جھرمٹ میں ایک حسین سُنہرے رنگ کے گھوڑے پر شاہ ابی عبداللہ سوار تھا، جس کے جسم پر مُرصّع قرغل اور سر پہ زرّیں تاج تھا، جو جواہرات کی جوت سے چمک رہا تھا۔ ننّھی سنچکا تصویر خانے کی تصویروں میں بارہا اُس کی تصویر دیکھ چکی تھی۔ اُس نے اُسے فوراً ہی اُس کی زرد رنگ کی داڑھی سے پہچان لیا۔ یہ شاہی جلوس بڑی آب و تاب سے درختوں کے بیچ میں سے گزر رہا اور وہ اِسے حیرت و مسرّت سے دیکھتی رہی۔ وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ بادشاہ، اُس کے شاندار درباری

اور جنگجو شہ سوار، جن کے لبوں پر سکوت، اور چہروں پر زردی چھائی ہوئی تھی، اگرچہ وہ پیش کے عام لوگوں سے بالکل مختلف، سحر و طلسم کی دُنیا کی مخلوق ہیں، لیکن وہ بغیر کسی خوف و ہراس کے انھیں دیکھتی رہی اور یہ ہمت یقیناً اُس پُر اسرار تعویذ کی پیدا کی ہوئی تھی جو اُس کے گلے میں پڑا تھا۔

جب یہ شاہی جلوس گزر گیا تو وہ اُٹھی اور خاموشی سے اُس کے پیچھے ہولی۔ جلوس الحمرا کے باب العدل کی طرف جا رہا تھا اور باب اُس کے خیر مقدم کے لئے کھُلا ہُوا تھا۔ بوڑھے اپاہج سنتری پتھر کی بنچوں پر مدہوش و مسحور پڑے تھے۔ شاہی جلوس خاموشی اور سکوت سے، شاہی پرچم کو لہراتا اُن کے قریب سے گزر گیا۔ سنچکا حیرت اور ستائش کے جذبات میں غرق اِس جلوس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اُسے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ فصیل کے اندر، ایک جگہ سے زمین شق ہوگئی اور جلوس اس شگاف کے راستے زمین کی تہ میں اُترنے لگا۔ سنچکا بھی آگے بڑھی۔ اُس نے دیکھا کہ قلعے کے نیچے کی سنگین زمین میں پتھر کو کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی ہیں اور یہ سیڑھیاں ایک تنگ و تاریک راستے پر جاکر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس تنگ تاریک راستے کے دونوں طرف، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چاندی کے چراغ روشن ہیں، جن میں سے ہلکے اور خنک نُور کے علاوہ بڑی خوشگوار مہک بھی نکل رہی ہے۔ سنچکا اِس راستے کو طے کرتی ہوئی آگے بڑھی، یہاں تک کہ وہ ایک وسیع ایوان میں پہنچ گئی جو مسلمان حکمرانوں کے لطیف ذوق کے مطابق آراستہ تھا اور نقرئی اور بلوریں فانوسوں سے بقعۂ نُور بنا ہُوا تھا۔ ایوان کے وسط میں ایک سفید ریش بڈھا، حوروں کے قیمتی لباس میں ملبوس مسند نشین تھا۔ اُس کے نحیف و ناتواں ہاتھ میں ایک عصا تھا جسے وہ بہ مشکل سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ سفید ریش بوڑھا مسند پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا اور اُس سے تھوڑے فاصلے پر ایک حسینہ، جس کے بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے، قدیم ہسپانوی لباس پہنے اور سر پر چمکیلا جڑاؤ تاج رکھے آہستہ آہستہ ایک نقرئی چنگ بجا رہی تھی۔ اِس حسین منظر کو دیکھ کر ننھی سنچکا کو اُس گاتھی شہزادی کی کہانی یاد آگئی جسے ایک موب ساحر نے الحمرا کی پہاڑیوں میں قید کر رکھا ہے اور جس پر ہر گھڑی اُس کے سحر کا افسوں طاری رہتا ہے۔

حسین مُطربہ نے ننھی سنچکا کو ایوان کے ایک طرف کھڑا دیکھا تو حیرت اور محبت سے اُس سے

پوچھنے لگی " کیا آج سینٹ جان کا تہوار ہے ؟"

" ہاں !" ننھی سنچکا نے جواب دیا۔

" تو آج میں سحر کے طلسم سے آزاد ہوں۔ پیاری بچی ! ڈرومت ! میرے پاس آؤ۔ میں بھی تمھاری طرح عیسائی ہوں اور سحر کی قید میں ہوں۔ تمھارے گلے میں جو تعویذ پڑا ہے اُسے میری زنجیروں سے چھُوا دو اور میں آج رات کے لئے قید سے آزاد ہو جاؤں گی۔"

طلسم زدہ شہزادی نے یہ کہا اور اپنا لباس اُٹھا کر وہ طلائی زنجیریں دکھائیں جنھوں نے اُس کے جسم کو جکڑ رکھا تھا۔ ننھی سنچکا نے طلسمی تعویذ جلدی سے اُس کی طلائی زنجیروں پر رکھ دیا اور زنجیریں فوراً کٹ کر زمین پر گر پڑیں۔ زنجیروں کی جھنکار سے بوڑھا ساحر چونک پڑا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا، لیکن حسین شہزادی نے جوں ہی اپنی نازک اُنگلیوں سے چنگ کے تار چھیڑے اُس کی آنکھیں پھر جھپک گئیں۔ پہلے کی طرح اُس کا سر پھر ہلنے لگا اور ہاتھ کا عصا پھر پہلے کی طرح کانپنے لگا۔

شہزادی نے چپکے سے سنچکا کے کان میں کہا " اپنا تعویذ ذرا اس کے عصا پر رکھ دو۔" سنچکا نے ایسا ہی کیا۔ عصا اُس کے ہاتھ سے چھُٹ کر زمین پر گر پڑا اور بوڑھا ساحر نیند سے مدہوش ہو کر مسند پر دراز ہو گیا۔ شہزادی نے نقرئی چنگ ساحر کے سرہانے رکھ دیا۔ اُس کے تار اُس کی اُنگلیوں کے مس سے جھنجھنا اُٹھے۔ اس کے بعد وہ سنچکا سے مخاطب ہو کر بولی " ننھی بچی ! آؤ میں تمھیں الحمرا کی سیر کراؤں۔ آج تمھیں الحمرا میں اُسی شان و شکوہ کا جلوہ نظر آئے گا جو عہدِ شاہی میں اُس کے لئے خاص تھا۔" سنچکا خاموشی سے شہزادی کے پیچھے ہولی۔ دونوں تہ خانے میں سے نکل کر باب العدل کی فصیل کے قریب پہنچے، اور وہاں سے فوّاروں والے صحن میں آگئے۔

صحن میں ہر طرف عرب سپاہیوں اور سرداروں کا ہجوم تھا۔ پیدل اور سوار، دستوں میں بٹے ہوئے اپنے اپنے پرچم لہرا رہے تھے۔ ڈیوڑھی پر شاہی سنتری تعینات تھے اور افریقی حبشی تلوار بکف، جا بجا صف بستہ کھڑے تھے۔ سب کے لبوں پر سکوت طاری تھا۔ ننھی سنچکا، شہزادی کی رہنمائی میں بے جھجک آگے بڑھتی رہی۔ وہ مبہوت اور محوِ حیرت تھی۔ لیکن شاہی محل میں پہنچ کر اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ چاندنی سے محل کے ایوان، صحن اور باغ اتنے روشن تھے جیسے دن کی روشنی میں۔ لیکن اس روشنی میں اِن کا منظر اُس سے مختلف تھا جیسا سنچکا کی آنکھیں

اُسے دیکھنے کی عادی نہیں۔ ایوانوں کے در و دیوار پر آج داغ دھبوں کا نشان تک نہ تھا اور محل میں آج مکڑی کے جالوں کے بجائے ہر جگہ دمشق کے بیش قیمت حریری پردے ٹنگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بنے ہوئے رنگین اور طلائی نقوش میں آج صدیوں پہلے کی شوخی اور تازگی تھی۔ جو ایوان ہمیشہ ساز و سامان سے خالی نظر آتے تھے آج وہ نادر و نایاب مسندوں اور قالینوں سے آراستہ تھے اور صحنوں اور گلشنوں کے فوّارے آج آبدار موتی بکھیر رہے تھے۔

مطبخ آج پھر پوری طرح گرم تھے اور طبّاخ لذیذ کھانے پکانے میں مصروف تھے۔ تیتروں اور بٹیروں کے بھُننے اور تلنے کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی تھی۔ ملازمین شاہی ایوانِ نعمت سے بھری ہوئی نقرئی و طلائی قابیں لئے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے اور ایک شاندار ضیافت کی تیاری میں مصروف تھے۔ شیروں والے صحن میں امیروں اور درباریوں کا ہجوم تھا اور دربارِ عدل میں ابی عبداللہ اپنے تختِ شاہی پر جلوہ فگن تھا۔ دربار درباریوں سے آراستہ تھا اور عصائے شاہی ایک بار پھر ماضی کے عظمت و جبروت کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ اِس ہجوم، اِس رونق اور اِس گھما گھمی کے باوجود ہر طرف خاموشی تھی، نہ لبوں کی گنگناہٹ نہ قدموں کی چاپ۔ فوّاروں کی جھنکار کے سوا کوئی رات کے سکوت میں مخل نہ تھا۔ حیرت زدہ سنچکا یہ عجیب و غریب مناظر دیکھتی مبہوت اور خاموش اپنے رہبر کے نقشِ قدم پر چلتی رہی، یہاں تک کہ وہ دونوں بُرج قمارش کے نیچے بنے ہوئے بڑے پھاٹک کے پاس پہنچ گئے۔ پھاٹک کے دونوں طرف سنگِ مرمر کے بنے ہوئے پریوں کے دو مجسّمے رکھے ہوئے تھے۔ اِن دونوں مجسّموں کی آنکھیں ایک ہی نقطہ پر جمی ہوئی تھیں۔ طلسمی شہزادی اس جگہ رُکی اور سنچکا کے کان میں کہا "یہاں ایک بڑا راز پوشیدہ ہے، وہ راز تمہاری ہمّت اور وفاداری کا انعام ہے۔ دیکھو! جس جگہ اِن دونوں مجسّموں کی نظریں جمی ہوئی ہیں وہاں ایک مورِ شہنشاہ کا خزانہ دفن ہے۔ یہ بات تم اپنے باپ کو بتا دینا۔ وہ اس جگہ کو کھودے گا تو اتنا بڑا خزانہ اُس کے ہاتھ آئے گا کہ وہ غرناطہ کا سب سے امیر آدمی ہو جائے گا۔ لیکن اس خزانے کو صرف معصوم ہاتھ اس کی جگہ سے اُٹھا سکتے ہیں۔ اپنے باپ سے کہنا کہ اس دولت کو احتیاط سے صرف کرے اور اس میں سے تھوڑا سا حصّہ اس نیّت سے خیرات کرے کہ خُدا مجھے اِس سحر کے طلسم سے آزاد کرے۔"

شہزادی ننھی سنچکا کو خزانے کا بھید بتا کر بُستانِ لندراخا میں لے گئی۔ باغ کے درمیان میں ایک فوّارہ

لگا ہوا تھا۔ چاندنی فوارے کے شفاف پانی میں کانپ رہی تھی اور نارنگی اور ترنج کے سبز پتّے چاند کی دھیمی روشنی میں زمرد کی طرح چمک رہے تھے۔ حسین شہزادی نے حنا کی ایک پتلی سی ٹہنی توڑی اور بل دے کر سنچکا کے سر پہ رکھ دی۔ "یہ زمردیں تاج اُس بھید کی تصدیق پر مُہر ہے، جو میں نے ابھی تمھیں بتایا ہے۔ میرا وقت پُورا ہو چکا۔ مجھے اب طلسمی ایوان میں واپس جانا چاہیئے۔ تم میرا پیچھا مت کرنا۔ خدا تمھیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ خدا حافظ!" شہزادی ننھی سنچکا سے یہ باتیں کہہ کر اُس تاریک راستے کی طرف مُڑ گئی جو برج قمارش کی طرف جاتا ہے اور اُس کے بعد پھر نظر نہ آئی۔

الحمرا سے ذرا دُور جھونپڑیوں سے مُرغِ سحر کی ہلکی ہلکی بانگ سُنائی دی اور مشرق کی طرف پہاڑوں پر روشنی کی ایک زرد کرن نے جھانکنا شروع کیا۔ الحمرا کے ایوانوں میں ہوا کی سرسراہٹ پیدا ہوئی، ایوانوں اور دالانوں میں ہر طرف خزاں کے زرد پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ سُنائی دینے لگی، اور قصر کے کھُلے ہوئے دروازے ایک ایک کر کے دھماکے کے ساتھ بند ہونے لگے۔

سنچکا دوڑی ہوئی محل کے اندر گئی کہ ایک بار پھر اُن طلسمی مناظر کا نظارہ کرے جنھیں دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی تھی۔ لیکن ابی عبداللہ کا دربار اُجڑ چکا تھا اور محل میں ہر طرف پھر وہی پہلی سی ویرانی تھی۔ چاند کی روشنی اب بھی قصر کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی لیکن تابانی و درخشانی ختم ہو چکی تھی۔ دیواروں پر مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے، چمگادڑ دھندلکے میں دیواروں سے ٹکراتے پھر رہے تھے اور مینڈکوں کے ٹرّانے کی آوازیں باغ میں گونج رہی تھیں۔

سنچکا اس ویرانی پر نظر کرتی قصر کے اُس حصّے کی طرف آئی جہاں اُس کے گھر والے رہتے تھے۔ دروازہ حسبِ معمول کھُلا ہوا تھا اس لئے کہ غریبی کو دروازے مقفّل رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوئی اور اپنے بچھونے میں گھُس گئی۔ لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کو سنچکا نے رات کی باتیں اپنے باپ کو سنائیں تو وہ ہنس پڑا۔ اُسے سنچکا کی سب باتیں خواب معلوم ہوئیں اور وہ اپنی بیٹی کی سادگی پر ہنستا ہوا باغ میں چلا گیا۔ ابھی اُسے کام شروع کئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ننھی سنچکا ہانپتی کانپتی دوڑی ہوئی اُس کے پاس آئی "ابّا! ابّا! دیکھو یہ حنا کا تاج جو شہزادی نے رات مجھے

پہنایا تھا۔"

لوپ تاج کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اس لئے کہ حنا کی ٹہنی خالص سونے کی تھی اور اُس کی سبز پتیاں ترشے ہوئے قیمتی زمرد کی۔ غریب لوپ حنائی تاج کی صحیح قیمت کا اندازہ تو نہیں لگا سکا لیکن اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ سنچکا نے اُسے جو کچھ بتایا ہے وہ خواب نہیں حقیقت ہے اور ایسی حقیقت جس کا بھید کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ سنچکا کو خاموش رہنے کی تاکید کر کے وہ قصر کے اُس حصے میں گیا جہاں پریوں کے مرمریں مجسمے استادہ تھے۔ جیسا کہ سنچکا نے بتایا تھا دونوں مجسموں کی نظریں ایک ہی نقطہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے اس نقطہ کے قریب دیوار پر نشان لگایا اور وہاں سے چلا آیا۔

لوپ کا سارا دن عجب طرح کی بے چینی میں کٹا۔ مرمریں مجسمے سارے دن اُس کی آنکھوں میں پھرتے رہے۔ وہ سہم سہم کر بس یہی سوچتا رہا کہ کہیں خزانے کا بھید کھُل نہ جائے۔ وہ آس پاس قدموں کی چاپ سُنتا اور اُس کا دل اندیشے سے لرز جاتا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح مرمریں مجسموں کی گردن موڑ کر اُن کی نظروں کا رُخ پھیر دے اور وہ خزانے کی طرف دیکھنا بند کر دیں۔ اپنی گھبراہٹ اور پریشانی میں وہ یہ نہ سوچتا کہ مجسمے صدیوں سے اُسی رُخ دیکھ رہے ہیں اور خزانے کا بھید اب تک کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔

وہ اپنے جی ہی جی میں کہتا "خدا انھیں سمجھے۔ بھلا کسی راز کو پوشیدہ رکھنے کا یہ کونسا طریقہ ہے؟" وہ کسی کو مجسموں کی طرف آتے دیکھتا تو فوراً کہیں چھُپ جاتا کہ اُس کا وہاں ہونا کسی کے دل میں شُبہ نہ پیدا کر دے۔ کبھی وہ دُور کھڑے ہو کر، بڑی احتیاط سے مجسموں پر نظر ڈالتا لیکن مجسموں پر نظر پڑتے ہی لوگوں کی نادانی پر اُس کا جی جل جاتا اور وہ جیسے چیخ اُٹھتا "مرمریں مجسمے! آرام سے ایک جگہ بیٹھے بس اُدھر گھورے چلے جا رہے ہیں جدھر اُنھیں دیکھنا بھی نہیں چاہیئے۔ عورتیں، وہ چاہے مجسمے ہی کیوں نہ ہوں، سب ایک سی ہوتی ہیں۔ وہ اگر زبان سے کسی کا بھانڈا نہ پھوڑ سکیں تو آنکھوں سے رسوا کر کے رہیں گی۔"

بالآخر خدا خدا کر کے دن ختم ہوا اور الحمرا کے ایوانوں میں گونجنے والے قدموں کی آواز ختم ہوئی۔ آخری سیاح کے قصر کے باہر قدم رکھتے ہی بڑے پھاٹک میں تالا پڑ گیا اور آہستہ آہستہ چمگادڑوں، مینڈکوں اور اُلوؤں نے قصر کی ویرانی اور تاریکی پر قبضہ جما لیا۔

رات آہستہ آہستہ زیادہ تاریک اور سنسان ہوتی گئی اور جب ہر طرف سنّاٹا چھا گیا تو لوپ، ننھی سنچکا کو لیکر پریوں کے مرمریں مجسموں کے پاس گیا۔ وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے اُسی نقطے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لوپ اُن کے قریب سے گزرتے ہوئے جھک کر اُن کے کان میں کہتا گیا "معزّز خواتین! دو تین صدیوں سے یہ خزانہ تمہارے لئے بوجھ بنا ہوا تھا۔ گھبراؤ مت! آج میں تمہارے سر کا بوجھ ہلکا کر دوں گا۔" یہ کہا اور وہ دیوار کے اُس حصّے کے پاس آیا جہاں اُس نے صبح نشان لگایا تھا۔ نشان کے قریب کی زمین کو کھودنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں اُسے اُس کی محنت کا پھل مل گیا۔ زمین کی تہ میں سے مٹّی چینی کے دو بڑے بڑے مٹکے نکلے اور لوپ کو یقین ہو گیا کہ یہ بیش قیمت جواہرات سے پُر ہیں۔ اُس نے انھیں باہر نکالنے کی کوشش کی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن جوں ہی ننّھی سنچکا نے اُنھیں ہاتھ لگایا وہ آسانی سے باہر نکل آئے۔ لوپ نے بے تابی سے مٹکے کا منہ کھولا تو حیرت سے اُس کا منہ کھلا رہ گیا۔ مٹکے لبالب سونے کے سکّوں اور بیش قیمت جواہرات سے پُر تھے۔ دن نکلنے سے پہلے اُس نے بہ مشکل دونوں مٹکے اپنے گھر تک پہنچائے اور مرمریں مجسموں کو اب بھی دیوار کے اُسی گوشہ پر نظریں جمائے، تنہا چھوڑ کر چلا آیا۔

اس طرح قسمت نے لوپ سا بچیز کو رات کی رات مفلس و نادار سے امیر کبیر بنا دیا تھا۔ لیکن دولت اپنے ساتھ بے شمار فکریں اور پریشانیاں لائی، جن سے وہ اب تک واقف نہ تھا۔ اپنی دولت کو کس طرح کسی محفوظ جگہ پہنچائے؟ وہ کیسے اپنی دولت کو ایسے خرچ کرے کہ کسی کے دل میں شبہ نہ پیدا ہو؟ چور دل اور ڈاکوؤں کا کھٹکا بھی زندگی میں پہلی بار اُس کے دل میں پیدا ہوا۔ اُسے اپنا گھر غیر محفوظ نظر آنے لگا اور اُس نے بڑی احتیاط سے اپنے گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں میں اینٹیں چُن دیں۔ لیکن ان ساری احتیاطوں کے باوجود وہ رات کو چین کی نیند نہ سو سکا۔ اُس کی خوش مزاجی اور زندہ دلی رُخصت ہو گئی۔ اُس کے ہمسائے اُس کے لطیفوں اور گیتوں سے محروم ہو گئے۔ دولت نے الحمرا کے سب سے ہنس مکھ آدمی کو سب سے زیادہ غمگین اور افسردہ دل بنا دیا تھا۔ اُس کے دوستوں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ پہلے تو وہ اس کی حالت پر ترس کھاتے رہے لیکن بالآخر یہ سوچ کر کہ لوپ کی یہ افسردگی اُس کے غیر معمولی افلاس اور ناداری کا نتیجہ ہے، انھوں نے ایک ایک کر کے اُس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اُنھیں بھولے سے

بھی یہ گمان نہ گزرا کہ اُس کے غم کا سبب غریبی نہیں امیری ہے، افلاس نہیں، دولت کی فراوانی ہے۔

لوپ سانچیز کی بیوی اُس کے غموں کی شریک تھی لیکن اُس نے بہت جلد اپنے غم کو ہلکا کرنے کی تدبیر نکال لی۔ ہم اس سے پہلے یہ بتانا بھول گئے تھے کہ لوپ کی بیوی چونکہ اپنے شوہر کو نکما اور ناکارہ سمجھتی تھی اس لیے ضروری باتوں میں وہ پادری سائمن سے مشورہ لیتی تھی۔ مضبوط جسم، نیلی داڑھی اور گول سر والا سائمن قریب ہی کے ایک گرجے میں پادری تھا اور یاس پڑوس کی تقریباً سب عورتیں اُسے اپنا مُشیر اور ہم راز سمجھتی تھیں۔ طبقۂ نسواں کا یہ اعتماد سائمن کی خوش حالی و فارغ البالی کا سبب تھا اور اُس کے جسم کی چکناہٹ اور چمک کا راز بھی خوش حالی و فارغ البالی تھی۔ عورتیں سائمن کو اپنا مُشیر و ہم راز جانتیں اور سادہ دل مرد اُس کے احترام میں اپنی ٹوپیاں اُتارتے۔ اُس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں تقدس کا جو رنگ تھا وہ کتّوں کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں تھا اور اس لیے جدھر سے پادری سائمن گزرتا وہ اپنی اپنی کمین گاہوں سے بھونک بھونک کر اُس کا خیر مقدم کرتے۔

لوپ کی بیوی نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جب پادری سائمن کو خزانے کا راز بتایا تو اُس نے بار بار آنکھیں جھپکائیں، اپنے مُنہ کو کھولا اور بند کیا اور کم سے کم ایک درجن بار اپنے سینے پر مقدس صلیب کا نشان بنایا۔ تھوڑے سے پُر اسرار سکوت کے بعد اُس نے لوپ کی بیوی کو مخاطب کر کے کہا، "بیٹی! تیرے شوہر نے دُہرا جرم کیا ہے۔ وہ حکومت کا مُجرم اور دین کا گناہ گار ہے۔ جو خزانہ اُسے قصر کی چار دیواری میں ملا ہے وہ قانوناً حکومت کی ملکیت ہے۔ لیکن چونکہ اس خزانے پر سحر اور ابلیس کا سایہ ہے اس لیے وہ گرجے کا حصّہ ہے۔ لیکن ہم چاہیں تو سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ جاؤ، وہ حنائی تاج میرے پاس لاؤ۔"

پادری سائمن نے زمردیں تاج کو دیکھا تو زمرد کی چمک سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے اپنی آواز میں تقدس پیدا کرتے ہوئے کہا، "یہ تاج اِس شیطانی دولت کی پہلی علامت ہے اس لیے اسے پاکیزہ مصرف میں آنا چاہیے۔ میں اسے گرجے میں لے جاؤں گا اور سینٹ فرانسسکو کے مقدس مُجسّمے کے قدموں پر رکھ کر دعا کروں گا کہ اللہ تیرے شوہر کے گناہ بخش دے۔"

لوپ کی دانا بیوی نے اس سمجھوتے کو نفع کا سودا سمجھ کر تاج خوشی خوشی پادری کے حوالے کیا۔ پادری نے تاج اپنے لبادے میں چھپایا اور گرجے کا رُخ کیا۔

لوپ سانچیز گھر لوٹا تو اُس کی بیوی نے اُسے روداد سُنائی۔ لوپ یہ روداد سن کر سخت برافروختہ ہوا۔ اُسے یوں بھی پادری کا اپنے گھر آنا پسند نہیں تھا۔ اُس نے چیخ کر اپنی بیوی سے کہا "نادان عورت! تیری زبان درازی نہ جانے کیا گُل کھلا کر رہے گی۔"

بیوی نے بھی چیخ کا جواب چیخ سے دیا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں گناہوں کا بوجھ اپنے جی پر رہنے دوں؟"

شوہر نے غصّے سے جواب دیا "اپنے گناہوں کا بوجھ جتنا چاہے ہلکا کر لیکن جو خزانہ میں نے کھودا ہے، وہ گناہ تیرا نہیں میرا ہے اور میرا جی اس بوجھ تلے بھی ہلکا ہے۔"

لیکن سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ بھید کھُل چکا تھا اور ریت پر گرے ہوئے پانی کی طرح اب اُسے سربستہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اُن کی مُفر اسی میں تھی کہ پادری کی زبان بند رہے۔

اگلے دن جب لوپ سانچیز گھر پر نہیں تھا، کسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ کھلا تو پادری سامنے اندر آیا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور اُس پر نقاہت جھلک رہی تھی۔ پادری نے لوپ کی بیوی سے کہا "میں نے سینٹ فرانسسکو سے دُعا کی ہے اور شکر ہے کہ میری دُعا قبول ہوئی — میں نے رات سینٹ فرانسسکو کو خواب میں دیکھا تھا۔ سخت ناراض ہو کر اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ "ہمارے گرجے کی حالت اتنی خراب ہے اور تو دُعا مانگ رہا ہے کہ شیطانی دولت صرف کرنے والوں کے گناہ معاف ہو جائیں۔ تو لوپ سانچیز کے گھر جا اور گرجے کے دو شمعدان بنوانے کے لئے اُس سے کچھ روپیہ لے کر آ۔ اس کے بعد وہ اپنی دولت کو جس طرح چاہے خرچ کرے۔"

پادری کی باتیں سُن کر لوپ سانچیز کی بیوی کانپ اُٹھی۔ اُس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور چُپکے سے اُٹھ کر وہاں گئی جہاں لوپ نے اپنا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ چمڑے کی ایک بڑی سی تھیلی سونے کے سکّوں سے بھری اور لا کر پادری کے ہاتھ پر رکھ دی۔ پادری نے فلاح و برکت کی دعائیں دیں،

تھیلی اپنے لبادے کے اندر سرکائی اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

لوپ نے جب اپنی بیوی کی بخشش کے اس دوسرے کارنامے کا حال سنا تو وہ غصے سے دیوانہ ہوگیا۔
"بدنصیب عورت!" وہ چلایا "ہمارا کیا حشر ہوگا؟ یہ پادری آہستہ آہستہ ہماری ساری دولت لوٹ کر لے جائیگا اور ہم کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائیں گے۔"

بیوی نے بہ مشکل اُس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اُسے یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ "جو کچھ ہم نے اللہ کے نام پر دیا ہے، اُس سے بہت زیادہ ابھی ہمارے پاس موجود ہے اور ہم کسی کی شرکت کے بغیر تنہا اس کے مالک ہیں۔"

لیکن بیوی کی پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ پادری سائمن کے بہت سے غریب رشتے دار تھے، اور کوئی آدھے درجن موٹے تازے اور بے فکرے یتیم بھی اُس کے زیرِ سایہ پرورش پا رہے تھے اس لئے لوپ سانچیز کے گھر پادری کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور لوپ کی بیوی کبھی سینٹ ڈومنک کے نام پر، کبھی سینٹ انڈریو اور سینٹ جیمز کے نام پر سونے کی تھیلیاں اُس کی نذر کرتی رہی، اور لوپ سانچیز کے غصے نے سچ مچ اُسے دیوانہ بنا دیا اور بالآخر اُس نے یہی مناسب جانا کہ اپنا گھر چھوڑ کر پادری سائمن کی پہنچ سے دور کہیں جا کر پناہ لے، اِس لئے کہ اسے معلوم تھا سینٹوں اور ولیوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔

لوپ نے خاموشی سے اپنا منصوبہ بنایا۔ دن کو اپنے گھر کے لوگوں کو پاس کے ایک گاؤں میں بھیج دیا۔ ایک موٹا تازہ خچر لا کر باندھ لیا اور جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو اپنا بچا ہوا خزانہ خچر پر لاد کر، اندھیرے میں آہستہ آہستہ قلعہ کی چار دیواری سے باہر نکل گیا۔

لوپ نے اپنا منصوبہ بنانے اور اُس پر عمل کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیا تھا اور اُس کی بیوی کے سوا کسی کو اُس کے ارادوں کا علم نہ تھا لیکن روحانی کشف کی بدولت پادری سائمن کو اُن کا علم ہوگیا۔ جو عملہ مند پادری نے محسوس کیا کہ یہ خزانۂ غیبی اب ہمیشہ کے لئے اُس کی رسائی اور گرفت سے باہر ہو رہا ہے چنانچہ اُس نے تہیہ کیا کہ گرجے اور سینٹ فرانسیسکو کی خاطر وہ اس جاتی ہوئی دولت پر ایک وار اور کرے گا۔ اس لئے جب گرجا کے گھنٹے خاموش ہو گئے اور الحمرا پر پوری طرح سکوت چھا گیا تو وہ خاموشی سے اپنی خانقاہ سے نکلا اور باب العدل میں سے گزر کر گلاب اور لارل کی اُن جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا جو شاہراہ کے دونوں طرف لگی

ہوئی ہیں۔ قصر کا گھنٹہ ہر پندرہ منٹ کے بعد، وقت کے آگے بڑھنے کا اعلان کرتا رہا، اُلّو فضا کو اپنی بھیانک آوازوں سے اور مہیب بناتے رہے، اجنبیوں کے کارواں کے کُتّے بھونکتے رہے اور پادری سائمن خاموشی سے گھات میں بیٹھا لوپ کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اُسے خچّر کی ٹاپ کی آواز سنائی دی اور درختوں کی تاریکی میں سے ایک سوار اُدھر آتا دکھائی دیا۔ ہونے والے ڈرامے کے تصوّر سے پادری کو ہنسی آگئی اور وہ پھر خاموشی سے جھاڑیوں میں چھُپ گیا۔

اپنے فرغل کے دامن کو سمیٹ کر پادری سائمن جھاڑیوں میں اس طرح دبک کر بیٹھ رہا جیسے بلّی چوہے کی گھات میں۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا کہ اُس کا شکار عین اُس کے سامنے آگیا۔ وہ تیزی سے جھاڑیوں میں سے نکلا۔ ایک ہاتھ خچّر کی گردن اور دوسرا اُس کی پیٹھ پر رکھ کر ایسی جست لگائی کہ ماہر سے ماہر بازی گر بھی اُسے دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ خچّر کی پیٹھ پر پہنچتے ہی اُس نے مضبوطی سے آسن جما لیا اور قہقہہ لگا کر بولا "اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم دونوں میں زیادہ شاطر کھلاڑی کون ہے" اُس کے یہ الفاظ لوپ کے لئے تھے لیکن ابھی اُس نے مشکل سے اپنا جملہ ختم کیا ہوگا کہ خچّر نے اُچھلنا، کودنا اور دولتّی چلانا شروع کیا اور پھر ہوا کی طرح سرپٹ وہاں سے بھاگا۔ پادری نے اُسے لاکھ روکا لیکن اُس نے تھمنے کا نام نہ لیا۔ جھاڑیوں اور چٹانوں کو کچلتا روندتا وہ یوں ہی سرپٹ بھاگتا رہا۔ پادری کا فرغل جھاڑیوں اور چٹانوں میں اُلجھ اُلجھ کر تار تار ہو گیا اور اُس کے چکنے چپڑے چہرے پر درختوں کی ٹہنیوں سے نہ جانے کتنی ضربیں اور کتنی خراشیں لگیں۔ ان مصیبتوں پر ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ سات خونخوار شکاری کتّے اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔ بیچارے پادری کو اب پتہ چلا کہ وہ لوپ کے خچّر پر نہیں اُس خونخوار طلسمی گھوڑے پر سوار ہے جس کے افسانے اُس نے بارہا سُنے تھے اور جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ صدیوں سے باب العدل کے قریب والی جھاڑیوں میں رہتا اور کبھی کبھی آدھی رات کے بعد سات شکاری کتّوں کے ساتھ غرناطہ کی سڑکوں پر گشت کرتا ہے۔

طلسمی گھوڑا، پہاڑی سے اُتر کر سقاطین اور گدہ دوپش کی دوسری سڑکوں پر یوں ہی سرپٹ دوڑتا رہا اور اُس کے سات خونخوار کتّے رات کے سنّاٹے میں قیامت کا سماں پیدا کرتے رہے۔ غریب پادری کو جتنے بزرگوں، ولیوں اور سینٹوں کے نام یاد آئے اُن سب سے مدد مانگی، گھوڑے کو مریم اور مسیح کا واسطہ دیا لیکن

گھوڑے نے تھمنے کا نام نہ لیا۔ ہر بار نام اور ہر بار واسطہ گھوڑے پہ مہمیز اور تازیانے کا اثر کرتا اور گھوڑا اکسی گز اوپر اُچھل جاتا۔ گھوڑا ساری رات بے تحاشا اِدھر سے اُدھر دوڑتا پھرا اور بے چارے پادری کی ہڈیاں دُکھنے لگیں اور جسم سے خون کے فوارے بہنے لگے۔ آخر مرغ کی بانگ نے اُس کی مشکل آسان کی۔ گھوڑا اپنا قیامت خیز گشت پورا کر کے الحمرا کی طرف لوٹنے لگا۔ ایک بار پھر غرناطہ کی سڑکیں اُس کی ٹاپوں کے شور سے گونج اُٹھیں اور گھوڑا اور اُس کے ہمرکاب خونیں کُتے الحمرا کی حدوں میں داخل ہوئے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ یہ قافلہ بُرج کے قریب پہنچا۔ یہاں پہنچ کر طلسمی گھوڑے نے پھر دولتی جھاڑی اور پادری سائمن کئی قلابازیاں کھاتا ہوا پھاٹک کے قریب گرا۔ جاتے ہوئے شکاری کُتے چلتے چلتے ایک بار پھر بھونکے اور دوسرے لمحے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

شاید ہی کسی پاکباز پادری کو زندگی کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہو جیسا بے چارے سائمن کو! صبح سویرے ایک کسان نے کھیت کی طرف جاتے ہوئے بدنصیب سائمن کو برج کے نیچے پڑا پایا۔ زخموں سے چور اور خون میں تر بتر وہ انجیر کے ایک درخت کے نیچے پڑا تھا۔ نہ وہ ہل سکتا تھا اور نہ اُس کے منہ سے بول نکلتے تھے۔ لوگوں نے اُسے احتیاط سے اُس کی خانقاہ تک پہنچا دیا اور ہر طرف یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ڈاکوؤں نے پادری سائمن کو لوٹا اور زخمی کیا ہے۔

بے چارہ سائمن کئی دن بعد ہلنے جلنے کے قابل ہوا۔ جب اُس کے ہوش و حواس بجا ہوئے تو اُس نے نفع نقصان کے سب پہلوؤں پر غور کیا۔ اُسے بے شک اس بات کا شدید غم تھا کہ اشرفیوں اور جواہرات سے لدا ہوا خچر اُس کے ہاتھ نہیں آیا، لیکن اس آخری وار سے پہلے وہ مختلف سینٹوں کے نام پر لوٹ کی جیوں سے جو نذریں لے چکا تھا وہ بھی اُس کی ساری زندگی کے عیش کے لئے کافی تھیں۔ مگر بدنصیب سائمن نے تندرست ہونے کے بعد جب اپنے مالِ غنیمت کا جائزہ لیا تو اُس کی حسرت و غم کی کوئی حد نہ رہی اس لئے کہ سونے اور زمرد کے حنائی تاج کی جگہ اُسے سوکھی ہوئی شاخیں ملیں اور چمڑے کی تھیلیوں میں اشرفیوں اور موتیوں کی جگہ ریت اور کنکر۔

پادری سائمن نے اپنے اس غم میں کسی کو شریک نہ کیا۔ اُس نے اپنے نفع نقصان کی رُوداد کسی کو

نہیں سنائی ۔ البتہ مرتے وقت اپنے گناہوں کا اقبال کرتے ہوئے اُس نے طلسمی گھوڑے کی سواری کا قصّہ بیان کرنے میں تکلّف نہیں برتا ۔

لوپ سانچیز کے الحمرا سے جانے کے بعد مدّتوں کسی کو اُس کا حال نہیں معلوم ہوا ۔ لوگ اُس کے جانے کے بعد اُس کی خوش مزاجی کی باتیں یاد کرتے رہے اور کبھی کبھی اُن کے دلوں میں یہ خیال بھی آتا رہا کہ شاید مفلسی اور ناداری کی پریشانیوں سے تنگ آ کر اُس نے خودکشی کر لی ۔ اِس بات کو کئی سال گزر گئے ۔ الحمرا کا ایک بوڑھا سپاہی سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ وہ چھ گھوڑوں کی ایک بگھّی سے ٹکرا کر زمین پر گرا اور مرتے مرتے بچا ۔ بگھّی رُکی اور ایک بوڑھے خوش پوش آدمی نے سپاہی پر جھک کر اُس سے پوچھا "تمھارے زیادہ چوٹ تو نہیں لگی ؟" بوڑھے سپاہی کو یہ آواز مانوس معلوم ہوئی ۔ اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو لوپ سانچیز اُس سے مخاطب تھا جو بہت جلد اپنی بیٹی سنچکا کی شادی ایک بہت بڑے رئیس سے کرنے والا تھا ۔

گاڑی میں سنچکا بھی تھی ۔ وہ ایک فربہ دوشیزہ تھی اور سر سے پیر تک قیمتی جواہرات سے لدی ہوئی تھی ۔ اُس کے گلے میں اور دونوں ہاتھوں کی دسوں اُنگلیوں میں سچّے موتی ، ہیرے کے ہار اور بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں ۔ جوانی حسن اور نزاکت میں وہ اچھی خاصی شہزادی معلوم ہوتی تھی ۔

دولت نے لوپ کے دل کو ذرا بھی نہیں بدلا تھا ۔ وہ بڈھے سپاہی کو اپنے گھر لے گیا ۔ اُسے کئی دن اپنا مہمان رکھا اور بادشاہوں کی طرح اُس کی ضیافت کی ۔ اُسے سیریں کرائیں ، تماشے دکھائے اور بالآخر جواہرات کی ایک بھاری تھیلی دے کر رخصت کیا ۔ دوسری تھیلی میں بہت سے قیمتی جواہرات بھر کر اپنے الحمرا کے دوستوں اور ساتھیوں کو بھیجے ۔

لوپ اپنی دولت کے متعلق لوگوں کو ہمیشہ یہ بتاتا تھا کہ اُس کا ایک بھائی امریکہ میں تھا ۔ اُس نے مرتے وقت اپنی بے شمار دولت اُس کے لئے ترکہ میں چھوڑی ہے ، لیکن الحمرا کے رہنے والے جانتے ہیں کہ اُس کی اس خوش حالی کا سرچشمہ الحمرا کا کوئی دفینہ ہے ۔

پریوں کے دونوں مرمریں مجسمے اب بھی اُسی جگہ رکھے ہیں جہاں پہلے رکھے تھے ۔ اب بھی اُن کی

آنکھیں اُسی طرف نگراں ہیں جدھر یہ صدیوں تک خاموشی سے نگراں رہی ہیں اور اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب بھی وہاں کوئی قیمتی دفینہ موجود ہے اور ایک دن کسی سیّاح کے ہاتھ آئے گا۔ لیکن کچھ لوگ، جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے اِن مجسّموں کو اس بات کی شہادت اور علامت سمجھتے ہیں کہ عورتیں بھی رازوں کی نگہبانی اور حفاظت کر سکتی ہیں۔

# معمار کی دلچسپ مہم

عرصہ ہوا غرناطہ میں ایک غریب معمار رہتا تھا۔ معمار بڑا نیک اور خوش عقیدہ تھا اور سب ولیوں اور سینٹوں کے تیوہار بڑی عقیدت سے مناتا تھا۔ لیکن اس نیکی اور عقیدت کے باوجود اس کی غریبی روز بروز بڑھتی رہی، یہاں تک کہ اُسے اور اُس کے بال بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسّر آتی تھی۔ ایک دن یہ معمار غافل پڑا سو رہا تھا کہ کسی نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔ معمار نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا، زرد رُو اور دراز قد پادری باہر کھڑا ہے۔

پادری نے معمار کو دیکھتے ہی اُسے مخاطب کیا "میرے نیک دوست! مجھے معلوم ہے کہ تم ایک اچھے مسیحی ہو اور تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ کیا تم اِسی وقت میرا ایک کام کر سکتے ہو؟"

معمار نے جواب دیا کہ "جناب! بڑی خوشی سے۔ بشرطیکہ مجھے میرے کام کا مناسب معاوضہ ملے۔"

پادری بولا "معاوضہ اتنا ملے گا کہ خوش ہو جاؤ گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں آنکھوں پر پٹّی بندھوانی پڑے گی۔"

معمار نے اس شرط پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پادری نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور بہت سی ناہموار گلیوں اور پیچ در پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے دونوں ایک گھر کے دروازے پر آ کر رُکے۔ پادری نے جیب سے کنجی نکالی، اُسے ایک زنگ آلود تالے میں گھمایا اور ایک بہت بڑا پھاٹک کھولا۔ دونوں گھر کے اندر داخل ہوئے۔ پادری نے دروازہ بند کیا، کنڈی لگائی اور معمار کو ایک لمبے دالان اور وسیع کمرے میں سے گزار کر مکان کے اندرونی حصّے میں لے گیا۔ یہاں لا کر اُس کی آنکھوں کی پٹّی کھول دی۔ معمار نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع صحن میں کھڑا ہے جسے ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ہلکی روشنی منوّر کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ صحن کے بیچ میں شاہی زمانے کا ایک فوارہ نصب ہے جس کی نہ سوکھی پڑی ہے۔ پادری نے معمار سے اس جگہ ایک چھوٹا سا تہ خانہ بنانے کو کہا۔ اینٹیں اور مسالہ پہلے سے موجود تھا اس لئے معمار نے فوراً کام شروع کر دیا۔ وہ رات بھر کام کرتا رہا لیکن تہ خانہ مکمّل نہ ہوا۔ صبح ہونے سے ذرا پہلے پادری نے ایک اشرفی معمار کے ہاتھ پر رکھی، اُس کی آنکھوں پر پٹّی باندھی اور اُسے اُس کے گھر پہنچا دیا۔

چلتے وقت پادری نے پوچھا "کیا تم کام کا باقی حصّہ پورا کرنے کے لئے تیار ہو؟"

"کیوں نہیں جناب! بشرطیکہ مجھے ایسا ہی اچھا معاوضہ ملے۔"

"اچھا تو کل آدھی رات کے قریب میں تمھیں لینے آؤں گا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور پادری کا تہ خانہ بن کر تیار ہو گیا۔

تہ خانہ بن گیا تو پادری نے معمار سے کہا "مجھے اس تہ خانے میں کچھ جسم دفن کرنے ہیں۔ آؤ اب ذرا اس کام میں میری مدد کرو۔"

پادری کے یہ لفظ سن کر معمار کانپ اُٹھا۔ کانپتے ہوئے قدموں سے وہ پادری کے پیچھے ہو لیا۔ اس تصوّر سے اُس کا خون خشک ہوا جا رہا تھا کہ ابھی اُسے بھیانک موت کا نظارہ کرنا پڑے گا۔ لیکن جب وہ پادری کے ساتھ مکان کے ایک تاریک کمرے میں پہنچا تو اُسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ مُردہ انسانی جسموں کے بجائے کمرے کے ایک کونے میں تین چار بڑے بڑے مٹکے رکھے ہیں۔ مٹکوں کے وزن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سونے اور جواہرات سے پُر ہیں۔ پادری اور معمار نے مل کر بہ مشکل اُن مٹکوں کو اُن کے مدفن تک پہنچایا۔ تہ خانے کا منہ بند کر کے

اُس پر پھر فرش بنا دیا گیا اور فوارے کی تہ پھر پہلے کی طرح ہموار ہو گئی - پادری نے معمار کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُسے گلیوں اور سڑکوں کی بھول بھلیاں میں گھما پھرا کر ایک جگہ لا کر کھڑا کر دیا۔ معمار کے ہاتھ میں دو اشرفیاں دے کر پادری نے معمار سے کہا "جب تک تمہیں گرجا کی گھنٹیاں نہ سُنائی دیں یہیں ٹھہرو۔ اگر گھنٹیاں بجنے سے پہلے تم نے آنکھیں کھولیں تو اللہ تم سے سمجھے" یہ کہہ کر پادری رخصت ہُوا اور نیک دل معمار وعدے کے مطابق گھنٹیوں کے بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ سونے کے دو سکّوں کی جھنکار اور اُن کا خوشگوار وزن اُسے خوش رکھنے کے لیے کافی تھا۔

تھوڑی دیر میں گرجا کی گھنٹیاں بجیں تو معمار نے آنکھوں کی پٹی کھولی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ شہر کے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ وہاں سے وہ بآسانی اپنے گھر پہنچ گیا۔ دو رات کی محنت میں اُسے جو اُجرت ملی تھی اُس سے پورے گھرانے نے دو ہفتے آسائش سے بسر کیے۔ اس کے بعد نیک معمار ویسا ہی غریب ہو گیا جیسا کہ پہلے تھا۔ معمار تھوڑی بہت دیر کام کرتا اور زیادہ وقت عبادت میں گزارتا۔ ولیوں اور سینٹوں کے تیوہار منانے اور اپنے حال میں مگن رہنے کا یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ ایک دن بڈھا معمار اپنی خستہ حال جھونپڑی کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک دولت مند مرد خسیس، جو وسیع جائیداد اور بڑی زمینداری کا مالک تھا، اُس کے پاس آ کر رکا۔ کچھ دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر اُس سے کہنے لگا:۔

"عزیز دوست! مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تم بہت غریب ہو"

معمار نے خاموشی سے جواب دیا "جناب! میری غریبی تو میرے حال سے ظاہر ہے"

"پھر تو تمہیں کوئی کام ملے تو خوشی سے کرو گے، اور یقیناً مزدوری بھی زیادہ نہیں لو گے"!

"جناب! غرناطہ میں مجھ سے سستا کام کرنے والا مشکل سے ملے گا"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میرے ایک مکان کی حالت خستہ ہو گئی ہے۔ مجھے اس کی مرمّت پر جو رقم صرف کرنی پڑتی ہے وہ کسی طرح وصول نہیں ہوتی، اس لیے کہ اُس میں کوئی رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ بس تھوڑی سی رقم خرچ کر کے اس کی اتنی مرمّت کرا دوں جتنی اُسے کھڑا رکھنے کے لیے ضروری ہے"

کنجوس رئیس نے معمار کو ایک ویران اور بوسیدہ لیکن خاصی بڑی حویلی کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ بہت سے

خالی کمروں اور دالانوں میں ہوتے ہوئے دونوں مکان کے صحن میں پہنچے۔ معمار اس صحن میں بنے ہوئے ایک فوارے کو دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ صحن اور فوارہ میں نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔ اُس نے رئیس سے پوچھا "کیوں جناب! اس حویلی میں پہلے کون رہتا تھا؟"

رئیس نے غصے سے جواب دیا "اُس پر اللہ کی رحمت! یہاں ایک کنجوس پادری رہا کرتا تھا، جسے بس اپنی ذات عزیز تھی، اور کچھ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بے حد دولتمند تھا۔ چونکہ وہ لاوارث تھا اس لئے خیال تھا کہ وہ اپنی ساری دولت گرجے کے لئے وقف کر جائیگا۔ لیکن وہ اچانک مرگیا اور جب پادری اُس کی دولت پر قبضہ کرنے کے خیال سے یہاں آئے تو اُنھیں چند کم قیمت سکوں کے سوا یہاں کچھ بھی نہ ملا۔ وہ تو مایوس ہو کر چلے گئے لیکن میری بدنصیبی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بڈھے پادری کی رُوح اب بھی میرے گھر پر قابض ہے اور تم جانتے ہو کہ مُردوں سے کرایہ وصول کرنا ناممکن ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جس کمرے میں پادری رہتا تھا اُس میں سے اب بھی راتوں کو سکوں کی جھنکار سُنائی دیتی ہے، جیسے کوئی اُنھیں گِن رہا ہو۔ لوگوں نے کبھی کبھی صحن میں رونے اور کراہنے کی آوازیں بھی سُنی ہیں۔ خُدا جانے یہ باتیں صحیح ہیں یا غلط، لیکن انھوں نے میرے گھر کو بدنام کر دیا ہے، اور کرایہ دار اس میں بسنے کے نام پر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔"

معمار جو خاموشی سے رئیس کی باتیں سُن رہا تھا، کڑک کر بولا "جناب! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی حویلی میں رہنے لگوں۔ جب آپ کو کوئی اچھا کرایہ دار مل جائیگا تو میں کہیں اور چلا جاؤنگا۔ میں حویلی کا کرایہ تو نہیں دے سکتا، البتہ جب تک یہاں رہوں گا اس کی مرمت کرتا رہوں گا۔ رہے بھوت پریت تو میں مذہبی آدمی ہوں اور ان سے نہیں ڈرتا۔"

رئیس نے غریب معمار کی پیشکش خوشی سے قبول کر لی۔ معمار کا گھرانا حویلی میں رہنے لگا۔ معمار آہستہ آہستہ حویلی کی مرمت کرتا رہا اور کچھ عرصے میں وہ ویسی ہی شاندار ہو گئی جیسی پہلے تھی۔ مُردہ پادری کے کمرے میں سے راتوں کو سکوں کی جھنکار آنی بند ہو گئی۔ اب یہ آواز لوگوں کو زندہ معمار کی جیبوں میں سُنائی دینے لگی۔ رفتہ رفتہ اُس کی خوشحالی بڑھتی گئی یہاں تک کہ بہت جلد اُس کا شمار غرناطہ کے امیروں میں ہونے لگا۔ وہ اپنی رُوح اور ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لئے گرجے کو بڑی بڑی رقمیں دیتا رہا اور حویلی کے صحن میں بنے ہوئے تہ خانے کا حال کسی کو نہ معلوم ہوا۔ سوائے اُس کے بیٹے اور تنہا وارث کے، جس کے کانوں میں معمار نے مرتے وقت یہ افسوں پھونک دیا تھا۔

---

# زائرِ محبّت

عرصہ ہوا غرناطہ پر ایک مور بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے ایک بیٹا تھا جس کا نام احمد تھا۔ احمد میں بچپن ہی سے ایسی اعلیٰ صفات تھیں کہ درباروں نے اُس کے نام کے آگے ’الکامل‘ کا لقب بڑھا دیا اور سب اُسے احمد کے بجائے احمد الکامل کہنے لگے۔ نجومیوں نے اُس کا زائچہ بنایا تو ایسی بے شمار باتوں کی پیشین گوئی کی جن سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑا بادشاہ ہوگا۔ اُس کی قسمت کے آسمان پر بادل کا صرف ایک ٹکڑا نظر آتا تھا، گو یہ ٹکڑا بھی سیاہ ہونے کے بجائے گلابی تھا۔ نجومیوں کی پیشین گوئی تھی کہ شہزادہ عاشق مزاج ہوگا اور اپنی عاشق مزاجی کی بدولت اُسے سخت خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن شباب کا سایہ پڑنے تک اگر اُسے محبّت کی کشش سے دُور رکھا جائے تو وہ اِن خطروں سے محفوظ رہے گا اور اس کے بعد سے اُس کی زندگی سکون و راحت کی مسلسل اور مربوط داستان ہوگی۔

شہزادے کو اِن خطروں سے محفوظ رکھنے کے لئے دانا بادشاہ نے اُسے ایسی فضا میں پرورش کرنے کا تہیّہ کیا جہاں اُس کی آنکھیں کسی حسینہ کا مُنہ نہ دیکھیں اور اُس کے کان محبّت کے نام سے آشنا نہ ہوں۔ اس

مقصد کے لئے اُس نے الحمرا کے اُوپر ایک پہاڑی پر ایک حسین محل تعمیر کروایا اور اُسے حسین و دلکش گلشنوں سے آراستہ کیا۔ یہی محل ہے جسے آج تک لوگ جنّتہ العریف "کے رومانی نام سے یاد کرتے ہیں۔ شہزادے کو اس جنّتِ ارضی میں مقیّد کر کے اُسے عرب کے معروف فاضل، عاقل اور حکیم ابنِ حبّان کی اتالیقی اور تربیت میں دے دیا گیا۔ ابنِ حبّان کی عمر کا زیادہ حصّہ مصر میں بسر ہوا تھا، جہاں مقبروں اور اہرام میں قدیم زبانوں کا مطالعہ اُس کا سب سے محبوب مشغلہ رہا تھا اور اس لئے مصری ممی کے مردہ حسن میں اُس کے لئے جیتے جاگتے حسن اور چلتے پھرتے شباب سے زیادہ کشش تھی۔ بادشاہ نے ابنِ حبّان کو تاکید کر دی تھی کہ وہ شہزادے کو سب علوم کی تعلیم دے ـــــ سوائے اس کے کہ وہ محبّت کے نام اور مفہوم سے قطعی ناآشنا رہے۔ بادشاہ نے شہزادے کی اتالیقی فاضل حکیم کے سپرد کر کے اُس سے کہا " ابنِ حبّان! تم اس مقصد کے لئے جو تدبیر چاہو اختیار کرو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر شہزادے نے تمہارے زیرِ سایہ اِس مردود علم کا ایک حرف بھی سیکھ لیا تو تمہیں اس کی قیمت اپنے سر سے ادا کرنی ہوگی۔"

حبّان کے خشک چہرے پر ایک مرجھائی ہوئی مسکراہٹ بکھر گئی اور اُس نے بادشاہ کو جواب دیا، "جہاں پناہ! اپنے دل کو شہزادے کی طرف سے اسی طرح مطمئن رکھیں جیسے میں اپنے سر کی طرف سے مطمئن ہوں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ ابنِ حبّان شہزادے کو محبت جیسے ناکارہ جِس کی تعلیم دے گا؟"

دانا حکیم کی محتاط نظروں کے سائے میں شہزادہ احمد الکامل "جنّت العریف" کے دیوانوں اور اُس کے گلشنوں میں پرورش پاتا رہا۔ حبشی غلام اُس کے خادم تھے، جن کے تاریک دل محبّت کے راز سے قطعی ناآشنا تھے۔ اور اگر آشنا تھے تو اُن کی زبانیں اس کی حقیقت کے اظہار سے عاجز تھیں۔ ابن حبّان کی پوری توجہ شہزادے کے ذہن کی تربیت کی طرف تھی اور اس لئے اُس نے اُسے پہلے مصر کے قدیم، پیچیدہ اور سنجیدہ علوم کی تعلیم دی۔ لیکن شہزادے کے ذہن نے اس سنجیدگی اور خشکی کو بالکل قبول نہ کیا اور ابن حبّان کو اندازہ ہو گیا کہ شہزادے کو فلسفے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔

شہزادے میں ایک عجیب و غریب خوبی یہ تھی کہ اُس کا اُستاد اور رہنما اُسے جس راستے پر چلاتا وہ اُسی پر چلنے کو تیار ہو جاتا۔ وہ پیہم آتی ہوئی جمائیوں کو روکتا اور خاموشی اور تحمّل سے ابن حبّان کے

طویل عالمانہ خطبے سنتا رہتا اور اس طرح اُسے ہر طرح کے علم کی شُدبُد ہوگئی، یہاں تک کہ وہ بیس سال کا ہوگیا۔ گو اُس کا ذہن گوناگوں علوم کا بیش بہا اور قابلِ رشک خزینہ تھا، لیکن اس خزانے میں محبّت کی روشنی نام کو نہ تھی۔

لیکن اسی عمر میں شہزادے میں ایک تبدیلی رُونما ہوئی۔ اُس نے مطالعہ اور مناظرہ ترک کر کے باغوں کی روشوں پر ٹہلنا اور محویت کے عالم میں فوّاروں کے قریب بیٹھنا شروع کر دیا۔ تکمیل علوم کے سلسلے میں اُسے موسیقی کی بھی تھوڑی سی تعلیم دی گئی تھی۔ شہزادہ دوسرے علوم کو چھوڑ کر اب صرف اس کی طرف مائل ہوگیا اور شعر و شاعری کا جو رجحان اب تک سویا ہوا تھا وہ جیسے خود بخود بیدار ہوا۔ شہزادے کی اس تبدیلی میں ابنِ حبّان کو ایک خطرے کے آثار نظر آئے اور اس لئے اِن ناکارہ مشاغل کی طرف سے اُس کی توجہ ہٹانے کے لئے اُسے جبر و مقابلہ کے سبق دینے لگا۔ لیکن شہزادے کا جی اس میں ذرا بھی نہ لگا۔ اُس نے تنگ آکر اپنے اُستاد سے کہہ دیا "جبر و مقابلہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ اس کے خیال سے میرا جی متلاتا ہے مجھے کوئی ایسا علم چاہیئے جس کی آواز دل کے تاروں کو چھیڑے۔"

ابنِ حبّان نے یہ باغیانہ لفظ سُنے تو اُس نے سنجیدگی سے اپنی گردن ہلا کر کہا "یہ فلسفے کی موت کا اعلان ہے۔ شہزادے کو پتہ چل گیا ہے کہ اُس کے پاس دل ہے۔" اب وہ ہر لمحہ اپنے شاگرد کو فکرمندی کی نظر سے دیکھنے لگا۔ وہ ہر لمحے یہ محسوس کر رہا تھا کہ شہزادے کی فطری نزاکت اور لطافت بیدار ہو چکی ہے اب اُسے صرف کسی 'شے' کی تلاش ہے۔

شہزادہ جنّت العریف کے گلشنوں میں ایک خاص طرح کے نشے میں سرشار گھومتا پھرتا اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ نشہ کیوں ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے تصوّر میں غرق ہو کر بیٹھ جاتا جس میں اُس کے لئے ایک انوکھی لذّت تھی۔ کبھی وہ اپنی بانسری اپنے ہونٹوں سے لگاتا اور درد بھرے نغمے فضا میں بکھر جاتے۔ پھر نہ جانے کیوں وہ بانسری کو پھینک دیتا اور خود بخود سرد آہیں بھرنے لگتا۔

آہستہ آہستہ محبّت کی یہ آنچ اُس کے سینے سے نکل کر گرد و پیش کی چیزوں تک پہنچنے لگی۔ اُسے بعض خاص خاص پھولوں میں زیادہ کشش محسوس ہونے لگی اور وہ انھیں محبّت بھری نظروں سے دیکھنے لگا

اُسے کچھ درخت دوسرے درختوں سے زیادہ اچھے لگنے لگے اور پھر اُس کی توجہ نے صرف ایک درخت کو اپنا مرکز بنا لیا۔ درخت کے پتّوں کے خنک سائے میں اُسے سکون ملنے لگا۔ اُسے اِس کے قدِ رعنا سے عشق ہو گیا۔ وہ اُس کی نازک چھال پر اپنا نام کھودتا، گجرے گوندھ کر اُس کی ٹہنیوں میں لٹکاتا اور بانسری کی سُریلی لے پر اُس کی تعریف کے نغمے گاتا۔

شاگرد کی اس ہیجانی کیفیت نے ابن حبّان کو خوف زدہ کر دیا۔ اُسے معلوم تھا کہ جو علم اب تک اُسے نہیں سکھایا گیا، اُس کے دل نے خود بخود اُسے اُس کے آستاں تک پہنچا دیا ہے۔ ایک ہلکا سا اشارہ بھی اُسے اِس سربستہ راز سے آشنا کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ شہزادے کے سامنے آنے والے خطروں اور اپنے سر کے قلم ہونے کے تصوّر سے کانپ اُٹھا اور فوراً شہزادے کو باغ کی رعنائیوں سے جُدا کر کے جنّت العریف کے سب سے اُونچے بُرج میں مقید کر دیا۔ بُرج میں ہر ممکن آسائش کے سامان موجود تھے۔ اُس کے ایوان حسین اور دلکش تھے، اور وہ اُس کے دریچوں سے اُن دُور اُفتادہ مناظر کا مشاہدہ کر سکتا تھا جہاں تک نظر کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ بُرج کی بلندیوں میں صرف ایک کمی تھی۔ وہاں رہ کر احمد کُنجوں اور روشوں کی اُس شیریں اور دلکش رنگینی سے محروم ہو گیا تھا جنھوں نے اُس کے دل کی دُنیا میں طوفان برپا کیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ احمد ضبط کے جس سخت امتحان سے دوچار تھا، اُس کے اور آنے والی نازک گھڑیوں کے درمیان کیا سمجھوتہ کیا جائے؟ ابن حبّان نے اُسے محبّت کے زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرح کے علم کی لذت سے آشنا کر دیا تھا اور علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں شہزادے کو کسی طرح کی کشش محسوس ہوتی۔ اس موقعے پر ابن حبّان کو ایک بات یاد آئی۔ اپنے مصر کے قیام میں اُس نے ایک یہودی سے چڑیوں کی زبان سیکھی تھی۔ اِس یہودی تک یہ علم حضرت سلیمانؑ سے منتقل ہو کر آیا تھا اور حضرت سلیمانؑ نے اِسے ملکہ سبا سے حاصل کیا تھا۔ ابنِ حبّان نے جب احمد سے اس نئے علم کا ذکر کیا تو اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور اُس نے اس انہماک سے اس نئے علم کی طرف توجہ کی کہ بہت جلد اس میں اپنے اُستاد کی سی مہارت پیدا کر لی۔

جنّت العریف کا برج اب اُس کے لئے تنہائی کی قید نہیں رہا تھا۔ برج کے آس پاس اب اُس کے بے شمار شناسا تھے جن سے باتیں کر کے وہ اپنا جی بہلا سکتا تھا۔ اُس کا پہلا شناسا ایک باز تھا جس نے قصر کی فصیل پر ایک بہت اونچی جگہ اپنا آشیانہ بنا رکھا تھا۔ شہزادے کو اُس کی ملاقات میں ذرا بھی لطف نہ آیا۔ اُس کی باتوں میں قزاقی کی بُو آتی تھی۔ وہ لوٹ مار اور دوڑ جھپٹ کے علاوہ کوئی بات نہ جانتا تھا۔ اُس کی شیخی خوری سے شہزادے کو نفرت سی ہو گئی۔

اُس کی دوسری ملاقات ایک اُلّو سے ہوئی، جس کے بڑے سر اور گول گول آنکھوں سے دانشمندی ہویدا تھی۔ وہ دن بھر دیوار کے ایک روزن میں بیٹھا کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور آنکھیں جھپکاتا رہتا اور رات کے وقت سیر و گشت کے لئے گھر سے نکلتا۔ اُسے اپنی دانائی کے متعلق خاصی غلط فہمی تھی۔ وہ نجوم کے علم اور چاند کی باتیں کرتا اور اشاروں اشاروں میں طلسم و سحر کا ذکر چھیڑتا۔ وہ عموماً ما بعد الطبعیاتی مسائل میں غرق نظر آتا اور احمد کو اُس کے خیالات اور تصوّرات ابن حبّان کی فلسفیانہ تقریروں سے زیادہ خشک اور بے مزہ معلوم ہوتے۔

اُس کا اگلا شناسا ایک چمگادڑ تھا جو سارے دن گنبد کے ایک تاریک گوشے میں اُلٹا لٹکا رہتا اور شام ہوتے ہی چپکے سے باہر نکل جاتا۔ ہر موضوع پر اُس کے خیالات شفق کی روشنی کی طرح سرسری اور عارضی تھے۔ چیزوں سے مکمّل واقفیت حاصل کئے بغیر اُن کا مذاق اُڑانا اُس کا شیوہ تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُسے زندگی کی کسی چیز یا کسی بات میں لطف نہیں آتا۔

ان کے علاوہ ایک ابابیل تھی، جس نے شروع شروع شہزادے کو اپنی طرف بے حد متوجہ کیا۔ اُس کا اندازِ گفتگو بڑا دلکش تھا، لیکن ایک طرح کی بے چینی، بے قراری اُس کی سرشت تھی۔ وہ برابر ہوا میں اُڑتی رہتی اور کسی موضوع پر تھوڑی دیر بھی جم کر باتیں نہ کرتی۔ رفتہ رفتہ شہزادے کو اندازہ ہو گیا کہ وہ محض باتونی ہے۔ چیزوں کی اوپری سطح پر نظر رکھنا اور کسی چیز کا علم نہ رکھنے پر بھی عالم ہونے کا دعوےٰ کرنا اُس کی عادت ہے۔

اِن چار پرندوں سے باتیں کر کے شہزادے کو اپنے سیکھے ہوئے علم کو آزمانے کا موقع ملا۔ دوسری چڑیاں

گنبد کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ شہزادہ بہت جلد ان نئے ساتھیوں سے اُکتا گیا۔ اُن کی باتیں نہ ذہن میں گھر کر سکتی تھیں نہ دل میں۔ اور اس لئے بہت جلد اُس نے پھر اپنی تنہائی میں پناہ لی۔ سردیاں گزر گئیں اور بہار تازگی اور شگفتگی اور فرحت و انبساط کا پیغام لے کر آئی۔ چڑیوں کے چہچہانے اور گھونسلے بنانے کے دن آ گئے اور جنّت العریف کے گلشنوں اور کنجوں سے جیسے نغموں کا ایک سیلاب اُبل پڑا اور اس کی لہریں بُرج کی بلندیوں میں شہزادے تک پہنچنے لگیں۔ ہر نغمے کا موضوع ایک تھا۔ ہر زبان محبّت کا پیام سُنا رہی تھی اور ہر طرف سے اس پیام کے دل کُشا جواب دیئے جا رہے تھے —— ہر لَے میں، ہر تان میں بس محبت کی صدا گونج رہی تھی۔ شہزادہ سکوت اور اُلجھن میں اس شیریں پیغام میں ڈوبے ہوئے نغمے سُنتا اور دل میں سوچتا "محبت! محبّت! یہ آخر کیا چیز ہے، جس سے ساری دُنیا معمور نظر آتی ہے اور میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا؟" اُس نے اپنے دوست باز کے سامنے اپنی مشکل پیش کی تو اس بد دماغ نے حقارت سے جواب دیا "اپنی مشکل زمین کی حقیر اور امن پسند چڑیوں سے بیان کرو، جنھیں قدرت نے ہمارے لئے کہ ہم فضا کے بادشاہ اور شہنشاہ ہیں، شکار بنایا ہے۔ ہمارا مشغلہ جنگ ہے۔ ہمیں صرف جنگ سے دلچسپی ہے۔ ہم سپاہی ہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ محبّت کیا بلا ہے۔"

شہزادہ اُس کی باتوں سے متنفّر ہُوا اور اُلّو کے مراقبے میں مخل ہُوا کہ یہ امن پسند طائر شاید میری اُلجھن دُور کر سکے۔ اُس نے اُلّو سے پوچھا "دانا دوست! کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ محبّت کیا چیز ہے، جس کے گیت آج کل ہر کنج میں گائے جا رہے ہیں؟" اُلّو نے کسی قدر خفگی سے شہزادے کی طرف دیکھا کہ جیسے اُس کے وقار کو اِس سوال سے صدمہ پہنچا ہو اور بولا "میری راتیں مطالعے اور تحقیق میں بسر ہوتی ہیں اور دن کا وقت میں اپنے حجرے میں سیکھی ہوئی باتوں پر غور و فکر کرنے میں گزارتا ہوں۔ رہیں یہ چڑیاں کہ جن کے گیتوں کا تم ذکر کرتے ہو، تو میں کبھی اِن کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ مجھے اُن سے اور اُن کی باتوں سے نفرت ہے۔ خُدا کا شکر ہے کہ مجھے گانا نہیں آتا۔ میں فلسفی ہوں اور جس چیز کو تم محبّت کہتے ہو، اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔"

شہزادے نے اب بُرج کے اُس گوشے کا رُخ کیا جہاں اُس کا دوست چمگادڑ اُلٹا لٹکا ہُوا تھا اور اُس کے سامنے بھی اپنا سوال دُہرایا۔ چمگادڑ نے اپنی ناک سکیڑ لی اور جھلّا کر جواب دیا "ایسے حماقت آمیز سوال

کر کے تم میرے آرام میں کیوں خلل ڈالتے ہو؟ میں صرف رات کو گھر سے باہر نکلتا ہوں جب سب چڑیاں سو چکی ہوتی ہیں۔ مجھے اُن کے کاروبار سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ میں نہ چڑیا ہوں نہ چوپایہ، اور خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب شر پسند ہیں اور میں اِن میں سے ایک ایک سے نفرت کرتا ہوں۔ مختصر یہ کہ میں آدم بیزار ہوں اور مجھے بالکل نہیں معلوم کہ محبّت کسے کہتے ہیں۔"

لاچار ہو کر شہزادے نے ابابیل کی جستجو شروع کی اور وہ جلدی ہی اُسے بُرج کی چوٹی میں چکّر لگاتی ہوئی مل گئی۔ حسبِ معمول، اس وقت بھی ابابیل سخت جلدی میں تھی اور اُسے شہزادے کی بات کا جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اُس نے تیزی سے شہزادے کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "خدا کے لئے! میرے مشاغل اتنے زیادہ ہیں اور میرے سر پر اتنی ذمّہ داریاں ہیں کہ مجھے کبھی اِس موضوع پر سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے ہر روز ہزار جگہ جانا ہوتا ہے، ہزار طرح کے اہم معاملات پر توجہ دینی ہوتی ہے۔ بھلا مجھے اتنی فرصت کہاں کہ ایسے ہلکے پھلکے موضوعات پر غور کر سکوں۔ مختصر یہ کہ میں دُنیا کا شہری ہوں۔ میرے دل میں سارے جہان کا درد ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ جسے تم محبّت کہتے ہو، وہ کیا چیز ہے۔" یہ تقریر کی اور وادی میں غوطہ لگا کر ابابیل بات کی بات آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

شہزادے کی مایوسی اور اُلجھن اور بڑھ گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے دل کا درد کس سے کہے۔ ابھی وہ اسی خیال میں مستغرق تھا کہ اُس کا دانا اتالیق بُرج میں داخل ہوا۔ شہزادہ اُسے دیکھتے ہی اُس کی طرف دوڑا۔ "میرے اچھے ابن حبّان! تم نے دُنیاوی علم کے سب دروازے مجھ پر کھول دیے ہیں لیکن ایک دروازہ اب تک بند ہے۔ میرا دل علم کے اس ایوان میں داخل ہونے کے لئے بیتاب ہے۔"

ابن حبّان نے عاجزی سے جواب دیا "اچھے شہزادے! آپ کے دل میں جو سوال پیدا ہوا ہے پوچھئے، آپ کے خادم کا علم محدود ہے، لیکن وہ اپنی بساط بھر آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کریگا۔"

"تو پھر اے داناؤں کے دانا! براہِ کرم بتائیے کہ جسے دُنیا محبّت کہتی ہے اُس کی حقیقت کیا ہے؟"

ابن حبّان پر جیسے بجلی گر پڑی۔ وہ کانپ گیا اور اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اُس کے جسم کی جان نکال لی ہے۔ اُس نے شہزادے کو مخاطب کر کے پوچھا "شہزادے کے دل میں

یہ سوال کیسے پیدا ہوا؟ آپ نے یہ ناکارہ لفظ کس سے سُنا؟"

شہزادہ ابن حبّان کو دریچے کے قریب لے گیا اور اُس سے کہا "یہاں کھڑے ہو کر سنو!" ابن حبّان خاموشی سے سُنتا رہا۔ بُرج کے نیچے بلبل گلاب کی ایک جھاڑی پر بیٹھی ایک سُرخ گلاب کے سامنے محبّت کا نغمہ گا رہی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں اور سر سبز کنجوں میں بس ایک لفظ گونج رہا تھا۔ محبّت، محبّت، محبّت۔ فضا صرف اِسی لفظ کی شیرینی سے معمور تھی۔

دانا ابن حبّان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اللہ اکبر! بھلا کس کی مجال ہے کہ انسان سے اس راز کو پوشیدہ رکھ سکے جب کہ ہر طائر افشائے راز پر آمادہ ہے"۔ اس کے بعد پُر زور لہجے میں اٹک سے بولا "ان گمراہ کن نغموں کی طرف دھیان نہ دو۔ اِس خطرناک علم پر اپنے ذہن کے دروازے بند کر لو۔ یاد رکھو کہ انسانی دُنیا کے آدھے غموں کا سبب یہی بدنصیب محبّت ہے۔ یہی ہے جو بھائیوں اور دوستوں کے دلوں میں تفرقہ ڈالتی ہے۔ قتل و غارت اور جنگ و جدال کی پرورش اسی کی آغوش میں ہوتی ہے۔ فکر و غم کی تاریکیاں، دنوں کی پریشانیاں اور راتوں کی بے خوابیاں اس کی کنیزیں ہیں۔ محبّت کی آگ، شباب کی شگفتگی اور مسرّت کو جھلس دیتی ہے اور جوانی کے سر پر بڑھاپے کے دُکھوں کا سایہ منڈلانے لگتا ہے۔ اس لئے اے میرے معصوم شہزادے! اللہ تجھے اُس علم سے بیگانہ رکھے، جس کا نام محبّت ہے"۔

بات ختم کرتے ہی ابن حبّان تیزی سے باہر نکل گیا اور شہزادے کی اُلجھن پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ وہ لاکھ کوشش کرتا کہ اس خیال کو دل سے نکال دے لیکن وہ اُس کی پوری ہستی پر چھا گیا تھا۔ سوچتے سوچتے اُس کا جسم تھکن سے چُور ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا "کوئی چڑیوں کے ان شیریں نغموں کو سُنے۔ ان میں غم کہیں نام کو نہیں۔ ہر لے نرم ہے، نازک ہے اور مسرّت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اگر محبّت سچ مچ جنگوں اور پریشانیوں کا سبب ہے تو یہ چڑیاں غمگین کیوں نظر نہیں آتیں، کیوں وہ ایک دوسرے کا خون بہانے کے بجائے خوشی سے یوں پھدک رہی ہیں، اور کیوں وہ صحنِ چمن میں خوشی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہی ہیں؟"

ایک صبح پریشان شہزادہ اپنے پلنگ پر لیٹا اِس گتھی کو سُلجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے

کمرے کی کھڑکی نسیمِ سحری کے جھونکوں کا خیر مقدم کر رہی تھی اور فضا وادی میں جھومتی ہوئی نارنگی کے شگوفوں کی خوشبو سے معطر تھی۔ بُلبل کی دھیمی دھیمی آواز دریچے کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اُس کی زبان پر اب بھی محبت کا نغمہ جاری تھا۔ شہزادہ اِسے سن رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا۔ ایکا ایکی ہوا میں ایک تیز سرسراہٹ گونجی اور ایک ننھی فاختہ، باز کے خونیں چنگل سے بچنے کے لیے کھڑکی کے اندر جھپٹی اور ہانپتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔ ظالم صیاد، اپنے صید سے محروم ہو کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف اُڑ گیا۔

شہزادے نے ہانپتی ہوئی چڑیا کو اُٹھایا۔ نرمی سے اُس کے پَروں پر ہاتھ پھیرا اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر اُسے سینے سے لگائے رکھا اور پھر ایک سونے کے پنجرے میں بند کر دیا۔ پنجرے میں بند کر کے سفید چمکیلے گیہوں اُس کے آگے ڈالے اور کٹوری میں شفاف پانی بھر کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن فاختہ نے نہ گیہوں کھائے نہ پانی پیا۔ وہ غم زدہ صورت بنائے پنجرے میں بیٹھی سسکیاں لیتی رہی۔

"ننھی فاختہ تمھیں کیا تکلیف ہے؟ تمھیں آخر کس چیز کی کمی ہے؟" شہزادے نے پیار سے پوچھا۔

فاختہ بولی کہ "شہزادے! میرا غم یہ ہے کہ بہار کے مسرّت خیز موسم میں، اُس موسم میں جو محبت کرنے کا موسم ہے، قسمت نے مجھے میرے محبوب سے جدا کر دیا ہے۔"

شہزادہ چونک کر بولا "محبّت کا موسم! محبوب! پیاری چڑیا! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ محبت کسے کہتے ہیں؟"

فاختہ لہک کر بولی "یقیناً! اچھے شہزادے! میں تمھیں محبّت کے معنی بتا سکتی ہوں۔ محبت ایک کا غم، دو کی خوشی اور دونوں کی دشمنی اور لڑائی ہے۔ یہ ایک طلسم ہے جو دو مخلوقوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتا ہے، اُن کے دلوں کو ہم نوائی کی شیرینی سے جوڑتا ہے۔ ان دلوں کو قرب سے راحت ملتی ہے اور دوری انھیں غمگین بناتی ہے۔ اچھے شہزادے کیا دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس سے تم نے محبت کا نازک رشتہ جوڑا ہو؟"

"مجھے اپنے اُستاد ابن حبّان سے دنیا میں سب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُس کی صحبت مجھ پر بار گزرتی ہے اور تنہائی زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

میرا مطلب اس لگاؤ سے نہیں۔ میں محبّت کا ذکر کر رہی ہوں —— محبّت جو زندگی کا سب سے بڑا راز اور سب سے قیمتی اصول ہے، جوانی کا خمار انگیز نشاط اور بڑھاپے کی سنجیدہ راحت۔ شہزادے! ذرا کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھو۔ اس طرب انگیز موسم میں فطرت کا ذرّہ ذرّہ محبّت سے سرشار ہے۔ ہر مخلوق کا ایک محبوب ہے۔ ننّھے ننّھے پرند بھی جوش و سرمستی کے اس موسم میں اپنے محبوب کی خدمت میں نغمۂ محبّت پیش کرتے ہیں۔ ننّھا منّا بھونرا بھی محبّت کے نغمے گنگنا رہا ہے، اور دیکھو! وہ سامنے ہوا کے دوش پر پرواز کرتی ہوئی نازک تتلیاں کس طرح محبّت سے مسرور ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔ افسوس! اچھے شہزادے! اپنی عمر کے اتنے قیمتی سال تم نے یوں ہی گنوائے۔ تم اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ محبّت کیا ہے۔ کیا واقعی کسی نازک دوشیزہ نے، کسی حسین شہزادی نے تمہارے طائرِ دل کو اپنی زُلفوں کے جال میں نہیں پھنسایا؟ اور کیا کسی کے تصوّر نے تمہارے سینے میں میٹھے غموں اور نازک تمنّاؤں کا طوفان نہیں اُٹھایا؟

شہزادے نے سرد آہ بھری اور بولا "ننّھی چڑیا! کبھی کبھی یہ طوفان مجھے اپنے سینے میں اُٹھتا محسوس ہوا ہے۔ لیکن میں اس طوفان کا سبب نہیں جانتا۔ آہ! اس تنہائی میں میں اپنے دل کی اُس ملکہ کو کہاں ڈھونڈنے جاؤں جس کا حال تم نے بتایا ہے؟"

شہزادے اور فاختہ میں تھوڑی سی باتیں اور ہوئیں اور شہزادے کا درسِ محبّت مکمّل ہوگیا۔ اُس نے نرمی سے فاختہ کو مخاطب کر کے کہا "ننّھی فاختہ! اگر محبّت ایسی ہی مسرّت اور اُس سے محرومی ایسا ہی غم ہے تو خدا نہ کرے کہ میں محبّت کرنے والوں کے دل توڑ کر گناہ مول لوں۔" اُس نے فاختہ کا پنجرا کھولا، اُسے پیار سے باہر نکالا، اُس کے نرم پروں کو بوسہ دیا اور کھڑکی کے پاس جا کر اُس سے کہا "ننّھی فاختہ! جاؤ بہار اور شباب کے اس وجد آور موسم میں اپنے دل کے ساتھی کے ساتھ خوشیاں مناؤ۔ میں تمھیں اس بے کیف بُرج میں جہاں محبّت کا گزر نہیں، اپنے ساتھ کیوں قید رکھوں؟"

فاختہ نے مسرّت سے پر پھڑپھڑائے۔ ہوا میں ایک قلا بازی کھائی اور تیرتی ہوئی باغ کے شاداب کُنجوں میں گم ہوگئی۔

شہزادے نے اپنی غمگین نظروں سے اُس کا پیچھا کیا اور پھر بحرِ غم میں ڈوب گیا۔ چڑیوں کے جن نغموں سے پہلے اُس کا جی بہلتا تھا وہ اُسے افسردہ بنانے لگے۔ محبت! محبت! آہ! اُسے اب اپنے دُکھ کا پتہ چلا۔"

اُس نے سامنے سے ابن حبان کو آتا دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ بوڑھے فلسفی پر برس پڑا "تم نے مجھے اب تک کیوں جہالت کی تاریکی میں مقیّد رکھا؟ کیوں اب تک زندگی کا سب سے بڑا راز اور سب سے اہم اُصول تم نے مجھ سے چھپایا، جب حشرات الارض تک اُس کے بھید سے واقف ہیں؟ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ فطرت کا ذرّہ ذرّہ مسرّت کی سرمستیوں میں غرق ہے۔ ہر جاندار بہار کے دن اپنے محبوب کی آغوش میں شادمانی سے گزار رہا ہے۔ یہی محبت ہے اور اسی کی تعلیم میں چاہتا تھا کہ تم مجھے دو۔ اس راز سے محروم رکھ کر صرف مجھے تُم نے اس مسرّت سے، اِس شادمانی سے محروم رکھا ہے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ تم نے میری زندگی کے اتنے ماہ و سال زندگی کی خوشیوں کی تعلیم نہ دے کر برباد کئے؟"

ابن حبان سمجھ گیا کہ اب کسی طرح کی پردہ داری فضول ہے۔ شہزادے نے اُس کے سکھائے بغیر زندگی کا سب سے خطرناک علم سیکھ لیا ہے۔ اس لئے اُس نے شہزادے کو بتا دیا کہ نجومیوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے کیوں اُس کی تعلیم میں اتنی احتیاط اور سختی سے کام لیا گیا تھا۔ یہ باتیں بتا کہ اُس نے عاجزی سے شہزادے سے کہا، "اور اب، اے میرے محبوب شہزادے! میری زندگی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ کو اگر اس بات کا پتہ چل گیا کہ محبت کے معنی تم نے میری شاگردی اور اتالیقی کے زمانے میں سیکھے ہیں تو مجھے اپنے سر سے اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

شہزادے کی تعلیم نے اُسے اتنا سمجھ دار بنا دیا تھا کہ وہ اپنے اُستاد کی باتیں غور سے سُن کر اُن سے کوئی معقول نتیجہ نکال سکے۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ اس سارے معاملے میں ابن حبان بے قصور رہے۔ پھر اُسے اپنے شفیق اُستاد سے محبت بھی تھی اور وہ اُس کی جان کو ہرگز خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے تہیّہ کیا کہ محبت کا جو علم اُس نے ابھی محض نظری طور پر سیکھا تھا اُسے اپنے سینے میں دفن رکھے گا۔

لیکن قسمت کو ابھی اور سخت امتحان مقصود تھے۔ اس واقعے کے چند دن بعد شہزادہ ایک صبح کو قلعہ کی فصیل

پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ وہی فاختہ اُڑتی ہوئی آئی اور بے جھجک اُس کے کندھے پر بیٹھ گئی۔ شہزادے نے فاختہ کو پکڑ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑے پیار سے اُس سے کہنے لگا:۔

"ننھی فاختہ! تم کتنی خوش نصیب ہو کہ اپنے نازک پروں سے روئے زمین کے جس خطے تک چاہو پہنچ جاؤ۔ میرے پاس سے جا کر تم اتنے دن کہاں رہیں؟"

فاختہ نے اُسی محبت سے جواب دیا "اچھے شہزادے! تم سے رخصت ہو کر میں یہاں سے بہت دور ایک عجیب ملک کی سیر کو چلی گئی تھی اور وہاں سے تمہارے لئے ایک حسین تحفہ لائی ہوں۔ تمہارے لئے میرے سینے میں ایک بڑی اچھی خبر پوشیدہ ہے۔ تمہارے پاس سے رخصت ہو کر میں یہاں سے بہت دور، زمین سے اونچی اُڑی چلی جا رہی تھی کہ مجھے ایک خوبصورت باغ نظر آیا جس میں ہر طرح کے پھل پھول لگے ہوئے تھے۔ باغ ایک سرسبز و شاداب وادی میں ایک دریا کے کنارے بنا ہوا تھا اور اس کے عین درمیان میں ایک شاندار محل تھا۔ میں اُڑتے اُڑتے تھک گئی تھی اس لئے دم لینے کے لئے باغ میں اُتر آئی اور ایک شاخ پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک شہزادی، جوانی اور حسن کے نشے میں مخمور، باغ کی روشوں پر ٹہل رہی ہے۔ اُس کے گرد حسین اور جوان کنیزوں کا جھرمٹ ہے جنھوں نے اُسے تر و تازہ پھولوں کے گجروں اور گہنوں سے سجا رکھا ہے۔ شہزادی کے سر پر حسین اور رنگین پھولوں کا تاج بھی تھا۔۔۔ لیکن ان پھولوں میں سے کسی میں وہ تازگی اور شگفتگی نہیں تھی جو شہزادی کے حسن میں ہے۔ باغ کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ کسی انسان کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں۔ اس لئے اے شہزادے! جب میں نے حسن و رعنائی کے اِس مجسّمے کو دیکھا تو مجھے یقین آگیا کہ فطرت حسن اور معصومیت کے اس شاہکار کی پرورش اس لئے کر رہی ہے کہ وہ میرے شہزادے کو محبت کے راز سے آشنا کرے۔"

فاختہ کی باتوں نے شہزادے کے دل میں سُلگتی ہوئی آگ کو شعلہ بنا دیا۔ اُس کے فطری جذبۂ محبت کو پروان چڑھنے کے لئے جس محبوب کی جستجو تھی وہ اُسے مل گیا اور اُس کے دل میں اَن دیکھی شہزادی تک پہنچنے کی بے پایاں آرزو کروٹیں لینے لگی۔ اُس نے بیتاب ہو کر شہزادی کے نام اُسی وقت ایک خط لکھا اور انتہائی پُرجوش اور پُرشوق زبان میں شہزادی کو اپنی ولولہ انگیز محبت، اپنی قیدِ تنہائی اور مجبوری کا حال سُنایا جس نے

اُس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور وہ اپنے آپ کو شہزادی کے آستاں تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اُس نے عبارت میں جا بجا ایسے شعر بھی لکھے جن کا مضمون سیدھا دل میں گھر کرتا تھا۔ اُس کے ان شعروں میں بلا کا سوز و گداز تھا اس لئے کہ فطرت نے اُسے شاعر پیدا کیا تھا اور محبت نے اس شاعری کو جلا دی تھی۔

"منفید احمد" نے یہ خط "اجنبی حسینہ" کے نام لکھا اور اُسے مشک اور گلاب کی خوشبو میں بسا کر اپنے ننھے قاصد کے سپرد کر دیا۔ خط دیتے وقت درد بھری آواز میں اُس نے فاختہ کو یوں رخصت کیا:۔

"میرے ننھے، باوفا قاصد! پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں اور میدانوں
پر پرواز کر، اور درختوں کی ڈالیوں پر سانس نہ لے، زمین پر قدم نہ رکھ
اور جلدی سے جلدی میرا خط میرے دل کی ملکہ تک پہنچا دے!"

فاختہ نے خط لیا اور فوراً ہی فضا میں تیرنے لگی۔ شہزادہ اُسے آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اُس کا جسم بادلوں میں صرف ایک دھبا سا نظر آنے لگا اور دیکھتے دیکھتے یہ دھبا پہاڑ کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اپنے ننھے پیامی کو گمنام حسینہ کے پاس بھیجنے کے اگلے ہی دن سے شہزادہ احمد اُس کی واپسی کا منتظر رہنے لگا۔ جب کئی دن گزر گئے تو اُس نے دل ہی دل میں اُس کی بے وفائی کا شکوہ شروع کر دیا لیکن ایک دن مغرب کے قریب وفادار فاختہ پھڑپھڑاتی ہوئی اُس کے برج میں داخل ہوئی اور فرش پر گرتے ہی مر گئی۔ کسی ظالم شکاری کا تیر اُس کے سینے میں پیوست تھا، لیکن اس حالت میں بھی ننھا قاصد تڑپتا پھڑکتا برج تک پہنچا اور جو خدمت اپنے ذمے لی تھی اُسے جان دے کر پورا کیا۔ شہزادہ غم سے نڈھال اس نازک شہیدِ وفا کی لاش پہ جھکا ہوا تھا کہ اُسے اُس کے گلے میں موتیوں کا ایک ہار دکھائی دیا۔ اس ہار میں اُس کے نرم پروں کے اندر چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔ یہ تصویر ایک حسین شہزادی کی تھی جس نے ابھی شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا۔ بلاشبہ یہ تصویر "اجنبی حسینہ" کی تھی۔ لیکن وہ کون تھی؟ اور کہاں تھی؟ اُس پر خط نے کیا اثر کیا تھا؟ کیا تصویر خط کے جواب میں محبت کی نشانی کے طور پر بھیجی گئی تھی؟ ان سوالوں کے جواب کوئی نہیں جانتا تھا۔ وفادار فاختہ کی موت نے ہر چیز پر شبہ اور اسرار کا پردہ ڈال دیا تھا۔

شہزادہ تصویر کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے تصویر کو اپنی آنکھوں سے اور سینے سے لگایا اور اس کے بعد گھنٹوں اس پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ اس کے دل میں ایک عجب طرح کا میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا اور وہ ساکت تصویر سے دیوانوں کی طرح باتیں کر رہا تھا "حسین تصویر! تو محض تصویر ہے۔ لیکن تیری شبنمی آنکھوں کی چمک میرے دل کو منوّر کر رہی ہے۔ یہ گلابی رس بھرے ہونٹ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی محبت کا آبِ حیات میرے کانوں میں ٹپکا دیں گے۔" شہزادہ ایکا ایکی چونک اٹھا اور مسکرا کر کہا "میں بھی کیسا دیوانہ ہوں! کیا اس سے پہلے یہ آنکھیں میری طرح بہت سوں کو دیوانہ نہیں بنا چکی ہیں؟ اے میری دل نواز محبوبہ! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟ کسی کو کیا خبر کہ ہمارے دلوں کے درمیان کتنے پہاڑ، کتنے دریا اور کتنے میدان حائل ہیں؟ اور کون جانے کہ حوادث کی کتنی دیواریں ہجر و وصال کی گھڑیوں کو جدا کر رہی ہیں؟ شاید اس وقت بھی کہ میں ایک سنگین برج میں مقیّد تیری بے جان تصویر سے باتیں کر رہا ہوں تیرے آستانے پر عاشقوں کا ہجوم ہوگا۔"

دیوانگی نے احمد کے دل میں استقامت پیدا کی اور یہ استقامت زندگی کے ایک نصب العین کا پیش خیمہ بنی "میں اس قید سے رہائی حاصل کروں گا اور محبّت کا زائر بن کر کعبۂ محبّت کی جستجو میں دنیا کے چپّے چپّے کا سفر کروں گا۔"

دن کے وقت قلعہ سے نکلنا آسان نہ تھا لیکن رات کو قلعے اور برج کے گرد صرف معمولی سا پہرہ ہوتا تھا اس لئے شہزادے کا خیال تھا کہ اس قید سے رہائی مشکل نہیں۔ لیکن قید سے رہائی کے بعد کی منزل سخت تھی۔ وہ گنبد سے نکل کر جائے گا کدھر؟ اسے اس بے خبری میں کسی واقف رہنما کی ضرورت تھی۔ واقف رہنما کے تصوّر نے اسے اُلّو کی یاد دلائی۔ راتوں کا گشت جس کا محبوب مشغلہ تھا اور اس لئے یقین تھا کہ وہ تمام پوشیدہ گلی کوچوں سے واقف ہوگا۔ شہزادہ اُلّو کے حجرے میں پہنچا اور اس سے گرد و پیش کے مقامات کے متعلق طرح طرح کے سوال کئے۔ شہزادے کے سوالوں پر اُلّو نے اپنے چہرے پر خود پنداری کا رنگ پیدا کر کے شہزادے کو جواب دیا "شہزادے! تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اُلّوؤں کا خاندان بے حد قدیم اور بے حد وسیع ہے اور ہمارا قبضہ ہسپانیہ کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے محلوں اور قصروں پر ہے۔ کوئی پہاڑی قلعہ، کوئی میدانی قصر، کوئی برج، کوئی فصیل ایسی نہیں جہاں میرا کوئی بھائی، کوئی چچا یا کوئی اور عزیز نہ بستا ہو۔

ان عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملنے کی خاطر میں نے اِس سرزمین کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ میری نظر سے زمین کا کوئی ٹکڑا پوشیدہ نہیں۔"

شہزادے کو یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ اُلّو ہسپانیہ کے جغرافیہ سے پوری طرح واقف ہے۔ اُس نے فوراً ہی اپنا درد اُس سے کہہ کر اُس کا مشورہ اور رہنمائی طلب کی۔

اُلّو نے محبت اور محبوب کا ذکر سُنا تو غصے سے بولا "فضول باتیں مت کرو! تمھیں مجھ سے ایسی باتیں کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تمھارا خیال ہے کہ اپنے مطالعے اور غور و فکر کو چھوڑ کر میں تمھاری محبت کے قصوں میں وقت ضائع کروں گا؟"

شہزادے نے اُلّو کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے بڑی نرمی سے کہا "میرے فاضل دوست! تھوڑے دن کے لئے اپنے مطالعے اور غور و فکر کو چھوڑ کر میری رہنمائی کرو۔ اِس خدمت اور ایثار کے بدلے میں تمھاری ہر آرزو پوری کر دوں گا۔"

"شکر ہے کہ مجھے جو کچھ چاہیئے وہ میسّر ہے۔ مجھے اپنے خاصے کے لیے تھوڑے سے چوہوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے مل جاتے ہیں۔ سامنے کی دیوار میں بنا ہوا سوراخ میرے مطالعے کے لئے خاصا وسیع ہے۔ تم خود سوچو کہ مجھ جیسے فلسفی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟"

"میرے دانا دوست! اپنے تاریک حجرے میں بند تم جو یوں چاند کو تکتے رہتے ہو تو دنیا کو تمھارے علم و فضل سے کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ تمھیں معلوم ہے کہ ایک دن مجھے اپنے والد کے تخت پر بیٹھنا ہے جب وہ وقت آئے گا تو میں تم جیسے دانا حکیم کو اپنا مُشیر خاص بناؤں گا۔"

اُلّو فلسفی تھا اور اُس کا دل دُنیاوی حرص و طمع سے خالی تھا لیکن جاہ پسند وہ بھی تھا، اس لئے شہزادے کی باتوں میں آ گیا اور اُس زائرِ محبت کے سفرِ محبت میں اُس کا رہنما اور مُشیر بننے پر راضی ہو گیا۔

عاشق کے منصوبے بننے میں دیر نہیں لگتی۔ شہزادے کے پاس جتنے ہیرے جواہرات تھے اُنھیں اُس نے زادِ راہ کے طور پر اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔ اُسی رات اُس نے بُرج کی ایک نشست میں رسّی لٹکائی، نیچے اُترا اور صبح ہونے سے پہلے اپنے رہنما کی قیادت میں پہاڑوں کے اندر جا چھپا۔ پہاڑ کے ایک تاریک کونے

میں بیٹھ کر سفر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اُلّو نے اُسے مشورہ دیا کہ "شہزادے! اگر میری بات مانو تو یہاں سے اشبیلیہ کی طرف چلو۔ کئی برس کی بات ہے کہ میں اپنے ایک چچا سے ملنے وہاں گیا تھا۔ میرا چچا بڑی عظمت و شان والا اُلّو تھا اور اشبیلیہ کے قصر کے ایک ویران گوشے میں رہتا تھا۔ جس زمانے میں میں چچا کا مہمان تھا رات کے وقت گھومنے پھرنے نکلتا تھا۔ اپنے گشت میں میں بار ہا دیکھتا تھا کہ قلعے کے ایک ویران بُرج میں روشنی ہو رہی ہے۔ میرے دل میں جستجو پیدا ہوئی اور ایک رات میں قلعے کی فصیل پر اُترا۔ میں نے دیکھا کہ بُرج میں ایک بوڑھا آدمی بہت سی کتابوں میں گھرا بیٹھا ہے۔ میں نے قیافے سے سمجھ لیا کہ یہ کوئی بڑا جادوگر ہے۔ جادوگر کے کندھے پر ایک کھوسٹ کوّا بیٹھا تھا۔ اس کوّے سے میں مصر میں مل چکا تھا اور اُس کے وسیع علم سے خوشہ چینی بھی کی تھی۔۔۔ ایک قدیم شناسا کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن اُس وقت میں اُس سے مل نہیں سکا۔ اب مجھے معلوم ہُوا ہے کہ وہ جادوگر تو مر گیا لیکن بوڑھا کوّا اب بھی زندہ ہے اور قلعے کے اُسی گنبد میں رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کوّا بہت بڑا کاہن اور نجومی ہے اور مصر کے سب کوّوں کی طرح جادوگری میں بھی طاق ہے۔ وہ ضرور ہماری رہنمائی کرے گا۔"

اُلّو کی بات شہزادے کے جی کو لگ گئی اور اُس نے اشبیلیہ کو اپنی منزلِ مقصود بنایا۔ اُلّو کی وجہ سے شہزادہ صرف رات کے وقت سفر کرتا اور دن کو دونوں کسی بوسیدہ عمارت یا منہدم مینار کی آڑ میں پڑ رہتے اس لئے کہ اُلّو ایسے ہر گوشۂ تنہائی سے واقف تھا اور کھنڈروں اور بوسیدہ عمارتوں کے معاملے میں بڑا قدامت پسند اور روایت پرست تھا۔

راتوں کو سفر کرتے کرتے بالآخر یہ بادیہ پیمایانِ محبت اشبیلیہ کے شہر پہنچ گئے۔ اُلّو کو چونکہ بازاروں کی چمک دمک اور گہما گہمی سے نفرت سی تھی اس لئے وہ شہر پناہ کے باہر ہی رُک گیا اور ایک کھو کھلے درخت میں اپنا عارضی مسکن بنا لیا۔

شہزادہ شہر میں داخل ہُوا اور تھوڑی سی تلاش کے بعد اُسے جادو کا بُرج مل گیا۔ شہر کی حویلیوں اور قصروں کے درمیان وہ ایسا ہی سر بلند تھا جیسے صحرا کی جھاڑیوں میں کھجور کا درخت۔ حقیقت میں یہی بُرج ہے جو آج بھی اشبیلیہ کے بُرج "ہجرالدا" کے نام سے معروف و موجود ہے۔

شہزادہ بُرج کی بے شمار سیڑھیاں طے کر کے اُس کی سب سے اُونچی منزل پر پہنچ گیا۔ بُرج کے اِک کونے میں کوّا بیٹھا تھا ـــــ سفید سر، بکھرے ہوئے پَر اور بازو، ایک آنکھ پر لٹکتی ہوئی ایک بے جان سی جھلّی، جسے دیکھ کر اُس کے پیکرِ خیال ہونے کا گُمان ہوتا تھا۔

کوّے کے پُرجلال چہرے اور اُس کی غیر معمولی دانائی سے مرعوب و متاثر، شہزادہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب آیا اور بڑے احترام سے اُس سے مخاطب ہُوا "بزرگ اور محترم طائر! مجھے معاف فرمائیے۔ میں آپ کے بیش بہا مطالعے اور استغراق میں مخل ہُوا۔ میں ایک بندۂ محبّت ہوں اور آپ سے یہ قیمتی مشورہ طلب کرنے حاضر ہُوا ہوں کہ اپنے معبودِ محبّت تک کیسے رسائی حاصل کر دوں؟"

کوّے نے سر اُٹھائے بغیر سنجیدگی سے جواب دیا "اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میری فراستُ الیَد کا امتحان لینا چاہتے ہو۔ لاؤ، اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ میں تمھارے ہاتھ کی لکیریں دیکھوں اور تمھاری قسمت کا حال بتاؤں۔"

"معاف فرمائیے!" شہزادے نے عرض کیا "میں قسمت کا حال معلوم کرنے کے لئے حاضر نہیں ہُوا اس لئے کہ اللہ نے یہ بھید فانی انسان کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے۔ میں تو جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک زائرِ محبّت ہوں اور صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا کعبۂ مقصود کہاں ہے؟"

بوڑھے کوّے نے شہزادے کو اپنی ایک آنکھ سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تمھارا شاہدِ مقصود اُندلس کی عاشقانہ سرزمین میں ہے؟ یا اشبیلیہ کی شوخ و سرمست وادی میں جہاں غزال چشم دوشیزائیں ہر کنج میں مصروفِ رقص نظر آتی ہیں؟"

شہزادے کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ اُسے اِس بات سے سخت کوفت ہوئی کہ ایک بوڑھا طائر جس کا ایک پیر قبر میں ہے ایسی سوقیانہ باتیں کرے۔ اُس نے بے حد سنجیدہ ہو کر کوّے سے کہا "جناب! یقین کیجئے، میرے سفر کا مقصد اِتنا لایعنی اور مبتذل نہیں جتنا آپ نے سمجھا۔ وادیُ الکبیر کے کُنجوں میں رقص کرنے والی اندلسی دوشیزائیں میری نظر میں کچھ نہیں۔ مجھے ایک گمنام اور لاثانی حسینہ کی جستجو ہے، جس کی شبیہہ یہ دیکھئے میرے پاس ہے۔ اس لئے اے محترم طائر! میری التدعا آپ سے

یہ ہے کہ اگر یہ بات آپ کے دائرۂ علم و نظر میں ہو تو مجھے بتائیے کہ وہ مجھے کہاں مل سکتی ہے؟"

شہزادے کی متانت نے کوّے کو سخت نادم کیا اور اس نے ترشی سے جواب دیا "مجھے شباب اور حسن سے کیا تعلق؟ میری شناسائی اُن سے ہے جو بوڑھے اور نیم مردہ ہیں، اُن سے نہیں جو شگفتہ اور حسین ہیں۔ میں قسمتوں کا پیامی ہوں، میں بیماروں کے دریچوں میں پر پھڑپھڑاتا اور بہانگ دُہل لوگوں کو اُن کی موت کا پیغام سناتا ہوں۔ اس لئے اے نوجوان! اپنی گمنام محبوبہ کی جستجو کہیں اور جا کر کرو۔"

"یہ تلاش اگر میں فرزندانِ دانش کے آستانے پر نہ کروں تو اور کہاں کروں کہ یہی دانشور صحیفۂ تقدیر کے رازداں ہیں؟ اے فرزند علم و دانش! میں ایک شہزادہ ہوں۔ ستاروں کی گردش نے مجھے ایسی پُراسرار مُہم پر روانہ کیا ہے، جس کے انجام پر حکومتوں کی قسمت کا انحصار ہے۔"

کوّے کو جب شہزادے کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ معاملہ ایسا ہے جس میں ستارے بھی دلچسپی لے رہے ہیں تو اُس نے اپنا لہجہ اور انداز بدلا اور شہزادے کی کہانی پوری توجہ سے سُنی۔ جب یہ داستانِ محبت ختم ہو چکی تو اس نے شہزادے سے کہا "نوجوان شہزادے! جس شہزادی کا تم ذکر کر رہے ہو اُس کا حال میں تمہیں نہیں بتا سکتا اس لئے کہ میری پرواز گلشنوں اور دوشیزاؤں کے کنجوں میں نہیں۔ لیکن تم قرطبہ جاؤ وہاں کی جامع مسجد کے صحن میں عبدالرحمٰن اعظم کا لگایا ہوا کھجور کا درخت ہے۔ اس درخت کے سایہ میں تمہیں ایک سیاح بیٹھا ہوا ملے گا جس نے سب ملکوں اور درباروں کی سیر کی ہے، اور ان گنت شہزادیوں کا منظورِ نظر رہا ہے۔ اُس سے تمہیں اپنے شاہدِ مقصود کا پتہ چل جائے گا۔"

شہزادے نے کہا "اس بیش قیمت مشورے کا بہت بہت شکریہ! محترم ساحر، خدا حافظ!"

"خدا حافظ! زائرِ محبت، خدا حافظ!" کوّے نے خشکی سے جواب دیا اور ایک نقشے پر جھک کر غور و فکر میں ڈوب گیا۔

شہزادہ اشبیلیہ سے باہر آیا۔ اپنے ہم سفر مینا کو تلاش کیا، جواب بھی درخت کی کھوکھ میں بیٹھا اونگھ رہا تھا اور دونوں قرطبہ کی طرف روانہ ہو گئے۔"

وہ جلد ہی معلق باغوں اور نارنگی اور لیموں کے کنجوں والی حسین وادی الکبیر میں پہنچ گئے۔ قرطبہ

کے پھاٹک پر پہنچ کر آتو تو ایک خستہ دیوار کے ایک سوراخ میں جا گھسا اور شہزادہ عبدالرحمٰن اعظم کے لگائے ہوئے کھجور کے درخت کی جستجو میں روانہ ہوا۔ کھجور کا بلند و بالا درخت نارنگی اور سرو کے چھوٹے لیکن حسین درختوں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ فقیر اور درویش چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں صحن کے گرد بنے ہوئے حجروں میں بیٹھے تھے اور بہت سے مسلمان حوض کے کنارے بیٹھے وضو کر رہے تھے۔

کھجور کے درخت کے نیچے بہت سے لوگوں کا جمگھٹا تھا اور کوئی اُن کے سامنے بڑی روانی سے تقریر کر رہا تھا۔ شہزادے نے اپنے دل میں سوچا "یقیناً یہ وہی نامور سیّاح ہے جس سے مجھے گمنام شہزادی کا پتہ چلے گا۔" وہ آگے بڑھ کر مجمع میں شامل ہو گیا لیکن اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ جس مقرّر کی تقریر اس انہماک سے سُن رہے تھے وہ ایک طوطا تھا، جس کے سبز پروں، مقناطیسی آنکھوں اور سرخ کلغی کو دیکھ کر اُس کی اہمیّت کا اندازہ ہوتا تھا۔

شہزادے نے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص سے پوچھا "آخر کیا بات ہے کہ اتنے بہت سے سنجیدہ آدمی ایک باتونی طوطے کی ٹیں ٹیں اتنی دلچسپی سے سُن رہے ہیں؟"

مخاطب نے کہا "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہ باتیں آپ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ یہ طوطا فارس کے اُس نامور طوطے کے خاندان سے ہے جو اپنی داستان سرائی کے لئے دُور دُور مشہور تھا۔ مشرق کا سارا علم اُس کی زبان کی نوک پر ہے اور وہ شعر بھی اُسی بے تکلفی اور روانی سے پڑھتا ہے جیسے وہ باتیں کرتا ہے۔ اُس کی بہت سے درباروں تک رسائی ہوئی ہے اور ہر جگہ اُسے علم و فضل کا ہاتفِ غیبی سمجھا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ صنفِ نازک کا محبوب رہا ہے، جنھیں ایسے طوطوں سے عشق ہوتا ہے جو اُنھیں شعر سُنا سکیں۔"

"بہت بہت شکریہ!" شہزادے نے کہا "میں اِس باوقار سیّاح سے تخلیے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

شہزادے نے تخلیے کی ملاقات کی درخواست کی اور اپنے مقصد کی نوعیّت بیان کی تو طوطے نے ایسا خشک، کھوکھلا اور تمسخر آمیز قہقہہ لگایا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طوطے نے شہزادے

سے کہا "میری ہنسی کو معاف کرنا۔ مگر میں کیا کروں؟ مجھے محبّت کا نام سُنتے ہی ہنسی آ جاتی ہے۔"

شہزادے کو بے وقت کے اس مذاق سے تکلیف پہنچی۔ اُس نے فاختہ سے سُنی ہوئی باتیں دہرائیں
"کیا محبّت فطرت کا سربستہ راز، زندگی کا پوشیدہ اُصول اور تعلق کا عالمگیر رشتہ نہیں؟"

"بس! بس" طوطا چلّایا "تم نے یہ سب جذباتی باتیں کس سے سیکھیں؟ یقین جانو محبّت تو اب ایک فرسودہ شے کا نام ہے۔ سنجیدہ اور خوش مذاق لوگ اس کا نام نہیں لیتے۔"

شہزادے کو فاختہ کی باتیں یاد آئیں تو طوطے کی باتوں پر اُس کے مُنہ سے آہ نکل گئی۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا "یہ طوطا درباروں میں رہا ہے۔ وہ سنجیدگی اور خوش مذاقی کا دعوے دار ہے اور اُسے یہ نہیں معلوم کہ محبّت کیا ہے۔ لیکن جو نازک جذبہ اُس کے دل کی دُنیا پر چھایا ہوا تھا وہ اب اُس کا اس سے زیادہ مذاق نہیں اُڑوانا چاہتا تھا اس لئے اُس نے طوطے سے فوراً اپنے مطلب کا سیدھا سوال کیا۔

"اے باہنر طوطے! آپ کی رسائی حُسن کی پوشیدہ بارگاہوں تک ہوئی ہے۔ بتائیے کہ کیا آپ کو اپنی سیاحت کے دوران میں اس شبیہہ کی اصل دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟"

طوطے نے تصویر شہزادے کے ہاتھ سے لے لی۔ اپنے سر کو داہنے بائیں کئی جنبشیں دیں اور تصویر کے خط و خال کو کبھی ایک آنکھ سے اور کبھی دوسری سے بڑے غور سے دیکھا اور پھر گویا ہوا "خدا کی قسم! بیحد حسین چہرہ ہے، بے حد حسین! لیکن سیاح اور مسافر کو اپنی سیاحت و سفر میں ہزاروں حسین چہرے نظر آتے ہیں وہ آخر کسے کسے ـــــ لیکن نہیں، ذرا ٹھہرو! مجھے تصویر کو ایک بار پھر دیکھنے دو ـــــ آہا! یہ تصویر تو شہزادی اَلدِبجوندا کی ہے۔ میں بھلا اُسے کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ تو مجھے بے حد عزیز ہے۔"

"شہزادی اَلدِبجوندا!" شہزادے نے دُہرایا "لیکن وہ ملے گی کہاں؟"

"آہستہ! آہستہ!" طوطے نے کہا "اُس کا ڈھونڈنا آسان ہے لیکن حاصل کرنا دشوار۔ وہ طلیطلہ کے عیسائی بادشاہ کی اکلوتی بیٹی ہے اور نجومیوں کی کسی پیشین گوئی کی وجہ سے سترہ سال کی عمر تک کے لئے اُسے دُنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے تمھارا اُس تک پہنچنا ناممکن ہے۔ تمھاری کیا کسی

انسان کی مجال نہیں کہ اُس تک باریاب ہو سکے۔ مجھے شہزادی کا دل بہلانے کے لئے اُس کی خدمت میں جانے کا موقع ملا ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں، مجھے ساری زندگی الدیجوندا جیسی خوش گو اور شیریں سخن شہزادی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"دانا طوطے!" شہزادے نے کہا "ذرا چپکے سے میری ایک بات سُنئے۔ میں ایک نامور بادشاہ کا ولی عہد اور تخت و تاج کا واحد وارث ہوں۔ میں آپ کی دانش مندی اور وسیع تجربے سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ شہزادی سے میری ملاقات کی صورت پیدا کیجئے تو میں کوئی معزز منصب آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔"

"بسر و چشم!" طوطے نے جواب دیا "لیکن ایک شرط ہے۔ مجھے کوئی ایسا عہدہ ملنا چاہیئے جس میں کام نہ کرنا پڑے اس لئے کہ تم جانتے ہو اہلِ دانش محنت و مشقت سے ذرا گھبراتے ہیں۔"

معاملات طے ہو گئے اور شہزادہ جس راستے سے قرطبہ میں داخل ہوا تھا اُسی سے باہر نکلا، اپنے دوست اُلّو کو بلایا، اپنے نئے دوست اور رہنما سے اُس کا تعارف کرایا اور تینوں منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔

شہزادے کی بے صبری و بے تابی کو دیکھتے ہوئے اُن کے سفر کی رفتار بہت دھیمی تھی لیکن طوطا آرام کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا اور دیر تک سوتا تھا۔ اُلّو دن کے بڑے حصے میں سوتا تھا۔ اُس کا قدامت پسند مزاج اور مذاق بھی سفر میں مخل ہوتا تھا اس لئے کہ وہ راستے میں آنے والے ہر کھنڈر کا جائزہ لینے پر اصرار کرتا۔ اُس علاقے کے ہر گنبد اور ہر قصر کے متعلق اُسے بے شمار روایتیں اور داستانیں یاد تھیں۔ شہزادے کا خیال تھا کہ اُلّو اور طوطا، دونوں صاحبِ علم و فضل ہیں اس لئے ایک دوسرے کی صحبت میں خوش رہیں گے لیکن اُس کا خیال بالکل غلط نکلا۔ وہ دونوں راستے بھر آپس میں جھگڑتے رہے۔ طوطا ادیب و شاعر تھا اور اُلّو حکیم و فلسفی۔ طوطا بات بات پر شعر پڑھتا اور معمولی سے معمولی بات میں ادیبانہ و شاعرانہ نکتے پیدا کرتا۔ اُلّو کو اس قسم کی ذکاوت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ اُسے الٰہیات کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ طوطا گانے گاتا، لطیفے سُناتا، اپنے سنجیدہ ہم سفر پر فقرے چُست کرتا اور اپنی خوش گفتاری پر خود ہی خوش ہوتا اور قہقہے لگاتا۔ اُلّو کو اس طرح کی سب حرکات اپنے علمی وقار پر حملہ معلوم ہوتیں۔ وہ بگڑتا، ناک بھوں چڑھاتا اور دن دن بھر مُنہ پھُلائے رہتا۔

شہزادہ اپنے ساتھیوں کے لڑائی جھگڑے سے بے خبر اپنے حسین خوابوں میں مستغرق اور تصوّر

میں اپنی گمنام محبوبہ سے ہمکلام رہنا۔ جادۂ محبت کے یہ تلنیوں رہرو جبل مورنیا کے دشوار گزار دروں، لا منشہ اور قشتالہ کے پھیلے ہوئے میدانوں اور سنہرے "ٹیگس" کے طویل کناروں کو طے کرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے مضبوط فصیلوں اور بلند میناروں کا ایک شہر نظر آنے لگا جو ایک سنگین راس پر بنا ہوا تھا اور جس کے گرد ٹیگس چھپا چنگھاڑتا بہہ رہا تھا۔

اُلو کو جوں ہی شہر کی جھلک دکھائی دی اُس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "یہی طلیطلہ کا قدیم شہر ہے، جو ساری دُنیا میں اپنے آثارِ قدیمہ کی وجہ سے مشہور و معروف ہے۔ دیکھو! آنکھیں کھول کر اُن محترم برجوں اور میناروں کو دیکھو، اِن میں سے ہر ایک روایتوں کے شکوہ کا مظہر ہے۔ ان برجوں اور میناروں میں میرے بہت سے بزرگوں نے جذب و استغراق میں عمریں بسر کی ہیں"

اُلو کی باتیں سن کر طوطے نے حقارت سے کہا "فضول! بکواس! ہمیں آثارِ قدیمہ سے کیا غرض؟ اور ہمیں تمہارے بزرگوں کی روایتوں اور افسانوں سے کیا کام؟ دیکھو، جو چیز ہمارے مقصد سے زیادہ قریب ہے، اُسے دیکھو ـــــ حسن و شباب کا مسکن، شہزادے وہ دیکھو! سامنے تمہارے شاہدِ مقصود کا محل ہے، جس کی جستجو میں تم ہر طرف سرگرداں ہو"

شہزادے نے اُس طرف دیکھا جدھر طوطے نے اشارہ کیا تھا اور اُسے ٹیگس کے کناروں پر ایک خوشنما سبزہ زار میں ایک عالیشان محل ایک حسین باغ کے کنجوں میں سے جھانکتا نظر آیا۔ یہ محل اور اُس کا پس منظر اُس تفصیل سے ملتا جلتا تھا جو فاختہ نے گمنام شہزادی کے قیام کا ذکر کرتے وقت بیان کی تھی۔ اُس محل پر نظر پڑتے ہی اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا "شاید! اس وقت میرے دل کی ملکہ اُن سایہ دار کنجوں کے نیچے جی بہلا رہی ہو گی یا اُن شاہانہ نشیمنوں کے زیرِ سایہ مصروفِ خرام ہو گی اور شاید اُن بلند و بالا ایوانوں میں محوِ استراحت ہو گی" اُس نے زیادہ غور سے محل کی طرف دیکھا تو سچ مچ محل کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور اُنھیں عبور کرنا آسان نہ تھا۔ اُسے محل کے چاروں طرف مسلح سپاہی بھی گشت کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔

شہزادے نے طوطے کی طرف دیکھا اور عاجزی سے اُس سے بولا "اے باہنر بزرگ! تمھیں خدا نے فنِ انسانی کا ہنر عطا کیا ہے۔ سامنے والے باغ میں جائیے، میری محبت کے معبود کو تلاش کیجئے اور اُس

سے کہیے کہ زائرِ محبت، شہزادہ احمد، اُس کی جستجو میں ٹیگس کے گُل پوش ساحل تک آپہنچا ہے۔"

طوطا اپنی سفارت کی اہمیت پر نازاں، باغ کی سمت اُڑا، اُس کی بلند دیواروں پر پرواز کر کے کچھ دیر تک سبزہ و گُل کے حسن و شادابی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور جا لا آخر ایک ایسے ایوان کی شہ نشین پر جا بیٹھا جو بہتے ہوئے دریا کے عین اوپر بنی ہوئی تھی۔ شہ نشین کے دریچوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو شہزادی ایک بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی غزالی آنکھیں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر جمی ہوئی تھیں اور آنسوؤں کے قطرے ایک ایک کر کے اُس کے زرد رخساروں پر گر رہے تھے۔ اپنے پروں کو جھاڑ کے، اپنی نکیلی چونچ سے اُس میں چمک پیدا کر کے اور کلغی کو اور اُونچا کر کے طوطا چپکے سے شہزادی کے قریب جا بیٹھا۔ پھر اپنی صورت پر وقار پیدا کر کے درد بھرے لہجے میں اُس سے مخاطب ہوا "اے حسن کی ملکہ! اپنے آنسو پونچھو۔ میں تمھارے دُکھے ہوئے دل کے لئے سکون و راحت کا پیغام لایا ہوں۔"

شہزادی اپنے قریب انسانی آواز سُن کر چونک پڑی۔ لیکن جب اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے وہاں سوائے طوطے کے اور کوئی نظر نہ آیا جو بڑے ادب سے اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ "آہ! تم ایک زخمی دل کو سکون و راحت کس طرح دے سکتے ہو، جب کہ تم محض ایک طوطے ہو؟"

طوطے کو شہزادی کے جواب سے توہین سی محسوس ہوئی۔ اُس نے بڑے فخر سے کہا "اے شہزادی! میں نے اس سے پہلے بھی بارہا زخمی دلوں پر مرہم رکھا ہے۔ لیکن اب اُس کا ذکر ہی کیا۔ اس وقت تو میں ایک شہزادے کا قاصد بن کر یہاں آیا ہوں۔ غمگین شہزادی! تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ غرناطہ کا شہزادہ احمد تمھیں تلاش کرتے کرتے یہاں آپہنچا ہے اور اس وقت ٹیگس کے گُل پوش ساحل پر تمھارے ایک جلوے کا منتظر ہے۔"

احمد کا نام سُن کر شہزادی کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اُس کے تاج کے ہیرے بھی اس چمک کے آگے ماند پڑ گئے۔ وہ خوشی سے چلّا اُٹھی "اے محبوب قاصد! تو واقعی مسرت و شادمانی کا پیامبر ہے اس لئے کہ احمد کے فراق میں میں افسردہ، غمگین اور نیم مُردہ تھی۔ لیکن اب میرے تنِ مردہ میں جان آگئی۔ جا! اور شہزادہ احمد سے کہہ دے کہ اُس کے خط کے محبت بھرے لفظ میرے دل پر نقش ہیں اور اُس کے شعر میری رُوح کے لئے

سامانِ حیات بن گئے ہیں۔ لیکن اُس سے کہہ دینا کہ اُسے اپنی محبت کی صداقت اپنی تیغ زنی اور نیزہ افگنی کی قوّت دکھا کر ظاہر کرنی ہوگی۔ کل میری سترھویں سالگرہ ہے اور کل میرے والد نے کھیلوں کے ایک زبردست مقابلے کا اعلان کیا ہے۔ اس مقابلے میں بہت سے شہزادے شریک ہوں گے اور جو کوئی دوسروں پر سبقت لے جائے گا، میری ذات اُس کا انعام ہوگی۔"

طوطا وہاں سے اُڑا اور کنجوں پر سے گزرتا ہوا بہت جلدی وہاں پہنچ گیا جہاں شہزادہ اُس کا منتظر تھا۔ احمد کو محبوبہ سے ملنے کی خبر اور اُس کے لطف و وفا کا پیام سن کر جو مسرت ہوئی ہوگی اُس کا اندازہ صرف اُنھیں ہو سکتا ہے جنھوں نے اپنے خوابوں کو حقیقت اور وہموں کو صداقت بنتے دیکھا ہے۔ لیکن ایک چیز تھی جو اُس کی مسرت کی شگفتگی میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی اور وہ اگلے دن ہونے والا کھیلوں کا مقابلہ تھا۔ اس مقابلے کے آثار اُسے ابھی سے نظر آ رہے تھے۔ ٹیگس کے کناروں پر ہر طرف تلواروں کی چمک اور ڈھالوں کی کھڑک تھی۔ شہزادوں اور سرداروں کی فوجوں کے دستے قرنا بجاتے اور پرچم لہراتے فخر و ناز سے ٹیگس کی طرف سے طلیطلہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جس ستارے کا سایہ اب تک شہزادے کے مقدر پر چھایا ہوا تھا اُسی کا عکس شہزادی کی قسمت پر بھی پڑ رہا تھا اور اسی لئے سترہ سال کی عمر تک اُس کے صیدِ دل کو محبت کے تیروں سے بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن سترہ سال کی پردہ پوشی نے اُس کے حسن کی رنگینی کو مستور رکھنے کے بجائے اُسے زیادہ نمایاں کیا تھا۔ بہت سے طاقتور بادشاہوں نے اُس کی زلفوں کا اسیر بننے کی تمنا ظاہر کی تھی مگر اُس کا باپ بڑا دانش مند تھا۔ وہ ایک کے پیام کو رد اور دوسرے کو قبول کر کے جانب داری کا ملزم نہیں بننا چاہتا تھا اس لئے اُس نے سب کو کھیلوں کے مقابلے میں اپنے جوہر دکھانے کی دعوتِ عام دی تھی۔ شہزادی کے طالبوں میں سے کئی ایسے تھے جن کی شجاعت و دلیری مسلم تھی۔ اور یہ بد نصیب احمد کے لئے سخت آزمائش کا محل تھا، جسے کبھی اسلحے چھونے اور جوانمردی و شجاعت کے مشاغل میں دلچسپی لینے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ وہ اپنے جی ہی جی میں کہہ رہا تھا "میں بھی کتنا بد نصیب ہوں کہ میری پرورش گوشۂ تنہائی میں ایک فلسفی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ محبت کے کاروبار میں بھلا اقلیدس اور جبر و مقابلہ میرے کس کام آئیں گے؟ افسوس! ابن حبان! تو نے مجھے تیغ زنی اور نیزہ بازی کے سبق کیوں نہیں دیئے؟"

شہزادہ ابھی نہ جانے اور کیا کیا کہتا کہ اُلّو بیچ میں بول اُٹھا۔ شہزادے کی باتوں میں اُسے ایمان کی کمی جھلکتی نظر آئی۔ وہ جوش کے ساتھ بولا "اللہ اکبر! اللہ بڑا ہے اور ہماری قسمتوں پر صرف اُسی کا اقتدار ہے۔ شہزادے! یہ بات مت بھولو کہ یہ سرزمین ایسے ایسے اسرار کا خزینہ ہے، جن کا علم صرف اُنھیں ہے جو میری طرح اندھیرے میں بھی علم کے جویا رہتے ہیں۔ دیکھو! قریب کی پہاڑیوں میں ایک غار ہے اور اس غار میں ایک آہنی میز رکھی ہوئی ہے۔ اِس آہنی میز پر مدتوں سے ایک طلسمی زرہ بکتر رکھی ہے۔ اسی آہنی میز کے برابر میں ایک سحر زدہ گھوڑا کھڑا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں کئی نسلوں سے یہاں پوشیدہ ہیں۔"

شہزادہ اُلّو کی باتیں سُن کر حیرت زدہ ہو گیا اور اُلّو نے اپنی بڑی بڑی گول آنکھیں گھما کر اپنی بات پھر شروع کر دی "کئی سال گزرے میں اپنے والد کے ساتھ اس علاقے کی سیر کو آیا تھا۔ جس غار کا ذکر میں تم سے کر رہا ہوں، ہم اُسی میں ٹھہرے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے غار کے اِن پوشیدہ اسرار کا علم ہے۔ یہ روایت کئی نسل سے ہمارے خاندان کے لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور میں نے اپنے بچپن میں اپنے دادا سے سُنی تھی کہ یہ زرہ بکتر ایک حبشی جادوگر کی ہے، جس نے طلیطلہ کے عیسائیوں کے قبضے میں آنے کے وقت اِس غار میں آ کر پناہ لی اور یہیں مرا۔ زرہ بکتر اور گھوڑا اُس کے مرنے کے بعد سے برابر یہاں پوشیدہ ہے اور طلسم کی خاصیت سے صرف کسی مسلمان شہزادے کے کام آ سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس طلسم کا اثر صرف صبح سے دوپہر تک رہتا ہے۔ اس مختصر وقت میں جو کوئی ان دونوں چیزوں کو استعمال کرے وہ بڑے سے بڑے حریف کو زیر اور مغلوب کر سکتا ہے۔"

احمد بے تابی سے بولا "چلو! ہم فوراً اُس غار کی تلاش کریں۔"

اپنے ماضی آشنا رہبر کی رہبری میں شہزادے کو وہ غار بہت جلدی مِل گیا۔ طلیطلہ کو جن کوہستانی سلسلوں نے گھیر رکھا ہے، یہ غار اُن میں سے ایک دُور افتادہ اور تاریک سلسلے کے کنارے پر واقع تھا، اور اُلّو کی دُوربیں آنکھ یا کسی ماہرِ اثریات کی باریک بیں نظر کے سوا کسی اور کے لئے ناممکن تھا کہ اس میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر سکے۔ ایک کبھی نہ بجھنے والے، چراغِ خانقہی کی روشنی غار کی بھیانک تاریکی کو کم کر رہی تھی۔ غار کے وسط میں ایک آہنی میز پر ایک طلسمی زرہ بکتر رکھا ہوا تھا۔ اسی کے سہارے ایک

نیزہ رکھا تھا اور میز کے قریب ہی طلسمی عرب گھوڑا بُت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ زرہ بکتر اپنی قدامت کے باوجود اب بھی آئینے کی طرح چمک رہا تھا اور گھوڑے کے تیور ایسے تھے جیسے ابھی کسی چراگاہ سے آ کر کھڑا ہوا ہے۔ احمد نے جوں ہی اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا اُس نے اپنے اگلے سُم زمین پر مارنے شروع کر دیئے اور خوش ہو کر اتنے زور سے ہنہنایا کہ غار کی دیواریں ہل گئیں۔ گھوڑے میں اس طرح جان پڑتے دیکھ کر شہزادے کو یقین ہو گیا کہ وہ اگلے دن کے مقابلے میں اپنے سب حریفوں کو شکست دے گا۔

رات بے قراری اور انتظار میں گزری اور امتحان کی صبح آ پہنچی۔ طلیطلہ کی کہنہ ستانی دیواروں کے زیرِ سایہ مقابلے میں شریک ہونے والوں کی فہرست مرتّب کی گئی اور تماشائیوں کے بیٹھنے کے لئے آرام دہ نشستیں بنائی گئیں۔ اُن پر زربفت کے فرش بچھا کر دھوپ کی روک کے لئے ریشمی شامیانے استادہ کئے گئے۔ بالائی نشستیں شہزادیوں اور امیرزادیوں کے لئے مخصوص کی گئیں۔ اُس سے نیچے کی صف میں بانکی ترچھی ٹوپیوں والے شہزادے اور سردار بیٹھے اور اُن کے داہنے بائیں اُن کے مقرّبین۔ شہزادوں اور امیروں کی صف میں سب سے نمایاں وہ تھے جنھیں مقابلے میں حصّہ لینا تھا۔ اُوپر کی صف میں جو دوشیزائیں بیٹھی تھیں اُن میں سے کوئی آفتاب تھی، کوئی ماہتاب۔ لیکن شہزادی الدیجوندا اپنے شامیانے کے نیچے آ کر بیٹھی تو سب آفتاب اور ماہتاب اُس کے حُسن کی تابانی کے آگے ماند پڑ گئے اور دُنیا والوں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ جو حُسن اب تک پردوں میں نہاں تھا وہ واقعی لاثانی و لاجواب ہے۔ اُس کے آسمانی حُسن کا جلوہ دیکھ کر ہر ایک کے مُنہ سے بے اختیار کلماتِ تحسین نکل گئے۔ اور جو شہزادے محض اُس کے حُسنِ کامل کا شہرہ سُن کر اُس کے شیدائی تھے، اُن کے دلوں میں اس گوہرِ نایاب کو حاصل کرنے کی تمنّا دس گُنی زیادہ ہو گئی۔

لیکن شہزادی کے چہرے پر فکر و پریشانی نمایاں تھی۔ اُس کے رُخساروں پر ایک رنگ آتا ایک جاتا اور اُس کی بے قرار نظریں بار بار بے تابی سے کج کلاہ شہزادوں کا جائزہ لے لیکر پلٹ جاتیں۔ مقابلے کی تمہید کے طور پر ہر طرف قرنا و طبل بج رہے تھے کہ نقیبوں نے ایک نئے جری کی آمد کا اعلان کیا، اور اعلان کے ساتھ ہی احمد میدان میں داخل ہوا۔ فولاد کا جڑاؤ خود اُس کے طرّۂ دستار کو شکست دے رہا

تھا اور اُس کے جسم پر سجا ہُوا زرہ بکتر سونے سے منقش تھا۔ اُس کی تیغ اور خنجر کاریگری کے نادر نمونے تھے اور قیمتی جواہرات کی وجہ سے شعلے کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک گول ڈھال اُس کے کندھے کی زینت تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک طلسمی نوکیلی سنان۔ اُس کے عرب گھوڑے کی جھول زردوزی کے کام سے دمک رہی تھی اور زمین کو چھُو رہی تھی، اور نازنین گھوڑا آہستہ آہستہ عجب ناز و انداز سے آگے بڑھ بڑھ رہا تھا۔ میدان کے بیچ میں اُس نے تازہ ہوا سے اپنے نتھنے پھُلائے اور ہر طرف چمکتے اسلحوں کی آب و تاب دیکھ کر جوشِ مسرت سے ہنہنانے لگا۔ مرکب کی یہ شان تھی اور راکب کا شکوہ نرالا۔ اُس کا مردانہ جمال ہر آنکھ میں کھُب گیا اور جب نقیب نے اُس کا تعارف "زائرِ محبت" کے نام سے کرایا تو بالائی صف میں بیٹھی ہوئی دوشیزاؤں میں ایک تموج سا پیدا ہو گیا۔

احمد آگے بڑھا اور اُس نے فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہا تو منتظمین نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کر دی کہ "مقابلے میں صرف شہزادے شریک ہو سکتے ہیں۔" اُس نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ یہ چیز اور زیادہ خرابی لائی۔ وہ مسلمان تھا اور کسی ایسے مقابلے میں حصّہ نہیں لے سکتا تھا جس کے جیتنے والے کا انعام ایک عیسائی شہزادی کا دستِ نازک تھا۔

حریف شہزادوں نے اُسے گھیر لیا اور اُسے بڑے غرور، بد دماغی اور حقارت سے دیکھنے لگے۔ ایک رُستم صفت شہزادے نے تو اُس کے دُبلے پتلے جسم اور نسوانی حسن کا مذاق اُڑانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ حریف کے اس رویّے نے احمد کو مشتعل کر دیا اور اُس نے اُسے فوراً ہی لڑنے کی دعوت دی۔ دونوں تھوڑے فاصلے سے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے، دونوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے پر حملہ کیا، اور طلسمی نیزے کی ایک ہلکی سی جنبش میں رستم صفت شہزادہ زمین پر آ رہا۔ شہزادہ احمد شاید حریف کے اس انجام پر مطمئن ہو کر خاموش ہو جاتا لیکن افسوس کہ وہ ایک طلسمی گھوڑے پر سوار تھا۔ جب وہ ایک مرتبہ لڑنا شروع کر دے تو کوئی طاقت اُسے لڑنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ عرب گھوڑے نے پسپا شہزادے کو اُس کے حال پر چھوڑا اور جدھر سب سے زیادہ تماشائی تھے اُس طرف ایک جست لگائی۔ نیزے نے اپنا کام کیا۔ جو سامنے آیا اُسے فرشِ خاک پر لٹا یا۔ گھوڑا شہزادے کے قابو سے باہر

تھا۔ وہ سب تماشا، سارے میدان میں ڈور رہا تھا۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب جو اُس کے سامنے آئے اُنھیں نیچے گراتا اور پیروں تلے روندتا رہا۔ احمد اپنی اس بے اختیار اور بے ارادہ جوانمردی پر پشیمان گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ بادشاہ کی رعایا اور اُس کے مہمانوں کے ساتھ احمد نے جو کچھ کیا اُس پر وہ بے حد برافروختہ ہوا۔ اُس نے فوراً اپنے محافظ دستے کو باہر نکلنے اور مقابلہ کرنے کا حکم دیا لیکن اُن سب کا بھی وہی حشر ہوا۔ طلسمی نیزے نے سب کو خاک چٹائی۔ بادشاہ نے اپنا خلعت اُتارا اور سواری کا لباس پہن کر نیزہ بدست اجلبی نشہ سوار کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لیکن افسوس کہ بادشاہ کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسروں کا۔ احمد کا طلسمی مرکب اور نیزہ آداب شاہی سے آشنا نہ تھے۔ پشیمان احمد کے دیکھتے دیکھتے بادشاہ ہوا میں قلا بازیاں کھانے لگا اور اُس کا تاج زریں خاک بسر ہوا۔

عین اس وقت سُورج نصف النہار پر پہنچا۔ سحر کی تاثیر ختم ہو گئی۔ طلسمی مرکب نے بازی گاہ چھوڑی، اُونچی دیواروں پر جست لگائی اور ژنگیس کی طوفانی لہروں کو روندتا اپنے غار میں جا گھسا۔ آن کی آن میں وہاں طلسمی مرکب کی جگہ اُس کا بے حس و حرکت مجسمہ کھڑا نظر آیا اور شہزادہ دم بخود اور حیرت و استعجاب میں غرق اُس کی پیٹھ پر سے اُترا۔ خود اور زرہ بکتر اُتار کر آہنی میز پر رکھا، نیزے کو اُس کے سہارے ٹکایا اور سوچنے لگا کہ دیکھیں قسمت اب کیا دکھاتی ہے۔ وہ غار کی زمین پر بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ بادشاہ اور اُس کی رعایا کی یہ گت بنانے کے بعد میں بادشاہ کو اور اہل طلیلہ کو کیسے منہ دکھاؤں گا؟ اُسے سب سے زیادہ یہ خیال ستا رہا تھا کہ شہزادی اُس کے وحشیانہ کارناموں کو نہ جانے کس نظر سے دیکھے گی۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ صبح کے واقعات کا مختلف لوگوں کے دل پر کیا اثر ہے اُس نے طائر سفیروں کو طلیلہ کی طرف بھیجا۔ طوطے نے شہر کے سب آباد حصوں میں گشت لگایا۔ بازاروں، قہوہ خانوں اور مختلف حلقوں میں لوگوں کو باتیں کرتے سُنا اور تھوڑی دیر میں شہزادے کو آ کر یہ خبر سُنائی کہ سارے شہر پر ہیبت اور اضطراب طاری ہے۔ شہزادی بازی گاہ میں بے ہوش ہو گئی تھی اور لوگوں نے اُسے اُسی حالت میں اُس کے محل پہنچایا۔ کھیلوں کا مقابلہ ایکا ایکی انتشار کی حالت میں ختم ہو گیا تھا اور اس وقت ہر شخص کی زبان پر مسلمان شہزادے کی حیرت خیز آمد و شد اور اُس کے مبہوت کُن کارناموں کا ذکر تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی مرد ساحر تھا، کچھ اُسے بھوت سمجھتے تھے جس نے انسانی پیکر اختیار کر لیا تھا اور کچھ کوہستانی غاروں میں چھپے ہوئے طلسمی جاں بازوں کے افسانے بیان کر کے یہ کہتے تھے کہ یہ شجاع اُنھیں میں سے

ایک ہے۔ بہر حال ہر طرح کی باتیں کرنے والے اس بات پر متفق تھے کہ اجنبی شہ سوار نے جو کچھ کیا وہ کسی معمولی انسان کی قوّت سے باہر تھا۔

اُلّو رات کو گشت کے لئے نکلا اور حویلیوں اور محلوں کی چھتوں اور روشندانوں پر بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر وہ شاہی محل پہنچا جو طلیلہ کی ایک کوہستانی چوٹی پر بنا ہُوا تھا۔ وہ محل کی فصیلوں اور شہ نشینوں پر گیا اور جس روزن، روشندان اور دریچے میں ذرا بھی روشنی نظر آئی وہیں اپنی کشادہ، گول آنکھیں کھول کر بیٹھ گیا۔ رات بھر اُس نے اپنی جاسوسی مُہم جاری رکھی۔ صبح ہوتے ہوتے غار میں واپس آگیا اور جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا اُس کا حال شہزادے کو سُنا دیا۔

" محل کے گنبدوں اور شہ نشینوں کا طواف کرتے ہوئے میں نے ایک دریچے میں سے جھانکا تو اندر ایک حسین شہزادی نظر آئی۔ شہزادی ایک مسہری پر لیٹی تھی اور اُس کے اِرد گرد کئی طبیب بیٹھے تھے۔ لیکن وہ کسی قسم کی دوا دارو پینے کے لئے تیار نہ تھی۔ جب طبیب عاجز آکر رخصت ہو گئے تو شہزادی نے اپنے تکیے میں سے ایک خط نکالا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا، پیار کیا اور پڑھنے لگی۔ وہ اُسے پڑھتی اور زار و قطار روتی رہی۔ اُس کے آنسو دیکھ کر مجھ جیسے بے حس فلسفی کا دل بھی بھر آیا "

یہ خبر سُنکر شہزادہ تڑپ اُٹھا اور اپنے دل ہی دل میں کہنے لگا "حکیم ابن حبّان نے سچ کہا تھا کہ فکر و غم اور بے خواب راتیں محبّت کرنے والوں کا مقسوم ہیں۔ اللہ شہزادی کے دِل کو محبّت کی آگ سے محفوظ رکھے"

طلیلہ سے آنے والی بعد کی خبروں سے اُلّو کے بیان کی تائید ہوئی۔ شہر میں ہر طرف بے چینی اور ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ شہزادی کو محل کے سب سے اُونچے بُرج میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں تک پہنچنے کے سب راستوں پر سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ شہزادی کی غم سے یہ حالت ہوئی کہ اُس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ اُس پر کسی کی نصیحت، کسی کی تشفّی اور دل دہی کا کوئی اثر نہ ہوتا ——— اور مشکل یہ تھی کہ کسی کو اِس غم کا سبب نہیں معلوم تھا۔ مُلک کے حاذق طبیبوں نے اپنے سب نسخے آزمائے لیکن کوئی کارگر نہ ہُوا۔ لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ شہزادی پر جادو کا اثر ہے۔ بادشاہ کو اُس کی طرف سے سخت تشویش تھی۔ اُس نے دُور دُور منادی کرادی کہ جو کوئی شہزادی کو اچھا کرے گا، شاہی خزانے کا سب سے قیمتی موتی اُسے انعام ملے گا۔"

اُلّو ایک کونے میں بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں منادی کی آواز گئی۔ اُس نے بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو ایک گردش دی اور ہمیشہ سے بھی زیادہ پُراسرار نظر آنے لگا۔

"اللہ اکبر!" اُس نے کہا "کتنا خوش نصیب ہوگا وہ شخص جس کے ہاتھوں شہزادی شفا پائے۔ اُسے یہ البتہ سوچنا پڑے گا کہ شاہی خزانے کا سب سے بیش بہا موتی کون سا ہے"۔

احمد نے اُس کی بات سُنی تو بولا "محترم دوست! تمھاری بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا"۔

اُلّو نے ایک کھوکھلی سے ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "شہزادے! میری بات ذرا غور سے سُنو تمھیں معلوم ہے کہ اُلّوؤں کا شمار عالموں فاضلوں میں ہوتا ہے اور تحقیق و تدقیق اُن کا واحد مشغلہ ہے۔ طلیطلہ کے برجوں اور فصیلوں کے شبانہ گشتوں میں میری ملاقات اُلّوؤں کے ایک برگزیدہ حلقے سے ہوئی، جو اپنا اجلاس اُس بلند اور وسیع بُرج کی تاریکیوں میں منعقد کرتا ہے، جہاں شاہی خزانہ مدفون ہے۔ ان جلسوں میں میں نے اُنھیں شاہی خزانوں میں چھُپے ہوئے لعل و جواہر کی صورت شکل اور اُن کے نقوش اور قدامت کے متعلق گفتگو کرتے سُنا ہے۔ اُس دن مختلف ملکوں اور عہدوں کے رسوم بھی اُن کی گفتگو کا موضوع تھے لیکن سب سے زیادہ دلچسپی اُنھیں اُن تعویذوں اور تبرکات سے معلوم ہوتی تھی جو گاتھ شہنشاہ راڈرک کے زمانے سے اس خزانے میں محفوظ ہیں۔ ان تبرکات میں صندل کی لکڑی کا ایک صندوقچہ بھی ہے جسے کسی مشرقی کاریگر نے فولاد کی پیٹیوں سے مضبوطی سے بند کیا ہے۔ اس صندوقچے پر ایک پُراسرار خط میں کوئی عبارت منقوش ہے جسے صرف گِنے چُنے فاضل پڑھ سکتے ہیں۔ اُلّوؤں کے برگزیدہ حلقے میں یہ صندوقچہ اور اُس کا کتبہ کئی دن تک موضوعِ بحث اور فاضلوں میں باعثِ اختلاف و نزاع بنا رہا۔ جس دن کا حال میں بیان کر رہا ہوں اُس دن ایک فاضل اُلّو، جو حال ہی میں مصر سے طلیطلہ آیا ہے، صندوقچے کے ڈھکنے پر بیٹھا اُس کے کتبے کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی تحقیق سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اس صندوقچے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کا ریشمی قالین رکھا ہوا ہے، جسے بلاشبہ وہ یہودی طلیطلہ لائے تھے جنھوں نے یروشلم کی تباہی کے بعد یہاں آکر پناہ لی تھی۔

اُلّو کی باتیں سُن کر شہزادہ کچھ سوچنے لگا اور بالآخر بولا کہ "مجھے حکیم ابن حبّان سے اس تبرک کا حال معلوم ہوا ہے۔ حکیم کا خیال ہے کہ یروشلم کے سقوط پر یہ طلسمی تبرک کہیں غائب ہوگیا اور انسان اُس کے فیض سے ہمیشہ کے لئے محروم

ہو گیا ـــــــ میرے خیال میں لکڑی کے صندوقچے کا ریشمی قالین وہی بیش بہا تبرک ہے۔ اگر مجھے کسی طرح یہ مل جائے تو میرے دن پھر جائیں۔

اگلے دن شہزادے نے اپنا شاہی خلعت اُتارا اور اُس کے بجائے ایک صحرائی کا لباس پہن لیا۔ پھر اپنے جسم اور چہرے کو گندمی رنگ میں رنگ لیا اور اب کسی کے لئے یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ یہ سیدھا سادا عرب وہی حیرت انگیز اور پُراسرار شخص ہے جس نے چند دن ہوئے بازی گاہ میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہاتھ میں عصا، کندھے پر زنبیل اور ایک چھوٹی سی دیہاتی بانسری لے کر شہزادہ طلیطلہ کی طرف چلا اور شاہی محل کے پھاٹک پر جاکر اعلان کیا کہ میں شاہی منادی سن کر شہزادی کا علاج کرنے آیا ہوں۔ پہرہ داروں نے اُس کی وضع دیکھی تو سوچا کہ اُسے مار کر بھگا دیں۔ پہرہ داروں میں سے ایک اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بولا "جہاں مُلک کے بڑے بڑے حکیموں کی کچھ نہیں چلی وہاں تجھ جیسا گنوار کیا کر سکتا ہے؟" لیکن بادشاہ نے گنوار عرب کی جھلک دیکھ کر اُسے اپنے پاس طلب کیا۔

احمد بادشاہ کے سامنے آیا تو اُس سے یوں مخاطب ہُوا "اے برگزیدہ شہنشاہ! ایک عرب بدّو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اُس کی ساری عُمر صحرا کی تنہائیوں اور ویرانیوں میں بسر ہوئی ہے۔ ان ویران تنہائیوں میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں بھوت پریت ہمیں آکر ستاتے ہیں۔ یہ گندہ رُوحیں ہمارے گلّوں میں گھس کر ہمارے مویشیوں کو یہاں تک کہ اُونٹ جیسے نیک اور حلیم جانور کو بھی پریشان کرتی ہیں۔ ہم گڈریوں کے پاس موسیقی ایسا سحر ہے جس سے ہم اِن پر قابو پاتے ہیں۔ ہمیں اپنے بزرگوں نے موسیقی کی ایسی دُھنیں سکھائی ہیں کہ بڑا سے بڑا بھوت بھی اِن سے مسحور ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اس فن میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اگر آپ کی صاحبزادی پر کسی آسیب یا گندی روح کا سایہ ہے تو میں دعوے کرتا ہوں کہ اپنی موسیقی سے اُسے اپنا گرویدہ بنا لوں گا۔"

بادشاہ دانا بینا تھا اور عربوں کی حیرت انگیز پُراسرار قوتوں کا حال جانتا تھا۔ عرب کی باتوں سے بہت متأثر ہُوا۔ اُس کی باتوں نے اُس کے بجھے ہوئے دل میں اُمید کی لَو روشن کر دی۔ وہ اُسے فوراً بلند بُرج کی تنہائیوں میں لے گیا اور بے شمار دروازوں سے گزرتے ہوئے دونوں اُس تنہا ایوان میں پہنچے جہاں شہزادی ایک ایسے غم میں مبتلا بے حس و حرکت پڑی تھی جس کا بظاہر کوئی مداوا نہ تھا۔

شہزادہ شہ نشین پر بیٹھ گیا اور اپنی بانسری پر وہ دل نواز صحرائی نغمے بجانے لگا جو اُس نے جنت العریف

ہیں ماہر نے نوازدوں سے سیکھے تھے۔ بانسری کے نغمے فضا میں گونجتے رہے لیکن شہزادی ساکت و بے ہوش پڑی رہی۔ جو طبیب و حکیم اُس کے بالیں پر بیٹھے تھے وہ عرب صحرانشین کی احمقانہ کوششوں پر تمسخر کی ہنسی ہنسنے لگے۔ شہزادے نے بانسری کے نغموں کو بے اثر پایا تو اُسے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور بڑے دھیمے سُروں میں بڑی سادگی سے وہ شعر گانے لگا جو اُس نے اپنے نامۂ محبت میں شہزادی کو لکھے تھے۔

شہزادی نے شعروں کی دُھن پہچان لی۔ اُس کے دل میں مسرت کی لہر اُٹھی۔ اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ خاموشی سے شہزادے کا گانا سُننے لگی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی اور اُس کے سینے میں شدتِ احساس سے طوفان برپا ہو گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ اجنبی مغنی کو اپنے قریب بلائے لیکن حیا دامنگیر ہوئی اور وہ خاموش ہو گئی۔ بادشاہ قیافہ شناس تھا۔ اُسے اُس کے دل کا حال معلوم ہو گیا اور اُس نے فوراً احمد کو شہزادی کے ایوان میں طلب کیا۔ محبت کرنے والوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور ایک لمحے میں ہزاروں باتیں ہو گئیں لیکن دونوں نے ضبط اور احتیاط سے کام لیا۔ موسیقی کی تاثیر سے شہزادی کے زرد نازک رخساروں پر سُرخی دوڑ گئی، اُس کے لب شگفتہ ہو گئے اور اُس کی بیمار آنکھوں میں مسرت کا شبنمی نور چمکنے لگا۔

ایوان میں جتنے فاضل حکیم و طبیب موجود تھے، وہ حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ بادشاہ نے پُراسرار مغنی کو ستائش کی ایسی نظروں سے دیکھا جن میں حیرت و ہیبت بھی شامل تھی۔ اُس کی زبان سے بےساختہ نکلا " شاباش! نوجوان! آج سے تم میرے دربار کے طبیبِ اعلیٰ ہو گئے۔ میں آج سے سوائے تمھارے نغمے کے کوئی اور دوا استعمال نہیں کروں گا۔ سردست تم اپنا انعام لو۔ یہ میرے خزانے کا سب سے بیش بہا موتی ہے۔"

احمد نے جواب دیا " بادشاہ سلامت! میرے دل میں چاندی، سونے اور قیمتی جواہرات کی ذرا بھی ہوس نہیں۔ آپ کے خزانے میں ایک تبرک ہے جو اُن مسلمانوں کا ترکہ ہے جو کبھی طلیطلہ پر حکمران تھے —— یہ تبرک صندل کا ایک صندوقچہ ہے، جس میں ایک ریشمی قالین بند ہے۔ مجھے بس یہ صندوقچہ دے دیجیے۔ مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے۔"

حاضرین کو عرب کی سادہ دلی اور انکسار پر سخت حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ اُس وقت جب اُنھوں نے اُس صندوقچے اور اُس کے اندر رکھے ہوئے قالین کو دیکھا۔ قالین بڑے نفیس سُرخ ریشم کا تھا اور

اُس پر عبرانی اور کلدانی حروف میں کچھ عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ درباری طبیبوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اپنے شانوں کو جنبش دی اور دربار کے نئے طبیبِ اعلیٰ کی سادگی پر ہنسنے لگے۔ بھلا اُس کے سوا اور کون سا طبیب اس حقیر انعام پر راضی ہو جاتا۔

شہزادہ بولا کہ "یہ قالین ایک زمانے میں حضرت سلیمانؑ کے تخت پر بچھایا جاتا تھا۔ یہ اس قابل ہے کہ اسے شہزادی کے قدموں کے نیچے بچھایا جائے۔" یہ کہہ کر اُس نے قالین شہزادی کے پیروں تلے ڈال دیا اور خود اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

اپنی جگہ بیٹھ کر اُس نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا "جو کچھ صحیفۂ تقدیر میں لکھا ہے اُسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ نجومیوں نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہو رہی ہے۔ بادشاہ سلامت! آپ کو شاید علم نہیں کہ شہزادی اور میں مدتوں سے درپردہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ میں ہی "زائرِ محبت" ہوں۔"

یہ لفظ ابھی مشکل سے اُس کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ قالین ہوا میں اُٹھا اور شہزادے شہزادی کو لے کر فضا میں پرواز کرنے لگا۔ بادشاہ اور طبیب، پرواز کرتے ہوئے قالین کو حیرت سے تکتے رہے، یہاں تک کہ وہ بادلوں کی سفید چھاتی پر محض ایک دھبا نظر آنے لگا اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ دھبا بھی آسمان کے پردہ نیلگوں میں چھپ گیا۔

بادشاہ نے فوراً اپنے خزانچی کو طلب کیا اور غضب ناک ہو کر اُس سے پوچھا "نادان! تو نے اتنا بیش بہا تبرک ایک کافر کے ہاتھ میں کس طرح جانے دیا؟"

خزانچی نے عاجزی سے جواب دیا "حضور! افسوس ہے کہ ہم اس تبرک کی حقیقت سے ناواقف تھے صندوقچے کا کتبہ آج تک کسی سے پڑھا نہ جا سکا۔ اب پتہ چلا کہ واقعی یہ قالین حضرت سلیمانؑ کے تخت کا قالین ہے اور اس میں یہ طلسمی تاثیر ہے کہ جو کوئی اس پر بیٹھ جائے وہ ہوا کے دوش پر جہاں چاہے جا سکتا ہے۔"

بادشاہ نے فوراً ایک بڑی فوج اکٹھی کی اور مغرور شہزادے کی تلاش میں غرناطہ کی طرف روانہ ہوا۔ طویل اور پُرمشقت مسافت کے بعد وہ غرناطہ کے نواح میں جا کر خیمہ زن ہوا اور شاہِ غرناطہ کے دربار

میں اپنا سفیر بھیج کر اپنی دختر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شاہ غرناطہ اپنے درباریوں سمیت اُس کے استقبال کو شہر سے باہر آیا۔ شاہ طلیلہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شاہ غرناطہ وہی مغنّی ہے جو اُس کی بیٹی کو لے کر فرار ہوا تھا ــــ اس لئے کہ اس دوران میں، احمد غرناطہ کا سلطان بن چکا تھا اور حسین الدیجونداُس کی سلطانہ تھی۔

عیسائی بادشاہ کو یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ اُس کی بیٹی کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت ہے۔ وہ احمد اور الدیجونداکی شادی پر رضامند ہوگیا اور خونیں جنگوں کے بجائے غرناطہ کے محلوں میں دعوتیں ہوئیں، جشن منائے گئے اور اُس کے بعد شاہ طلیلہ ہنسی خوشی اپنے وطن واپس آیا۔ احمد اور الدیجوندا الحمرا میں مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

یہ داستانِ محبت ادھوری رہ جائے گی اگر یہ نہ بتایا جائے کہ احمد الکامل کے دو وفادار دوستوں، یعنی اُلّو اور طوطے کو اُن کی وفاداری کا کیا صلہ ملا۔ یہ دونوں فاضل اور حکیم شہزادے کی سرعت پرواز کا ساتھ نہ دے سکتے تھے اس لئے آہستہ آہستہ اُڑتے ہوئے کچھ عرصے بعد غرناطہ پہنچے۔ اُلّو راتوں کو سفر کرتا اور دن کو اپنے خاندان کے قدیم مقبوضات میں قیام کرتا۔ اس کے برخلاف طوطا دن کو سفر کرتا اور شہروں کی چہل پہل اور گہما گہمی سے پورا لطف اٹھاتا۔

دونوں غرناطہ آگئے تو شہزادے نے اُن کی خدمت کے اعتراف میں اُنھیں اعلیٰ منصبوں پر مامور کیا۔ اُلّو کو اُس نے اپنا وزیرِ اعظم بنایا اور طوطے کو میر تشریفات مقرر کیا۔ یہ بتانا شاید ضروری نہیں کہ دونوں نے اپنے اپنے منصب اِس دانشمندی اور حسن و خوبی سے انجام دیئے کہ شاید ہی کسی سلطنت یا دربار میں یوں انجام دیئے گئے ہوں۔

۱

# ایک پُراسرار ترکہ

قلعۂ الحمرا کے اندر، شاہی قصر کے سامنے ایک فراخ اور کشادہ میدان ہے، جو میدان الاجباب یا حوضوں کا صحن کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ فرشِ صحن کے نیچے حوضوں کا وہ مربوط سلسلہ ہے جو مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پانی جمع کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اِس صحن کے ایک کونے میں مسلمانوں کے عہد کا ایک کنواں ہے، جو پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اِس کنوئیں کا پانی بے حد شفاف اور ٹھنڈا ہے۔ مُور حکمرانوں کے عہد کے بنے ہوئے کنوئیں دُور دُور مشہور ہیں اس لئے کہ وہ شفاف اور شیریں پانی کی تہ تک پہنچنے کے لئے بے حد جانفشانی سے کام لیتے تھے۔ جس کنوئیں کا ذکر ہم کر رہے ہیں وہ غرناطہ بھر میں مشہور ہے اور بھشتی پانی کے بڑے بڑے مٹکے بھرے اور اُنھیں گدھوں پر لادے الحمرا کے جنگلی ڈھلوانوں سے نیچے اُترتے نظر آتے ہیں اور ان کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ صبح سویرے سے شروع ہو کر خاصی رات گئے تک جاری رہتا ہے۔

عہدِ توریت سے گرم ملکوں میں چشمے اور کنوئیں گپ بازی اور لطیفہ سنجی کا اڈا رہے ہیں چنانچہ جس کنوئیں کا حال ہم بیان کر رہے ہیں وہ سارے دن بیماروں، بوڑھی عورتوں اور دوسرے عجیب و غریب قسم کے ناکارہ

لوگوں کی چو پال ہے۔ وہ اُس شامیانے کے سائے میں جو چُنگی کے عملے کو دھوپ سے بچانے کے لئے کنویں پر لگا دیا جاتا ہے، پتھر کی بینچوں پر بیٹھے گپ لڑانے میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ شہر سے آنے والے ہر بھشتی سے وہاں کی خبریں پوچھتے ہیں اور جو کچھ سُنتے اور دیکھتے ہیں اُس پر طولانی تبصرے کرتے ہیں۔ دن کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب گھر والیاں اور خادمائیں سر پر گھڑا رکھے یا ہاتھ میں گگرا پکڑے وہاں منڈلاتی نہ دکھائی دیتی ہوں کہ ہرزہ سرائی کے اِن ماہروں کی گپ شپ کا لُطف اُٹھائیں۔

اس کنویں پر پابندی سے آنے والوں میں ایک توانا مضبوط اور بھری ہوئی پنڈلیوں والا پستہ قد بھشتی بھی تھا جس کا نام پدرو خیل تھا۔ لیکن لوگ اختصار کے خیال سے اُسے پرخیل کہتے تھے۔ پرخیل غالیسیا کا رہنے والا تھا۔ غالیسیا کے باشندے اپنی توانائی اور مضبوطی کی وجہ سے اتنے مشہور ہیں کہ اسپین میں اگر کسی کو مزدور کی ضرورت ہو تو مزدور یا قُلی کہنے کے بجائے یہ کہے گا کہ "ایک غالیسی کو بلاؤ"۔

اس جُملہ معترضہ سے قطع نظر، پرخیل غالیسی نے اپنا پیشہ ایک مٹّی کے گھڑے سے شروع کیا تھا جسے وہ عموماً اپنے کندھے پر لے کر چلا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُسے آسودگی و خوش حالی میسّر آئی تو اُس نے اپنی مدد کے لئے اپنا جیسا بامشقت اور توانا گدھا خرید لیا۔ اس گدھے کی پیٹھ پر پڑی ہوئی جھول کے دونوں طرف وہ پانی سے بھرے ہوئے مٹکے رکھ کر اُنھیں انجیر کے پتّوں سے ڈھک دیتا کہ وہ دھوپ اور گرمی سے محفوظ رہیں۔ غرناطہ بھر میں اُس سے زیادہ محنتی بھشتی اور کوئی نہیں تھا، اور نہ شاید اُس سے زیادہ خوش مزاج اور ہنس مکھ۔ جب پرخیل اپنے لدے پھندے گدھے کو ہانکتا ہوا غرناطہ کی سڑکوں پر سے گزرتا تو راہیں اُس کے مانوس نغمے سے گونج اُٹھتیں، "کسے چاہیئے پانی؟ —— برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی۔ کسے چاہیئے پانی؟ —— الحمرا کے کنویں کا پانی —— برف کی طرح ٹھنڈا اور بلّور کی طرح شفّاف"۔ جب وہ کسی پیاسے گاہک کو ٹھنڈے پانی کا بلوریں گلاس بھر کر دیتا تو کوئی نہ کوئی ایسی بات بھی ضرور کہہ دیتا کہ سُننے والا مُسکرا دے۔ اور اگر اتفاق سے گاہک مرد کے بجائے دلکش چاہِ ذقن والی کوئی حسین دوشیزہ ہوتی تو فقروں میں اور بھی شوخی پیدا ہو جاتی اور اُس کی زبان سے بے ساختہ ایسے کلمے نکل جاتے جن میں اُس کے حُسن کی مدح و ثنا کے پہلو نکلتے۔ مختصر یہ کہ پرخیل غالیسی کو غرناطہ بھر میں بے حد مہذّب، خوش طبع اور خوش باش شخص سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ضروری نہیں کہ دلکش

نغمے گانے والوں اور ہر ایک سے مذاق کرنے والوں کے دل بھی شگفتہ ہوں۔ خوش مزاج برخیل کے اِس تبسّم اور خوش طبعی کے پس پردہ فکروں اور غموں کے بادل منڈلاتے رہتے تھے۔ اُس کا خاندان بہت بڑا تھا جب وہ شام کو گھر لوٹتا تو اُس کے ننگے اور بھوکے بچے ابابیلوں کی طرح اُسے چمٹ جاتے اور اُس سے کھانے کو مانگتے۔ غموں کی زندگی میں اُس کا ایک ساتھی بھی تھا، لیکن ایسا ساتھی جو سہارے کی جگہ اُس کے لئے بوجھ تھا۔ یہ اُس کی بیوی تھی، جسے شادی سے پہلے گاؤں کی حسینہ سمجھا جاتا تھا اور دیکھنے اور سننے والے اُس کے رقص کی گردش اور جھانجھ کی آواز پر صدقے ہوتے تھے۔ شادی ہونے کے کئی سال بعد بھی اُس کے دل رُبا انداز اب تک قائم تھے۔ وہ غریب برخیل کی گاڑھی کمائی اپنے بناؤ سنگار پہ اُڑاتی اور اتوار کے علاوہ چھٹی کے اُن بے شمار دنوں میں جو اسپین والوں کی زندگی میں کاروباری دنوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اُس کے گدھے پر قبضہ کر کے رقص و سرود کی ٹولیوں کے ساتھ دیہاتوں میں چلی جاتی۔ اِن خوبیوں کے علاوہ بھی اُس میں بہت سی خوبیاں تھیں ـــــ وہ پھوہڑ تھی، تن آسان اور آرام طلب تھی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ درجے کی گپ باز اور افواہ پسند بھی تھی: بچوں، گھر کے کام کاج، اور اپنے شوہر کے دکھ سکھ کی طرف سے بے نیاز ہو کر گھر گھر پھرنا اور گپ بازی کرنا اُس کا اہم مشغلہ تھا۔

لیکن غریب برخیل اپنے بیوی بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ اُسی سکون اور اطاعت گزاری سے اُٹھاتا تھا جس طرح اُس کا گدھا پانی کے بھرے ہوئے مشکے۔ وہ تنہائی میں چاہے جتنی جی کی بھڑاس نکال لے لیکن بیوی کے سامنے اُس میں اُسے پھوہڑ کہنے کی جرأت ہرگز نہ تھی۔

وہ اپنے بچوں کو اسی طرح چاہتا تھا جیسے اُلّو اپنے بچوں کو۔ اُسے اپنے بچوں میں اپنی خوبیوں کا عکس زیادہ نمایاں اور زیادہ مستحکم ہوتا نظر آتا۔ وہ سب کے سب اُسی کی طرح توانا، مضبوط اور بھری ہوئی پنڈلیوں کے چھوٹے موٹے پہلوان تھے۔ جب کبھی برخیل کو تھوڑی سی فرصت مل جاتی اور اُس کی جیب میں تھوڑے سے پیسے بھی ہوتے تو وہ اپنے پورے گلّے کو لے کر بساتین الفرج کے باغیچوں کی سیر کرانے لے جاتا ـــــ کوئی اُس کے کندھے پر، کوئی گود میں، کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ برخیل یہ کرتا اور اُس کی بیوی اپنی ٹولی کے ساتھ حدرّت کے علاقے میں رقص و سرود میں مگن رہتی۔

گرمیوں کی ایک رات کا ذکر ہے۔ رات خاصی جا چکی تھی اور اکثر بھشتی اپنے اپنے گھروں کو رخصت

ہو چکے تھے - دن بھر بے حد گرمی اور اُمس رہی تھی - رات اُن گنتی کی خوشگوار چاندنی راتوں میں سے ایک تھی جب ہر ایک کا جی چاہتا ہے کہ دن کی گرمی اور تکلیف کی تلافی کے لئے کھلی ہوا میں سیر کرے اور آدھی رات تک اُس کی نرم مٹھاس کے مزے لیتا رہے - یہی وجہ تھی کہ پانی کے گاہک اب بھی خاصی تعداد میں موجود تھے - برخیل کو ایک ذمہ دار اور جفاکش باپ کی طرح اپنے بھوکے بچوں کا خیال آیا اور اُس نے اپنے دل میں کہا "کنویں کا ایک پھیرا اور! اس طرح شاید بچوں کی اتوار کی تفریح کے لئے چند ٹکے اور مل جائیں" - یہ سوچ کر اُس نے ہمت کے ساتھ الحمرا کی ڈھلوان پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا - وہ اُوپر چڑھ رہا تھا اور گا رہا تھا گاتے گاتے وہ کبھی کبھی اپنا موٹا ڈنڈا گدھے کے دائیں بائیں رسید کر دیتا تھا ——— معلوم نہیں کہ اپنے گانے پر تھاپ دینے کیلئے یا محض گدھے کی تفریح طبع کے لئے، اس لئے کہ اسپین میں سب باربردار جانوروں کے لئے ڈنڈوں کی مار، اچھے چارے کا کام دیتی ہے -

وہ کنویں پر پہنچا تو سوائے ایک اجنبی کے وہاں کوئی نہ تھا - اجنبی نے عربی لباس پہن رکھا تھا اور چاندنی میں پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھا تھا - برخیل رُکا اور اجنبی کو حیرت کی نظر سے دیکھنے لگا - عرب نے کمزور آواز میں اُسے اپنی طرف بلایا اور بولا "میں بیمار اور ضعیف ہوں اور اسی وقت شہر پہنچنا چاہتا ہوں - اگر تم مجھے شہر پہنچا دو تو اُس سے دُگنے پیسے دوں گا جتنے تم پانی لے جا کر کماتے "

اجنبی کی دردناک التجا پر نیک دل برخیل کا جی بھر آیا " خدا نہ کرے کہ ایک بیمار کی خدمت کرنے کی اُجرت لوں" یہ کہا اور بڈھے عرب کو اپنے گدھے پر لاد کر آہستہ آہستہ غرناطہ کا رُخ کیا - عرب اتنا ضعیف و ناتواں تھا کہ اُسے گدھے پر سیدھا بیٹھا رہنے کے لئے بھی برخیل کے سہارے کی ضرورت رہی - برخیل اُسے راستے بھر سنبھالے رہا کہ بے چارہ نیچے نہ گر پڑے -

شہر پہنچ کر برخیل نے اجنبی عرب سے پوچھا کہ "آپ کو کہاں اُتاروں ؟" عرب نے ٹھنڈی سانس بھر کر ناتوانی سے جواب دیا " افسوس ! میرا کوئی گھر در نہیں - میں اس دیار میں بالکل اجنبی ہوں - کیا تم مجھے رات اپنے گھر میں بسر کرنے دو گے - اللہ تمھیں جزائے خیر دے گا "

نیک دل برخیل نے محسوس کیا کہ اُس نے نیکی کر کے اپنے آپ کو ایک اور اُلجھن میں پھنسا لیا ہے لیکن

اُس کی انسانیت نے کسی طرح یہ گوارا نہ کیا کہ ایک پردیسی کو اس بے کسی کی حالت میں رات بھر کی پناہ نہ دے۔ اس لئے وہ عرب کو اپنے گھر لے گیا۔ بچّے جو گدھے کے پیروں کی آہٹ سُن کر حسبِ معمول باہر نکل آئے تھے ایک دستار بند اجنبی کو گدھے پر بیٹھا دیکھ کر ڈر گئے اور فوراً ہی گھر میں جا کر ماں کے پیچھے چھُپ گئے۔ برخیل کی بیوی اُس مُرغی کی طرح جو کُتّے کو اپنے بچّوں کی طرف آتا دیکھ کر اس پر جھپٹتی ہے، تیزی سے باہر نکل آئی اور برخیل پر برس پڑی "آدھی رات کو یہ تُم کس مُردے کو لے کر یہاں آئے ہو؟"

غالیسی نے نرمی سے جواب دیا "بیوی! ذرا صبر سے کام لو۔ یہ ایک بیمار پردیسی ہے، جس کا یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ ٹھہرنے کا ٹھکانا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ہم اِسے جان دینے کے لئے یوں ہی سڑکوں پر پھرنے دیں؟"

ترش رو بیوی شاید اور زیادہ سختی سے احتجاج کرتی لیکن آج برخیل کے رویّے میں خلافِ معمول اعتماد اور استقلال دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ برخیل نے پردیسی عرب کو گدھے پر سے اُتارا اور اُس کے لئے زمین پر ایک چٹائی اور بھیڑ کی کھال بچھا دی کہ اُس کی غریبی اس سے بہتر بستر مہیّا نہیں کر سکتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں عرب پر تشنّج کے دورے پڑنے لگے اور برخیل کی کوئی ترکیب اُن کے زور کو کم نہ کر سکی۔ بیمار اجنبی آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کی نیکی اور خدمت گزاری کا اعتراف کرتا رہا۔ دوروں کے درمیان ذرا سا وقفہ ہوا تو اُس نے نقاہت کے ساتھ برخیل کو اپنے پاس بُلایا اور نحیف و زار آواز میں اُس سے بولا "میرا آخری وقت آپہنچا۔ اِس چھوٹی سی ڈبیا کو میری طرف سے اپنی خدمتوں کا انعام سمجھ کر قبول کرو۔" یہ کہا اور اپنا فرغل کھول کر صندل کی ایک ڈبیا نکالی جو چمڑے کی ایک پیٹی سے اُس کی کمر میں بندھی ہوئی تھی۔

چھوٹے نیک دل برخیل نے جواب دیا، "عزیز دوست! خدا تمھیں برسوں زندہ رکھّے کہ اپنی دولت کو، وہ خواہ کچھ بھی ہو، ہنسی خوشی برت سکو۔" عرب نے مایوسی سے اپنا سر ہلایا۔ صندل کی ڈبیا پر ہاتھ رکھا لیکن ابھی وہ اس ڈبیا کے متعلق کچھ اور نہ کہنے پایا تھا کہ اُس پر پھر دورہ پڑا اور اس مرتبہ اتنا سخت پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

برخیل کی بیوی کو انتقام کا موقع مل گیا۔ اُس نے غصّے سے کہا، "تمھاری احمقانہ نیکی سے ہمیشہ کوئی نہ

کوئی نئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ یہ لاش لوگوں کو ہمارے گھر میں ملے گی تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ ہم قاتل ٹھہریں گے، اور زندگی بھر قید خانے میں سڑیں گے اور اگر ہماری جانیں بچ گئیں تو ساری عمر سرکاری کارندے ہماری گردنیں ناپتے رہیں گے۔"

بے چارہ برخیل بھی کچھ کم پریشان نہ تھا۔ وہ نیکی کر کے پچھتا رہا تھا۔ لیکن اُس کے دل میں تیزی سے ایک خیال آیا۔ اُس نے بیوی سے کہا "ابھی کافی رات باقی ہے۔ میں مُردے کو شہر سے باہر لے جا کر شنیل کے کنارے دفن کر سکتا ہوں۔ کسی نے عرب کو ہمارے گھر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ کسی کو اُس کے مرنے کی بھی خبر نہیں ہوگی۔"

خیال آیا اور اُس پر عمل شروع ہوگیا۔ بیوی کی مدد سے اُس نے بدنصیب عرب کی لاش کو اُسی چٹائی میں لپیٹا جس پر وہ مرا تھا۔ اُسے گدھے پر لادا اور دریا کا رُخ کیا۔ لیکن بدنصیبی ہم رکاب تھی۔ برخیل کے گھر کے بالکل سامنے ایک نائی رہتا تھا۔ اس کا نام پڈریلیو پڈرروگو تھا۔ نائیوں کی پوری باتونی برادری میں شاید ہی کوئی نائی اُس سے زیادہ باتونی، بدباطن اور شریر ہو۔ اُس کا منہ نیولے سے اور ٹانگیں مکڑی کی ٹانگوں سے مشابہ تھیں۔ خوشامد کرنے اور دوسروں کو رُسوا کرنے میں وہ آپ اپنا جواب تھا اور دوسروں کے معاملات کی خبر رکھنے اور اُن میں دخل درمعقولات کرنے میں اشبیلیہ کا معروف نائی بھی اُس کی ہمسری نہ کر سکتا تھا۔ پھر لطف یہ تھا کہ اُس کے دل میں بات اتنی دیر بھی نہ ٹھہرتی تھی جتنی دیر چھلنی میں پانی۔ مشہور تھا کہ یہ نائی سونے میں بھی اپنی ایک آنکھ اور ایک کان کھلا رکھتا ہے کہ جو کچھ دُنیا میں ہو رہا ہے اُسے دیکھتا اور سُنتا رہے۔ حقیقت میں یہ عجیب و غریب نائی غرناطہ کے شہر خبر دلوگوں کے لئے ایک سنسنی خیز اخبار کی حیثیت رکھتا تھا اور اسی لئے اس کی دوکان شہر بھر میں گاہکوں کا سب سے بڑا مرجع تھی۔

دخل درمعقولات کرنے والے نائی کو معلوم تھا کہ برخیل رات کو دیر سے گھر لوٹا تھا اور اُس کی واپسی پر اُس کی بیوی نے چیخ پکار مچائی تھی۔ اپنی جاسوسی کھڑکی میں سے جھانک کر اُس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ نائی کسی عرب کو گدھے سے اُتار کر اپنے گھر میں لے گیا ہے۔ یہ باتیں اتنی عجیب و غریب تھیں کہ اُس رات نائی کی آنکھ ذرا دیر کو بھی نہ لگی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ اپنی کھڑکی میں سے جھانک لیتا کہ شاید کوئی نئی بات نظر آجائے۔ وہ برابر یہ دیکھتا رہا کہ اُس کے غریب ہمسائے کے گھر میں اُس رات خلافِ معمول روشنی رہی اور پھر صبح ہوتے ہوتے یہ

غریب ہمسایہ اپنے گدھے پر کوئی بھاری بوجھ لاد کر دریا کی طرف چلا۔

رازجونائی کے لئے یہ سب باتیں اتنی عجیب تھیں کہ اُس کے دل میں گُدگدی ہونے لگی۔ اُس نے فوراً کپڑے پہنے اور چپکے چپکے بھشتی کے پیچھے ہو لیا۔ اُس نے دیکھا کہ دریا کے کنارے پہنچ کر بھشتی نے گڑھا کھودا اور اُس میں کوئی ایسی چیز دفن کی جو لاش سے ملتی جلتی تھی۔

نائی نے جو نئی نئی باتیں دیکھی تھیں وہ اُس کی نیند اُچاٹ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ واپسی پر گھر جانے کے بجائے وہ اپنی دکان میں چلا گیا اور صبح ہونے تک ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ اور پھر حسبِ معمول اپنی کسبت سنبھال کر سیدھا قاضیِ شہر کی حویلی پر پہنچا۔ قاضی ابھی سو کر اُٹھا تھا۔ نائی نے اُسے کرسی پر بٹھا دیا۔ اُس کے گلے میں کپڑا لپیٹا۔ اُس کی داڑھی کو گرم پانی سے تر کیا اور اپنی ماہرانہ اُنگلیوں سے بالوں کو نرم کرنے لگا۔

پڈرو گو جس نے بیک وقت نائی اور اخبار دونوں کی خدمات اپنے ذمے لے رکھی تھیں، بالوں پر اُنگلیاں پھیرتے پھیرتے بولا "عجیب دُنیا ہے! واقعی کتنی عجیب دُنیا ہے! ڈاکہ، قتل اور دفن، سب کچھ ایک ہی رات میں۔"

قاضی چلّایا "ارے، ہو! تم کیا بک رہے ہو؟"

"جناب!" نائی نے صابن کا ٹکڑا اپنے معزز آسامی کی ناک اور ہونٹوں پر ملتے ہوئے کہا "میں یہ عرض کر رہا تھا ـــــ میں یہ عرض کر رہا تھا جناب! پرخیل غالیبثی نے آج رات ایک عرب مسافر کو لُوٹا، اُسے قتل کیا اور ایک جگہ دفن کر دیا ـــــ رات کی تاریکی بھی جرموں پر کیسا پردہ ڈالتی ہے!"

قاضی نے بگڑ کر سوال کیا "لیکن تمھیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"جناب! ذرا تحمّل فرمائیے! یہ سب باتیں ابھی آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔" نائی نے قاضی کی ناک پکڑ کر اُس کے رُخسار پر اُسترہ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد اُس نے جو کچھ چند گھنٹے پہلے دیکھا تھا، سب شروع سے آخر تک دُہرا دیا۔ زبان اور ہاتھ دونوں ساتھ ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ ہاتھ نے داڑھی مونڈی، اُسے دھویا اور پھر خشک میلے تولیے سے پونچھا۔ زبان عرب مسافر کی لُوٹ، قتل اور دفن کا واقعہ

سُناتی رہی۔

اتفاق کی بات ہے کہ قاضیٔ شہر قرطبہ بھر میں اپنے انتہائی تکبر، سخت گیری اور بے ایمانی کی وجہ سے بے حد بدنام تھا۔ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُس کے نزدیک انصاف کی بڑی اونچی قیمت تھی اور کوئی اُسے سونے کی وزنی تھیلیوں کے بغیر نہیں خرید سکتا تھا۔ نائی کی باتوں سے اُسے یقین ہو گیا کہ یہ واردات لُوٹ اور قتل کی ہے، اور قتل کسی معمولی چیز کے لئے نہیں کیا جاتا۔ لیکن مجرم کو قانون کی مضبوط گرفت میں کس طرح لایا جائے؟ اس لئے کہ مجرم کو پکڑ کر صرف تختۂ دار کو ممنون کیا جا سکتا تھا اور لُوٹی ہوئی دولت پر قبضہ کر کے قاضی کی تجوری بھری جا سکتی تھی ——— اور اُس کے مسلکِ انصاف کے نزدیک دوسرا راستہ عدل کے اعلیٰ مقصد سے قریب تر تھا۔ اس لئے اُس نے فوراً ہی اپنے معتبر ترین برقنداز کو طلب کیا، جس کا دُبلا پتلا اور فاقہ زدہ جسم، اُس زمانے کے سرکاری دستور کے مطابق ایک قدیم وضع کے ہسپانوی لبادے میں ملفوف تھا اور جس کے سر پر ایک چوڑی سی کالے رنگ کی ٹوپی تھی، جس کے کنارے اُوپر سے مُڑے ہوئے تھے۔ ٹانگوں میں ایک کرم خوردہ پاجامہ تھا جس میں سے اُس کا لاغر جسم جھلک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک پتلا سا ڈنڈا تھا، اُس کے عہدے اور منصب کا بھیانک نشان۔ قاضی کا حکم سُنتے ہی یہ کارگزار برقنداز بدنصیب بھشتی کے گھر جا دھمکا اور تھوڑی دیر میں اُسے اور اُس کے گدھے کو قاضی کے عدل و انصاف کے حوالے کر دیا۔

قاضی اپنے چہرے پر خشونت کا حد درجہ بھیانک رنگ چڑھا کر بھشتی پر گرجا "بدنصیب مجرم! کان دھر کر سُن!" قاضی کی گرج سے بے چارے بھشتی کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ قاضی پھر گرجا "کان دھر کر سُن لے! جرم سے انکار کرنا بے سُود ہے۔ مجھے ہر بات معلوم ہے۔ جو جرم تو نے کیا ہے، اُس کا صحیح انعام تختۂ دار ہے لیکن میں رحمدل ہوں اور معقول باتوں کی طرف سے کان بند نہیں کرتا۔ جو آدمی تیرے گھر میں قتل ہوا ہے وہ عرب تھا اور مُسلمان تھا اور ہمارے دین کا دشمن۔ یقیناً تو نے اُسے اپنے مذہبی جوش میں قتل کیا ہے۔ اس لئے میں تیرے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کا جو مال تیرے ہاتھ آیا ہے، وہ میرے حوالے کر دے تو پھر تجھ سے کوئی باز پُرس نہیں ہوگی۔"

غریب بھشتی نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر طرح کی قسمیں کھائیں۔ سب سینٹوں اور ولیوں

کو اپنی معصومیت پر گواہ بنایا۔ لیکن افسوس! اُن میں سے کسی نے وہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ آکر بھشتی کی طرف سے گواہی بھی دیتے تو قاضی اُن کی شہادت پر یقین نہ کرتا۔ بھشتی نے عرب کی موت کا سارا واقعہ بغیر کسی تصنّع کے حرف بہ حرف قاضی کے سامنے بیان کیا لیکن بے سُود۔ قاضی نے اُس سے بہت واضح لفظوں میں پوچھا "کیا تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مقتول عرب کے پاس نہ سونا تھا، نہ جواہرات جو تمھاری حرص کا باعث بنے؟"

بھشتی نے بڑی عاجزی سے گھبرا کر جواب دیا "حضور والا! چونکہ آپ نے مجھے جان کی امان دی ہے اس لئے میں سچ سچ کہتا ہوں کہ عرب سے مجھے صندل کی ایک ڈبیا کے سوا اور کچھ نہیں ملا ــــ اور یہ صندل کی ڈبیا اُس نے مرتے وقت مجھے میری خدمت کے انعام میں دی تھی۔"

"صندل کی ڈبیا! صندل کی ڈبیا!" قاضی نے پھر چیخ کر کہا۔ لیکن ساتھ ہی ایک خیال سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے سوچا "اس ڈبیا میں یقیناً بیش قیمت جواہرات ہوں گے ــــ وہ ڈبیا کہاں ہے؟ کس جگہ چھپائی ہے تو نے؟"

بھشتی نے جواب دیا "جناب! میرے گدھے کی جھول کے ایک کونے میں! وہ ابھی حضور کی خدمت میں حاضر کر سکتا ہوں۔"

برجیل کی زبان سے بمشکل یہ لفظ نکلے تھے کہ پھرتیلا برقنداز جھپٹ کر باہر گیا اور آنکھ جھپکتے صندل کی طلسمی ڈبیا ہاتھ میں لئے آموجود ہُوا۔ قاضی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے کھولا۔ اُسے یقین تھا کہ ڈبیا میں کوئی بیش بہا خزانہ بند ہو گا۔ لیکن ڈبیا کھلی تو اُس میں ایک موم جامے اور موم بتّی کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہ نکلا۔ قاضی کو سخت مایوسی ہوئی۔

کسی آدمی کو مجرم ٹھہرا کر جب کسی نفع کی اُمید باقی نہ رہے تو انصاف کو، اسپین جیسے مُلک میں بھی، غیر جانب دار ہونا پڑتا ہے۔ قاضی مایوسی کے اثر سے سنبھلا تو اُسے یقین کرنا پڑا کہ اس معاملے میں سچ مچ کوئی جان نہیں اور اس لئے اُس نے ٹھنڈے دل سے بھشتی کا بیان سُنا۔ بیوی کے بیان سے اُس کے بیان کی تائید ہوئی۔ قاضی نے اُسے بے گناہ سمجھ کر رہا کر دیا اور صندل کی ڈبیا بھی اُسے لوٹا دی۔ لیکن بھشتی کا گدھا

کورٹ فیس اور ہرجانے کے عوض سرکار کی ملکیت ٹھہرا اور پانی کے مٹکوں کی باربرداری پھر بدنصیب غالیبی کا مقسوم و معمول بن گئی۔ وہ پھر صبح سے شام تک مٹی کا وزنی گھڑا لئے الحمرا کے کنویں کے پھیرے کرنے لگا۔

گرمی کی دوپہروں کو برخیل پہاڑی پر چڑھتا ہونا تو اُس کی معمولی خوش مزاجی کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ ”کُتّے کا پلّا قاضی! ایک غریب کو ایک دوست کی صحبت سے محروم کر دینا جو اُس کی روزی کا ذریعہ اور زندگی کا تنہا ساتھی ہو، کون سی انسانیت ہے؟“ وہ چلّا اُٹھتا۔ اپنی مصیبتوں کے احساس کے ساتھ گدھے کی بے کسی کے تصوّر سے اُس کا جی بھر آتا اور چلّا کر کہتا ”میرے پیارے رفیق! اب میں تجھے کہاں سے پاؤں؟“ اپنے کندھے کا بوجھ اُس نے پتھر پر رکھا اور ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ اُسے پھر ایکا ایکی گدھے کی یاد نے ستایا ”اے میری جان! مجھے یقین ہے کہ تجھے بھی اپنے غریب آقا کی یاد رُلاتی اور ستاتی ہوگی۔ اور اے بیکس رفیق! تجھے ضرور پانی کے وہ مٹکے یاد آتے ہوں گے جن کے بوجھ سے اب میرے کندھے ٹوٹ رہے ہیں۔“

غریب برخیل کے دُکھوں کا خاتمہ یہیں نہیں ہو جاتا تھا۔ اپنی مشقتوں کے بعد جب وہ گھر لوٹتا تو اُس کی بیوی طعنوں سے اُس کا کلیجہ چھلنی کر دیتی۔ وہ بار بار اُس سے کہتی کہ ”میں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ اِس مہمان نوازی سے باز آؤ۔ تم نے میری بات نہ مانی اور اُس کی یہ سزا بھگتی۔“ برخیل کو اُس کی زبان درازیوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا۔ بچّے بھوکے ہوتے یا اُن میں سے کسی کے کپڑے پھٹے ہوتے تو وہ کچوکے دے کر کہتی ”جاؤ! اپنے والدِ محترم کے پاس جاؤ، جو الحمرا کے شہنشاہ کا وارث ہے اور اُس سے کہو کہ شاہی خزانے میں سے تمھیں بھی کچھ دے دے۔“

کسی کو کبھی بھلا نیکی کی اتنی سخت سزا کیوں ملی ہوگی؟ بدنصیب برخیل کے جسم و روح دونوں عذاب میں مبتلا تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی زبان درازیوں کا کوئی جواب نہ دیتا۔ ایک دن جب تھکا ہارا برخیل گھر لوٹا اور اُس کی بیوی نے حسبِ معمول طعنوں سے اُس کا خیر مقدم کیا تو صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اُس نے طعنوں کا جواب طعنوں سے دینے کی جرأت نہیں کی، لیکن اُس کی نظریں صندل کی اُس ڈبیا پر جا کر ٹھہر گئیں جو ایک طاق میں پڑی جیسے اُس کی بیکسی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ اُسے اُٹھا کر اُس نے زور سے زمین پر پٹخا اور چلّا کر کہا ”منحوس تھا وہ دن جب تو میرے ہاتھ آئی اور جب میں نے تیرے آقا کو اپنے گھر میں پناہ دی!

زمین پر گرتے ہی ڈبیا کا ڈھکن کھُل گیا اور موم جامہ باہر نکل کر گر پڑا۔ لپیٹے ہوئے موم جامے کو دیکھ کر اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا "کسے خبر ہے کہ موم جامے پر لکھے ہوئے حروف کی کوئی اہمیت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عرب اس ڈبیا کی اتنی حفاظت ہرگز نہ کرتا۔" یہ خیال آتے ہی اُس نے ڈبیا اُٹھائی اور اُسے اپنے لبادے میں چھپا لیا۔

اگلے دن جب وہ پانی کا گھڑا لئے بازار سقاطین میں سے گزر رہا تھا تو طنجہ کے ایک مسلمان عطّار کی دکان کے سامنے ٹھہر گیا اور اُسے موم جامہ دکھا کر اُس کی عبارت کا مطلب پوچھا۔

عطّار نے عبارت کو غور سے پڑھا، اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسکرایا اور کہنے لگا "اس موم جامے پر کسی پوشیدہ طلسمی خزانے کا حال لکھا ہوا ہے۔"

یونا غالیسی یہ بات سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا "مجھے اس طلسمی خزانے سے کیا غرض؟ میں کوئی ساحر تو ہوں نہیں جو دفینوں پر قبضہ کر سکوں۔" یہ کہا اور پانی کا گھڑا کندھے پر رکھ کر اپنی پھیری پر چل پڑا۔

لیکن اُس شام جب وہ الحمرا کے کنوئیں کی جگت پر بیٹھا سستا رہا تھا کچھ گپ بازوں کی مجلس گرم ہو گئی اور باتوں باتوں میں مافوق الفطرت طلسمی افسانے بیان ہونے شروع ہو گئے۔ گپ بازوں میں سے ہر ایک مفلس و نادار تھا اس لئے گھوم پھر کر وہ طلسمی خزانے گفتگو کا موضوع بن گئے جو مسلمان بادشاہوں نے الحمرا کے مختلف حصّوں میں اور سات تہہ خانوں والے بُرج میں دفن کئے تھے۔"

طلسمی خزانوں کی ان داستانوں کے ذکر نے آج نیک دل برجیل کے دل پر بڑا اثر کیا اور جب وہ الحمرا کے اندھیرے کنجوں میں ہوتا ہوا اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا تو تصوّر ہی تصوّر میں ان طلسمی خزانوں کی سیر کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا "سات تہ خانوں والے بُرج کے نیچے خزانہ چھپا ہوا ہے ممکن ہے اُس کا بھید مجھے اُس موم جامے کے ذریعہ معلوم ہو جائے جو میں نے طنجہ کے عطّار کے پاس چھوڑ دیا ہے۔" اس تصوّر کی خوشی میں پانی کا گھڑا گرتے گرتے بچا۔

اُس رات وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور اُن خیالات نے جو اُسے سارے دن ستاتے رہے تھے ایک لمحے کے لئے بھی اُس کی آنکھ نہ جھپکنے دی۔ صبح ہوتے ہی وہ سیدھا عطّار کی دکان کی طرف دوڑا اور اُس سے اپنے دل کی حالت بیان کی۔ اُس نے عطّار سے کہا کہ "تم عربی پڑھ سکتے ہو۔ آؤ ہم تم دونوں الحمرا کے بُرج کے نیچے

چلیں اور موم جامے پر لکھے ہوئے طلسم کو آزما کر دیکھیں۔ اگر یہ طلسم بے اثر رہا تو ہماری قسمت! ہم سے ہمارا کچھ چھن نہیں جائے گا۔ اور اگر خوش قسمتی سے ہم کامیاب ہوئے تو خزانے میں دونوں کا آدھا ساجھا۔"

عطار برخیل کی باتیں سن کر مسکرایا اور کہنے لگا "میرے بھولے دوست! صرف موم جامے پر لکھی ہوئی عبارت ہی کافی نہیں۔ اسے آدھی رات کو ایک خاص طرح کی شمع کی روشنی میں پڑھا جا سکتا ہے اور وہ شمع ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اور اس لئے میرے دوست! اس شمع کے بغیر یہ موم جامہ ہمارے لئے بیکار ہے۔"

"ٹھہرو" غالیسی چلّایا "میرے پاس ایسی موم بتّی موجود ہے جیسی تم چاہتے ہو"۔ یہ کہتے ہی برخیل گھر کی طرف بھاگا اور چند منٹ میں وہ موم بتّی لے کر واپس آگیا جو اسے صندل کی ڈبیا میں ملی تھی۔ عطار نے اسے ہاتھ میں لے کر سونگھا اور بولا "یہ موم بتّی نایاب اور بیش قیمت مسالوں سے بنائی گئی ہے۔ موم جامے کی عبارت میں اسی طرح کی موم بتّی کا ذکر ہے۔ جب تک یہ بتّی جلتی رہتی ہے سنگین اور آہنی دیواریں اور پوشیدہ غار کھلے رہتے ہیں اور جو کوئی اس کے بجھنے کے بعد بھی غار کے اندر ہی رہے بس اس کی موت ہے۔ وہ کبھی وہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔"

دونوں نے طے کیا کہ طلسم کی تاثیر کی آزمائش اسی رات کو کریں گے۔ اس لئے رات کے سنّاٹے میں جب فضا میں الّوؤں اور چمگادڑوں کے پروں کی سنسناہٹ کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں تھی وہ الحمرا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور گھنے درختوں میں سے گزر نے اس ہیبت ناک برج تک پہنچ گئے جس کا ذکر وہ داستانوں اور افسانوں میں بارہا سن چکے تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ گھنی جھاڑیوں میں الجھتے، پتھریلی زمین سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے برج کے نچلے محراب کے دروازے پر پہنچ گئے۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے انھوں نے وہ زینہ طے کیا جو چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس زینے نے انھیں ایک خالی تہہ خانے میں پہنچا دیا۔ اس تاریک اور مرطوب تہہ خانے میں انھیں ایک اور زینہ ملا جس سے اتر کر وہ ایک اور تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ اس طرح انھوں نے یکے بعد دیگرے چار زینے طے کئے اور ایک تہ خانے کے بعد دوسرے میں ہوتے ہوئے آخری تہ خانے میں پہنچ گئے۔ اس تہ خانے کا فرش پختہ اور ٹھوس تھا۔ عام طور سے سمجھا جاتا تھا کہ برج کے نیچے سات تہ خانے ہیں لیکن روایتی افسانوں نے یہ بات بھی مشہور کر رکھی تھی کہ آخری تین تہ خانوں پر طلسم کا اثر ہے اس لئے کوئی آدمی ان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ چوتھے تہ خانے کی ہوا میں بے حد نمی اور خنکی تھی اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ

مٹی کی سوندھی بُو ناک میں جاتی تھی۔ اس تہ خانے میں روشنی نام کو نہ تھی۔ عطّار اور برخیل کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے رہے کہ الحمرا کے گھنٹے میں بارہ بجنے کی آواز آہستہ آہستہ اُن کے کانوں میں گونجی۔ گھنٹے کی آواز سُنتے ہی اُنھوں نے موم بتّی روشن کی اور تہ خانے میں ایک عجیب و غریب خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔

موم بتّی کی روشنی میں عطّار جلدی جلدی موم جامے کی عبارت پڑھنے لگا۔ عبارت ختم ہوتے ہی تہ خانے میں بادل کی سی گرج پیدا ہوئی۔ ایک زلزلہ سا آیا اور جس فرش پر وہ کھڑے تھے اُس کے ایک طرف روشنی میں اُنھیں ایک اور زینہ دکھائی دیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ اس زینے سے اُترے اور لالٹین کی بے جان روشنی کے سہارے ایک اور تہ خانے میں پہنچ گئے جس کی دیواروں پر ہر طرف عربی عبارتیں کندہ تھیں۔ تہ خانے کے بیچ میں ایک بہت بڑا صندوق رکھا تھا جو لوہے کی سات مضبوط پیٹیوں سے جکڑا ہُوا تھا۔ صندوق کے دونوں طرف ایک ایک مسلّح طلسمی پہرہ دار کھڑا تھا، لیکن طلسم کے اثر سے بُت کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت۔ آہنی صندوق کے سامنے بہت سے مٹکے رکھے تھے جو سونے چاندی کے سکّوں اور بیش قیمت جواہرات سے لبریز تھے۔ دونوں نے اِن مٹکوں میں سے ایک میں ہاتھ ڈالا تو کہنیوں تک وہ زرد چمکیلے طلائی سکّوں میں ڈوب گئے۔ طلائی سکّوں کے بیچ بیچ میں اُنھیں کوئی طوق، کوئی کنگن، کوئی ہار زنجیر تا نظر آجاتا۔ دونوں اپنی جیبیں طلائی سکّوں اور بیش بہا گہنوں سے بھرتے رہے —— لیکن وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اور کبھی کبھی پہرداروں کے مجسّموں پر ایک نظر ڈال لیتے تھے، جو اُسی طرح ساکت و بے حس و حرکت کھڑے برابر اِن دونوں کو گھور رہے تھے۔ بالآخر اُن کے دلوں پر ایسا خوف طاری ہُوا کہ دونوں تہ خانے میں سے نکل کر بھاگے اور ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اُوپر والے تہ خانے میں جاکر دم لیا۔ موم بتّی بجھادی گئی اور زینے کا دروازہ بادل کی گرج کے ساتھ بند ہوگیا۔

دونوں پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ جب تک وہ چاروں تہ خانوں میں سے نکل کر باہر نہ آگئے اور درختوں میں سے چھن چھن کر آنے والی ستاروں کی روشنی نہ دیکھ لی اُن کا سانس دھونکنی کی طرح چلتا رہا۔ دم لینے کے لئے وہ گھاس پر بیٹھ گئے اور خدا کی دی ہوئی اِس غیر متوقع نعمت کو آپس میں بانٹ لیا۔ طلسمی خزانے کو کسی اور رات کھنگالنے کی نیّت کر کے وہ وہاں سے رخصت ہوئے، اور صندل کی ڈبیا والے طلسم کی تقسیم

اس طرح کی کہ ایک نے موم جامہ رکھا اور دوسرے نے موم بتی۔ اُن کے جی ہلکے تھے اور جیبیں بھاری اور وہ جیسے ہوا کے دوش پر غرناطہ کی طرف اُڑے چلے جا رہے تھے۔

پہاڑی سے نیچے اُترتے ہوئے سمجھ دار عطّار نے سادہ لوح بہشتی کے کان میں چپکے سے ایک بات کہی "عزیز دوست! یاد رکھو کہ جب تک ہم پورے خزانے پر قابض نہ ہو جائیں اور اُسے کسی محفوظ جگہ نہ پہنچا دیں اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اگر قاضی نے اس کی بھنک بھی سن لی تو سمجھ لو کہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے!"

غالیسی نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا "بے شک! تم سچ کہہ رہے ہو۔"

عطّار نے پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا "میرے دوست! تم یقیناً دانا و بینا ہو اور یقیناً راز کو اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکتے ہو۔ لیکن تمھارے بیوی بھی تو ہے۔"

"اُسے میں اس بھید کی ہوا بھی نہ لگنے دوں گا۔" برخیل نے اعتماد سے جواب دیا۔

"مجھے تمھاری دوراندیشی اور وعدے پر بھروسا ہے" عطّار نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

بھولے بھالے برخیل نے وعدہ تو واقعی بڑے خلوص اور یقین سے کیا تھا لیکن افسوس! بھلا کون ہے جو اپنے راز بیوی سے پوشیدہ رکھ سکے؟ کم از کم برخیل جیسے آدمی تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، جو اپنی بیوی کو اُس کی برائیوں کے باوجود چاہتے بھی ہوں۔ وہ گھر لوٹا تو اُس کی بیوی ایک طرف کو اداس بیٹھی تھی۔ اُس کے گھر میں گھستے ہی وہ اُس پر گرجی "بہت خوب! تم آخر اتنی رات گئے تک آوارہ گردی کرنے کے بعد گھر آ ہی گئے۔ تعجب ہے کہ آج تمھارے ساتھ کوئی عرب مہمان نہیں ہے۔" یہ کہا اور زار و قطار رونے لگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس نے اپنا سینہ بھی پیٹنا شروع کر دیا "کتنی بدنصیب عورت ہوں میں بھی؟ آخر میرا کیا حشر ہوگا؟ میرے گھر کو سرکاری برقنداز اور وکیل لوٹنے پر تلے ہوئے ہیں اور میرا ناکارہ شوہر بچوں کے کھانے پینے کی فکر کرنے کے بجائے دن رات بے دین عربوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ ہائے میرے بچے! اُن کا کیا انجام ہوگا آخر؟ ہمیں اب سڑکوں پر پھر کر بھیک مانگنی پڑے گی!"

اپنی بیوی کے بین سن کر سیدھے سادے برخیل کے دل پر چوٹ لگی۔ اُس کا جی بھر آیا اور وہ بھی اُس کے ساتھ رونے لگا۔ اس وقت اُس کے دل کی طرح اُس کی جیبیں بھی بھری ہوئی تھیں اور برخیل کے لئے

ضبط ناممکن تھا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سونے کے تین چار وزنی سکّے نکال کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ غریب عورت حیرت زدہ رہ گئی اور سونے کی اس غیر متوقع جھنکار کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ قبل اس کے وہ اپنی حیرت پر قابو پاسکے برخیل نے سونے کی ایک زنجیر نکال کر اُس کی آنکھوں کے سامنے نچانی شروع کر دی۔ وہ زنجیر کو نچا رہا تھا اور خوشی سے اُس کا دہانہ اتنا کھُل گیا تھا کہ اُس کے گوشے اُس کے کانوں سے جا ملے تھے۔

بیوی اب تک خاموش بیٹھی تھی۔ لیکن اب ضبط نہ کر سکی اور خوف زدہ ہو کر کہنے لگی "معصوم مریم ہماری حفاظت کرے۔ برخیل تم آخر کیا کرتے رہے ہو؟ یقیناً تم نے کسی کو قتل کر کے اسے لوٹا نہیں ہے؟" اُس کے دل میں ڈاکے اور قتل کا وہم پیدا ہوا اور اُس نے فوراً یقین کی صورت اختیار کر لی۔ قید خانے کی سلاخیں اور پھانسی کا تختہ اُس کی نظروں میں پھر گیا اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے پستہ قد شوہر کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑا ہوا ہے۔ تصور کی بنائی ہوئی اس بھیانک تصویر سے وہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اُس پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔

غریب برخیل کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے اور اپنی بیوی کا وہم دُور کر کے اُسے کس طرح اطمینان دلائے سوائے اس کے کہ اپنی خوش نصیبی کا سارا افسانہ اُسے سُنا دے۔ لیکن نہ خانوں والے خزانے کا حال بتانے سے پہلے اُس نے بیوی سے قسمیں اور وعدے لے لئے کہ یہ بھید کسی اور پر ظاہر نہیں کرے گی۔

بیوی کو یہ روداد سُن کر جتنی خوشی ہوئی اُس کا اندازہ ناممکن ہے۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے شوہر کی گردن میں حمائل کر دیئے اور اُسے اتنے زور زور سے بھینچا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ نیک دل بھشتی نے خوشی سے دیوانہ ہو کر بیوی سے پوچھا "بتاؤ! اب صندل کی ڈبیا کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ دیکھو، آئندہ کبھی کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے پر مجھے بُرا بھلا مت کہنا۔"

نیک دل برخیل چٹائی پر لیٹ کر سو گیا اور یہاں اُسے اتنا آرام ملا جتنا شاید سمور و سنجاف پر بھی نہ ملتا۔ برخیل تو سو گیا اور اُس کی بیوی نے یہ کیا کہ اُس کی جیبیں خالی کر کے سونے کے چمکدار سکّے اور جواہرات کے زیور چٹائی پر پھیلا کر انھیں گننا شروع کر دیا۔ وہ بُندے، ہار اور کنگن پہن کر آئینے کے سامنے جاتی اور یہ دیکھ کر

خوشی سے پھولی نہ سمائی کہ جب وہ اِن زیوروں کو آزادی سے پہن سکے گی تو کتنی حسین لگے گی۔

اگلے دن نیک دل غالیبیا نے ایک سونے کا سکّہ لیا اور بازار سقاطین میں ایک جوہری کے ہاتھ بیچنے لے گیا۔ جوہری جانتا تھا کہ سکّہ خالص سونے کا ہے، لیکن اُس نے غالیبیا کو اُس کی ایک تہائی قیمت دی اور اُس نے وہی خوشی خوشی قبول کر لی۔ روپے ملے تو غالیبیا نے اپنے بچّوں کے لئے کپڑے اور اچھے اچھے کھلونے خریدے اور بازار سے مزے مزے کے کھانے لے کر گھر آگیا۔ باپ گھر میں لدا پھندا آیا تو بچّوں نے اُسے گھیر لیا اور ناچ ناچ کر تالیاں بجانے لگے۔ بچّوں کی خوشی دیکھ کر غالیبیا کا دل بھی خوشی سے رقص کرنے لگا۔

غالیبیا کی بیوی نے پردہ داری کا وعدہ حیرت انگیز طریقے سے نباہا۔ ایک دن اور رات اپنے چہرے پر رازداری اور اسرار کا پردہ ڈالے وہ اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ اُس کے سینے میں جو حیرت انگیز راز پوشیدہ تھا اُس سے اُس کا سینہ پھٹا جارہا تھا لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور عورتوں کی مجلس میں بھی لب پر سکوت کی مُہر لگائے رکھّی۔ یہ صحیح ہے کہ اُس نے باتوں باتوں میں تھوڑی بہت شیخی بگھاری اور پُرانا لباس پہننے پر عذر کرتے ہوئے اپنی ہم نشینوں کو یہ خبر سُنائی کہ اُس نے اپنے لئے زردوزی کے کام کا ایک نیا جوڑا بنوایا ہے اُس نے اشاروں اشاروں میں یہ بات بھی جتا دی کہ اُس کا شوہر صحت کی خرابی کی وجہ سے بھشتی کا پیشہ چھوڑنے والا ہے۔ پھر اُس نے یہ کہنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا کہ گرمیاں گزارنے کے لئے وہ جنوبی علاقے میں چلے جائیں گے تاکہ بچّوں کو صحت مند ہوائیں رہنے کا موقع ملے اور وہ شہر کی سڑتی گرمی سے محفوظ رہ سکیں۔

محلّے کی عورتیں یہ باتیں سُنتیں تو حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تکتیں اور سوچتیں کہ شاید بھشتی کی بیوی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ جب اِن عورتوں کے پاس سے اُٹھ کر چلی جاتی تو سب مل کر اُس کی شیخی خوری کا مذاق اُڑاتیں اور ہنستی رہتیں۔ غریب بھشتن کی باتیں محلّے والیوں کے لئے تفریح کا مستقل موضوع بن گئیں۔

گھر سے باہر وہ جس ضبط سے کام لیتی تھی اُس سے سچ مچ جیسے اُس کا پیٹ پھولنے لگتا تھا۔ اس لئے وہ گھر میں اس ضبط و صبر کی پوری تلافی کر لیتی تھی۔ وہ قیمتی موتیوں کا ہار اپنے گلے میں ڈالتی، جڑاؤ کنگن ہاتھوں میں پہنتی اور ہیرے کا جھومر سر پر رکھ کر، اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں، کمرے کے اندر اترا اترا کر چلتی رہتی اور تھوڑی

تھوڑی دیر بعد اپنے ٹوٹے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حُسن و جمال پر آپ ہی خوش ہو لیتی۔ لیکن اپنے غرور کی سادگی میں ایک دن ضبط کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ دوسروں پر اُس کے بناؤ سنگار کا کیا اثر پڑتا ہے گھر کی کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی کہ راہ گیر اُسے دیکھ سکیں۔

اتفاق کی بات پیڈرلو پیڈرگو یعنی دخل در معقولات کرنے والا نائی اُس وقت اپنی دُکان میں بیکار بیٹھا تھا۔ لیکن اس بیکاری کی حالت میں بھی اُس کی آنکھیں اپنے کام سے غافل نہیں تھیں۔ اُنھیں سامنے کی کھڑکی میں ہیرے کی چمک نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اپنے ہمسائے کی بیوی کو غور سے دیکھنے کے لئے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُسے دُلہنوں کی طرح سجا بنا دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ گہنوں کی چمک دمک نے اُس کے سینے میں آگ بھڑکا دی۔ وہ اس آگ کو بجھانے کے لئے سیدھا قاضی کی حویلی کی طرف دوڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں دُبلا پتلا اور حریص برقنداز سقّے کے دروازے پر آ دھمکا، اور شام ہونے سے پہلے بدنصیب پرخیل کو پھر قاضی کے رُو برو پیش کر دیا گیا۔

قاضی نے غضب ناک ہو کر پوچھا "بدمعاش! یہ کیا حرکت ہے؟ تو نے مجھ سے کہا تھا کہ جو غریب تیرے گھر میں مرا اُس نے سوائے ایک صندل کی ڈبیا کے اور کچھ نہیں چھوڑا اور اب تیری بیوی اپنے پھٹے پُرانے چیتھڑوں پر ہیرے اور موتی پہنے اتراتی پھرتی ہے۔ اب تیری حرامزدگی کی سزا یہ ہے کہ جو دولت تُو نے غریب غرب کو قتل کر کے جمع کی ہے وہ سرکاری خزانے میں داخل کر اور خود تختۂ دار پر چڑھنے کے لئے تیار ہو جا جو تیرا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہے!"

خوف زدہ بہشتی قاضی کے پیروں پر گر پڑا اور شروع سے آخر تک بے کم و کاست تہ خانوں والے خزانے کی داستان سُنا دی۔ قاضی، برقنداز اور متجسس نائی للچا للچا کر مسلمانوں کے شاہی خزانے کی داستان سُنتے رہے۔ برقنداز کو فوراً عطار کی طلبی کے لئے بھیجا گیا۔ وہ بے چارہ بھی قانون کے شکنجے میں پھنس کر ہانپتا کانپتا قاضی کے رو برو حاضر ہوا۔ جب اُس نے بہشتی کو وہاں مُنہ لٹکائے کھڑا دیکھا تو معاملے کی تہہ کو پہنچ گیا۔ اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ بڑبڑایا "بدنصیب شخص! میں نے اسی دن کے لئے تجھے منع کیا تھا کہ اپنی بیوی کے سامنے زبان مت کھولنا!"

عطّار کے بیان سے بھی لفظ بہ لفظ بھشتی کے بیان کی تائید ہوئی۔ لیکن قاضی یہی ظاہر کرتا رہا کہ اُسے دونوں کی بات کا یقین نہیں آیا اور اس لیے پوری تحقیقات اور سخت سزا کی دھمکیاں دیتا رہا۔

"حضور والا!" عطّار نے، جس کے حواس اب بجا ہو چکے تھے، اپنی ذکاوت سے کام لیتے ہوئے قاضی سے عرض کیا "ذرا تحمّل اور مصلحت سے کام لیجئے۔ قسمت نے ہم سے جو فیاضی کی ہے، لڑ جھگڑ کر ہمیں اُس پر ناشکری نہیں کرنی چاہیئے۔ اس خزانے کا علم ہم لوگوں کے سوا کسی کو نہیں۔ ہم چاہیں تو اس راز کو پوشیدہ رکھ سکتے ہیں۔ تہ خانے میں اتنی دولت ہے کہ ہم سب کو دولت مند بنا سکتی ہے۔ اگر آپ منصفانہ تقسیم کا وعدہ فرمائیں تو خزانے کا دروازہ آپ پر کھلا ہوا ہے۔ اگر آپ کی طرف سے انکار ہو تو تہ خانہ ہمیشہ بند رہے گا۔"

قاضی نے تنہائی میں برقنداز سے مشورہ کیا۔ وہ اپنے فن کا بڑا ناشاطر تھا، اُسی طرح کا جواب دیا۔ "جب تک آپ کو خزانہ نہ مل جائے، جو وعدہ چاہیئے کر لیجئے۔ خزانہ آپ کے سامنے آجائے تو اس پر قبضہ کر لیجئے۔ اگر یہ دونوں ذرا بھی چون و چرا کریں تو اُنھیں کفر و ساحری کا مجرم ٹھہرا کر سخت تعزیر کی دھمکی دیجئے۔"

قاضی کو مشورہ پسند آیا۔ اُس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور عطّار سے یوں مخاطب ہوا "جو داستان تم دونوں نے سنائی ہے وہ بڑی عجیب و غریب ہے۔ ممکن ہے یہ سچ ہو لیکن جب تک یہ باتیں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں مجھے یقین نہیں آسکتا۔ اس لیے جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہ آج رات کو میرے سامنے کرو۔ اگر جیسا کہ تمھارا بیان ہے تہ خانے میں سے خزانہ نکلا تو اُسے ہم مل جُل کر تقسیم کر لیں گے اور اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن یاد رکھو! اگر یہ باتیں غلط نکلیں تو مجھ سے کسی رعایت اور مروّت کی اُمید ہرگز مت رکھنا۔ اور اس وقت تم دونوں حراست میں ہو۔"

بھشتی اور عطّار اِن شرائط پر خوشی سے راضی ہو گئے اس لیے کہ اُنھیں اپنی صداقت پر پورا یقین تھا۔

آدھی رات کے قریب قاضی، برقنداز اور نائی پوری طرح مسلّح ہو کر نکلے۔ عطّار اور بھشتی مجرموں کی طرح آگے آگے چلے۔ اس قافلے میں بھشتی کے گدھے کا اضافہ اس لیے کر لیا گیا کہ خزانہ لاد کر لانے میں آسانی ہو۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے بُرج کے قریب پہنچے۔ گدھے کو انجیر کے ایک درخت سے باندھ دیا اور تھوڑی دیر میں چوتھے تہ خانے میں پہنچ گئے۔

موم جامہ کھولا گیا، شمع روشن کی گئی اور عطّار نے موم جامے کی عبارت پڑھی۔ زمین میں ایک زلزلہ سا پیدا ہُوا، بادل کی گرج کے ساتھ فرش میں ایک شگاف ہو گیا اور نچلے تہ خانے کا زینہ نظر آنے لگا۔ قاضی، برقنداز اور نائی پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہے اور عطّار اور بہشتی پانچویں تہ خانے میں اُتر گئے۔ عرب پہرہ دار، اب بھی ساکت و صامت کھڑے خزانے کی نگرانی کر رہے تھے۔ دونوں نے اشرفیوں، موتیوں اور قیمتی جواہرات کے دو مٹکے اُٹھائے۔ بہشتی ایک ایک کر کے اُنھیں باہر لایا۔ راستے میں اُن کے بوجھ سے اُس کے قدم کئی جگہ لڑکھڑائے۔ بالآخر مٹکے گدھے پر لاد دیئے گئے۔

عطّار نے قاضی سے کہا "اتنا مال ہم سب کو امیر بنانے کے لئے کافی ہے اور اسے ہم بغیر کسی کو شبہ میں ڈالے آسانی سے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔"

قاضی نے عطّار سے پوچھا "کیا تہ خانے میں ابھی اور خزانہ ہے؟"

"یقیناً" عطّار نے جواب دیا "ابھی تو تہ خانے میں لوہے کا ایک بہت بڑا صندوق ہے جو لبالب جواہرات سے پُر ہے۔"

قاضی کے مُنہ میں پانی بھر آیا اُس نے بے تابی سے کہا "تو ہمیں وہ صندوق بھی ابھی اپنے ساتھ لے چلنا چاہیئے۔"

عطّار نے استقلال کے ساتھ جواب دیا "میں اب تہ خانے میں ہرگز نہیں اُتروں گا۔ اس وقت ہمارے پاس جتنا مال ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہے اور اس سے زیادہ کی ہوس خام خیالی ہے۔"

بہشتی نے عطّار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "اب میں بھی کسی قیمت پہ اندر جانے کو تیار نہیں ہوں۔ اور پھر میرے گدھے میں بھی اس سے زیادہ بوجھ اُٹھانے کی سکت نہیں۔"

قاضی کے حکم اُس کی دھمکیاں اور التجائیں سب بے اثر اور بے سُود ثابت ہوئیں تو اُس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا "صندوق نکالنے میں میری مدد کرو۔ اُس میں جو کچھ نکلے گا وہ ہم تینوں آپس میں تقسیم کر لیں گے۔" یہ کہا اور تہ خانے میں اُتر گیا۔ برقنداز اور نائی بھی بادلِ ناخواستہ لرزتے کانپتے اُس کے پیچھے ہو لئے۔

جب عطّار نے دیکھا کہ تینوں نچلے تہ خانے میں اپنے کام میں منہمک ہیں تو اُس نے موم بتی بجھا دی۔ اُس کے

بجھتے ہی بادل گرجا، تہ خانہ بند ہو گیا۔ اور تینوں "مقتدر بزرگ" جیتے جی تہ خانے کے مزار میں دفن ہو گئے۔

اس کے بعد وہ چاروں تہ خانے طے کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل آیا۔ بھشتی کی چھوٹی ٹانگوں نے بھی جس حد تک اس کا ساتھ دیا وہ بھی اُسی تیزی سے باہر نکل آیا۔

دونوں دم لینے کے لئے تازہ ہوا میں بیٹھ گئے۔ جب سانس ٹھہری تو برخیل نے گھبرا کر عطار سے پوچھا "یہ تم نے کیا کیا؟ اُن دونوں کو تہ خانے میں کیوں بند کر دیا؟"

عطار نے یقین اور اعتماد کے لہجے میں جواب دیا "اللہ کی مرضی یہی تھی"۔

"تو کیا اب تم انھیں باہر نہیں نکالو گے؟" بھشتی نے اور زیادہ گھبرا کر سوال کیا۔

"خدا نہ کرے!" عطار نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا "حقیقۃً تقدیر میں لکھا ہوا ہے کہ جب تک کوئی اور آدمی آ کر انھیں طلسم سے رہائی نہ دلائے وہ وہیں قید رہیں گے۔ غرض جو اللہ کی مرضی ہوگی وہ ہو گا"۔ یہ کہا اور موم بتی کا بچا ہوا ٹکڑا پہاڑ کی گھنی جھاڑیوں میں دُور پھینک دیا۔

حریص قاضی اور اُس کے ساتھیوں کو قسمت کے حوالے کر کے عطار اور بھشتی جواہرات سے لدے پھندے گدھے کو ہانکتے ہوئے شہر کی طرف چل دیئے۔ لیکن چلنے سے پہلے نیک دل برخیل نے اپنے چہیتے گدھے کو گلے لگایا اور اُسے خوب جی بھر کے پیار کیا۔ بھشتی کی خوشی کی اس وقت حد نہ تھی اور اُسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ یہ خوشی خزانہ ملنے کی تھی یا اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کے ملنے کی"۔

خوش نصیبی کے اِن دونوں حصہ داروں نے خدا کی دی ہوئی دولت کو انصاف اور دوست داری کے ساتھ تقسیم کر لیا ــــ سوائے اس کے کہ عطار کو جواہرات اور موتیوں کا تھوڑا سا ذوق تھا اس لئے تقسیم کے وقت منتخب موتی اور جواہرات اُس نے اپنے حصے میں رکھے اور ٹھوس طلائی زیورات بھشتی کو دیئے اور دونوں اس تقسیم سے مطمئن اور خوش تھے۔ دولت پر قابض ہونے کے بعد انھوں نے یہ دانش مندی کی کہ غرناطہ کو چھوڑ کر جہاں حوادث کا زیادہ اندیشہ اور امکان تھا، دُور دُور کی سرزمینوں میں جا بسے کہ وہاں اس دولت کو زیادہ سکون اور اطمینان سے صرف کر سکیں۔ عطار افریقہ جا کر اپنے وطن طنجہ میں رہنے لگا اور بھشتی اپنے خاندان سمیت جس میں اُس کا گدھا بھی شامل تھا، پرتگال جا کر وہیں بس گیا اور یہاں اپنی زمانہ شناس بیوی کے مشورے اور ہدایت میں معاشرے میں

باحیثیت جگہ بنالی۔ اُس کی بیوی نے اُس کے لباس کی طرف خاص توجہ کی۔ چھوٹی چھوٹی ٹانگوں میں موزے، جسم پر چُست صدری، سر پر پر دار ہیٹ اور پہلو میں تلوار، یہ تھی اُس کی نئی وضع —— اور اس شاندار وضع کی مناسبت سے دان بدروخیل اُس کا نیا نام۔ اُس کے بچّوں کی ننھی مُنّی فوج بھی نئی وردیوں سے لیس ہو کر زیادہ باوقار نظر آنے لگی اور خانم بدروخیل نے ایسے لباس کو اپنی وضع میں داخل کر لیا جس کے حاشیے اور متن پر ہر جگہ زردوزی کا بھاری کام ہوتا تھا۔ سر سے پاؤں تک زیوروں سے لدی ہوئی خانم بدروخیل کہ جس کی ہر اُنگلی میں جواہرات کی چمکیلی بھڑکیلی انگوٹھیاں ہوتی تھیں، اگر دو نواح میں نفاست اور حُسنِ ذوق کا معیار سمجھا جانے لگا۔

رہے قاضی اور اُس کے دوساتھی، سو وہ اب بھی سات تہ خانوں والے بُرج کے اندر قید ہیں۔ اسپین میں جب کبھی ذلیل نائبوں، عیّار بر خنداذوں اور حریص قاضیوں کی کمی محسوس ہوگی تو انھیں تلاش کیا جائےگا اور اگر تہ خانے میں رہ کر ایسے وقت کا انتظار اُن کا مقسوم ہے تو شاید یہ دن قیامت تک نہ آئے۔

---

# عاملِ اور موثّق کی کہانی

مدّتیں گزریں ایک دلیر اور معمّر شخص الحمرا کا عامل تھا۔ کسی لڑائی میں اُس کا ایک ہاتھ ضائع ہو گیا تھا اس لئے لوگ عام طور پر اُسے عاملِ "مانکو" کہتے تھے۔ عاملِ مانکو کو اپنے سپاہی ہونے پر فخر تھا اس لئے وہ اس بڑھاپے میں بھی اپنی مونچھیں تنی ہوئی رکھتا، فوجی وردی پہنتا اور چمک دار پیٹی لگاتا۔

مانکو بے حد متکبر، رسوم و قواعد کا پابند اور اپنے حقوق اور اختیارات کے معاملے میں بے حد سخت اور تحکم گیر تھا۔ اُس کے عہد میں الحمرا کو اُسی عظمت و وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جو شاہی زمانے میں اُس کے ساتھ وابستہ تھا۔ کسی کو اسلحہ لگا کر قصر کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، یہاں تک کہ تلوار یا عصا لے کر بھی اندر جانا منع تھا، تاوقتیکہ تلوار یا عصا لے جانے والا کوئی بہت معتبر شخص نہ ہو۔ کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر الحمرا کے پھاٹک میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

الحمرا کی پہاڑی کا محلِ وقوع یہ ہے کہ وہ شہر غرناطہ کے بالکل بیچ میں اس طرح کھڑی ہے جیسے کسی کے جسم پر بد گوشت۔ اور اس لئے غرناطہ کے حاکم کے لئے یہ بات بے حد تکلیف دہ ہے کہ اُس کے علاقے کے عین وسط

میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو اپنے معاملات میں پوری طرح صاحبِ اختیار ہو۔ موجودہ صورت میں یہ بات اور بھی زیادہ تکلیف دہ اور پیچیدہ اس لئے ہو گئی تھی کہ بوڑھا عامل بے حد حاسد تھا اور حق اور اختیار کے معمولی سے معمولی معاملے پر بھی مشتعل ہو جاتا تھا۔ پھر یہ کہ قصر کے حدود میں رفتہ رفتہ ایسے بے شمار بدکردار لوگ آباد ہو گئے تھے جو شہر کے باشندوں کو طرح طرح اپنی آوارگی، اور لوٹ کھسوٹ کا شکار بناتے اور قلعہ کی دیواروں کے سایہ میں پناہ گزین ہو جاتے۔

الحمرا کے عامل اور حاکمِ شہر کے درمیان ایک مستقل جنگ اور عداوت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا اور اس کی ذمہ داری زیادہ تر عامل کے رویّے پر تھی، جو ایک طرح کے احساسِ کمتری کی بنا پر ہمیشہ یہ محسوس کرتا تھا کہ میری عزت اور وقار خطرے میں ہے۔ حاکمِ شہر کا شاہانہ محل الحمرا کے عین دامن میں واقع تھا اور یہاں ہر وقت شاہی گارد کے سپاہیوں، خادموں اور شہر کے رئیسوں اور امیروں کی آمد و رفت کی وجہ سے بڑی چہل پہل اور گہما گہمی رہتی تھی۔ پہاڑی پر بنے ہوئے قلعے کا ایک برج قصر کے عین اوپر اس طرح تعمیر ہوا تھا کہ یہاں سے قصر کا صحن صاف نظر آتا تھا۔ اس برج پر بوڑھا عامل، اپنی کمر میں تلوار لٹکائے ادھر سے اُدھر ٹہلتا رہتا اور جس طرح باز اونچے درخت کی خشک ڈالی پر بنے ہوئے آشیانے میں سے اپنے صید پر نظر رکھتا ہے اسی طرح حاکم اپنے حریف کی حرکات و سکنات دیکھتا رہتا تھا۔

جب کبھی حاکم کو شہر جانے کی ضرورت پڑتی تو تزک و احتشام سے نیچے اترتا۔ جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تو اس کا محافظ دستہ اسے حلقے میں لئے ہوتا اور جب ہسپانوی وضع کی منقش اور بھاری بھرکم آٹھ گھوڑوں والی بگھی پر سوار ہو کر جاتا تو پیادے اور سوار، حشم و خدم داہنے بائیں ساتھ چلتے۔ ایسے موقعوں پر حاکم برابر اپنے دل کو اس تصور سے خوش رکھتا تھا کہ راہ گیر اسے بادشاہ کا نائب سمجھ کر اسے خوف اور ستائش کی ملی جلی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ غرناطہ کے بے فکرے اور ظریف اس کی اس نمائش اور شیخی خوری کا مذاق اُڑاتے اور اُن حقیر اور بے حیثیت لوگوں کی وجہ سے جو قلعہ کے گرد و نواح میں اس کی رعایا کی طرح آباد تھے اسے "حقیروں کا بادشاہ" کے تضحیک آمیز لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان دو جلیل المرتبہ حریفوں کے درمیان اختلاف کی ایک بنا وہ سامان تھا جو اس کے اور اس کے سپاہیوں کی ضرورت کے لئے

شہر میں ہو کر باہر سے آتا تھا۔ عامل اس مال پر چُنگی دینے سے انکار کرتا تھا اور حاکم کو چُنگی لینے پر اصرار تھا۔ رفتہ رفتہ عامل الحمرا کی اس رعایت نے ایک وسیع پیمانے پر غیر قانونی درآمد کی صورت اختیار کر لی۔ بہت سے بدکردار قلعے کے حدود میں بس گئے اور عامل اور سپاہیوں کی آڑ میں ناجائز درآمد و برآمد کا ایک مستقل سلسلہ قائم ہو گیا۔

یہ صورتِ حال حاکم شہر کے لئے ہرگز قابلِ قبول نہ تھی۔ اُس نے اپنے مشیرِ قانونی باموتی سے، جو انتہائی چالاک اور تیز طرار آدمی تھا، اس معاملے میں مشورہ طلب کیا۔ موتی بوڑھے عامل کو ستا کر اور کسی نہ کسی قانونی اُلجھن اور پیچیدگی میں پھنسا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اُس نے حاکم کو مشورہ دیا کہ شہر کے پھاٹک سے جو مال اندر لایا جائے سرکاری طور پر اُس کا معائنہ ضرور کیا جائے۔ حاکم نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور اپنے فیصلے کی اطلاع عامل کو ایک حکم نامے کے ذریعے دے دی۔ عامل بے لاگ قسم کا سپاہی تھا اور اُسے سرکاری تکلفات اور حکم ناموں سے سخت نفرت تھی۔ خاص کر یہ حکم نامہ تو ایسا تھا کہ اُس نے اُس کے آگ ہی لگا دی۔

اُس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے غصے سے کہا "کیا حاکمِ شہر نے اس آدمی کے ہاتھ میں قلم اس لئے دیا ہے کہ ہر روز میرے لئے اُلجھن کا نیا سامان پیدا کرتا رہے؟ اچھا! میں اُس پر یہ ثابت کر دوں گا کہ تجربہ کار سپاہی اتنی آسانی سے پریشان نہیں ہو جاتے"

اُس نے کاغذ اور قلم اُٹھایا اور شکستہ عبارت میں حاکمِ شہر کے نام ایک خط کھینچ مارا۔ خط میں کسی طرح کی منطق اور دلیل سے کام لئے بغیر صرف اِس بات پر زور دیا گیا تھا کہ جس سامان کے ساتھ الحمرا کا جھنڈا ہو گا اُس کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔ اور اگر چُنگی کے کسی افسر نے ایسا کیا تو اِسے اِس جرم کی سخت تعزیر بھگتنی پڑے گی۔

ابھی حاکمِ شہر اور عاملِ الحمرا کے درمیان چُنگی موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی کہ اتفاق سے ایک دن شنیل کے پھاٹک پر مال سے لدا ہوا ایک خچر آیا اور خچر والے نے یہ بیان کیا کہ شہر کے بیرونی علاقے میں ہو کر اُسے الحمرا جانا ہے۔ ایک تجربہ کار بوڑھا کارپورل خچر کے ساتھ تھا جو عرصے تک عامل الحمرا کی ماتحتی میں کام کر چکا تھا اور پرانی تلوار کی طرح زنگ آلود لیکن پختہ کار تھا۔ عاملِ الحمرا اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ جب مال سے لدا ہوا خچر شہر کے پھاٹک پر پہنچا تو کارپورل نے الحمرا کا جھنڈا اُس کی پیٹھ پر نصب

کر دیا اور اپنے آپ کو عمود کی طرح سیدھا کر کے اور سر کو بھوؤں تک ڈھک کے آگے بڑھا۔ اُس کی حالت بالکل اُس کتے کی سی تھی جو کسی دوسرے محلے میں پہنچ کر دل ہی دل میں ڈرتا بھی رہتا ہے لیکن حملے کا جواب دینے کے لئے پُوری طرح تیار ہوتا ہے۔

پھاٹک پر کھڑے ہوئے سنتری نے آواز لگائی "کون ہے؟ ٹھہر جاؤ"۔

کارپورل نے اپنا مُنہ پھیرے بغیر کڑک کر جواب دیا "الحمرا کا سپاہی!"

سنتری نے سوال کیا "تمہارے خچر پر کیا سامان ہے؟"

کارپورل بولا "فوجی دستے کے لئے راشن"۔

سنتری نے کہا "ٹھیک ہے! آگے بڑھو!"

کارپورل آگے بڑھ گیا۔ آگے آگے خود اور پیچھے پیچھے اُس کا خچر۔ لیکن ابھی وہ مشکل سے چند قدم چلا ہوگا کہ چُنگی کے دفتر سے کئی عہدے دار نکل کر اُس کی طرف بڑھے۔ اِن میں سے ایک چلایا "اے خچر والے! ٹھہرو اور اپنے سامان کا معائنہ کراؤ"۔

کارپورل اپنے خچر سمیت پلٹ آیا اور چُنگی والوں کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے تحکمانہ لہجے میں کہا "الحمرا کے جھنڈے کا احترام کرو۔ یہ سامان حاکم الحمرا کے لئے ہے"۔

"ہمیں نہ حاکم کی پروا ہے اور نہ اُس کے جھنڈے کی۔ بس کہتا ہوں کہ رُک جاؤ اور سامان کھول کر دکھاؤ"۔

"تمھیں اپنی جان پیاری نہیں تو خچر کو روک لو"۔ کارپورل نے یہ کہا اور اپنی بندوق تان کر اپنے خچر سے کہا "بیٹا، آگے بڑھو!"

چُنگی کے افسر نے تیزی سے آگے بڑھ کر خچر کی لگام پکڑ لی۔ کارپورل نے بندوق چلا دی اور چُنگی کا افسر گرتے ہی مر گیا۔

سڑک پر ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے بڑھ کے کارپورل کو پکڑ لیا اور مکّوں، ٹھوکروں اور ڈنڈوں سے اُس کی خوب خبر لی، اور جیسا کہ اسپین میں عام طور سے ہوتا ہے مجرم کو قانون کے حوالے کرنے سے پہلے آس نے

والی سزاؤں کا تھوڑا سا مزا چکھا دیا۔ اس کے بعد اُسے زنجیروں میں جکڑ کر شہر کی حوالات میں لے گئے اور خچر کے سامان کو پوری طرح کھنگال کر اُسے کارپورل کے دوسرے ساتھیوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اُسے لے کر الحمرا چلے جائیں۔

بڈھے عامل نے جب اپنے جھنڈے کی توہین اور کارپورل کی گرفتاری کا حال سُنا تو اُسے سخت طیش آیا۔ کچھ دیر تک قلعے کے ایوانوں میں گرجتا رہا، برجوں پر شور و غل مچاتا پھرا اور تلوار ہلا ہلا کر حاکمِ شہر کے قصر پر غصّے کی خوب آگ برسائی۔ اور جب غصّے کا پہلا طوفان ختم ہو چکا تو اُس نے حاکم کے پاس پیغام بھیجا کہ "کارپورل کو فوراً میرے حوالے کر دیا جائے اس لئے کہ جو لوگ میرے ماتحت ہیں اُن کے جرموں کی سزا دینے کا اختیار صرف مجھے ہے۔" حاکمِ شہر نے موثق بانا طرکی مدد سے، جو اس سارے معاملے سے لطف اندوز ہو رہا تھا عامل کے خط کا طویل جواب دیا اور لکھا کہ جرم چونکہ شہر کی چار دیواری کے اندر کیا گیا ہے اور سرکاری افسروں میں سے ایک کے خلاف کیا گیا ہے اس لئے فیصلے کا مجاز عامل نہیں بلکہ حاکمِ شہر ہے۔ عامل نے اس جواب کے جواب میں پھر اپنا مطالبہ دُہرایا اور اس جواب الجواب کے جواب میں حاکم نے پہلے سے بھی زیادہ طویل اور قانونی خط لکھا۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ عامل کا ہر تازہ خط پچھلے خط سے زیادہ مختصر لیکن سخت، تند اور تیز ہوتا اور حاکمِ شہر کا ہر جواب زیادہ طویل، زیادہ نرم، ہلکا اور مدھم ہوتا۔ یہاں تک کہ بوڑھا شیر دل سپاہی اس بات پر آگ بگولا ہو گیا کہ اُسے برابر قانونی بحثوں کے جال میں پھنسایا جا رہا ہے۔

تیز طرّار اور نکتہ داں موثق ایک طرف تو عامل کی پریشانیوں سے پورا لطف اُٹھا رہا تھا اور دوسری طرف اُس نے کارپورل کے مقدمے کی کارروائی جاری کر رکھی تھی، جسے ایک تنگ و تاریک حوالات میں قید کر دیا گیا تھا۔ جس کی تنہا سلاخ دار کھڑکی میں سے وہ آنے جانے والوں کی ہمدردی وصول کرتا رہتا تھا۔

کبھی نہ تھکنے والے موثق نے کارپورل کے خلاف شہادتوں کا ایک پلندا جمع کر لیا تھا اور کارپورل پوری طرح اُس کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اُس پر قتل کا جرم ثابت ہوا اور اُسے موت کی سزا دی گئی۔

عامل نے کارپورل تک اپنے شدید غم و غصّے کا پیغام بھجوایا، جواب بے معنی تھا۔ پھانسی کا دن آپہنچا اور دستور کے مطابق کارپورل کو پھانسی کی رات جیل کے گرجے میں بھیج دیا گیا کہ وہ چاہے تو مرنے سے پہلے اپنے

گناہوں سے استغفار کرلے۔

عامل نے دیکھا کہ اب معاملے میں کوئی جان نہیں رہی تو اُس نے اس میں ذاتی دلچسپی لینے کا تہیہ کیا۔ اُس نے اپنی سرکاری بگھی نکلوائی اور اپنے محافظ دستے کو ساتھ لے کر الحمرا سے اُتر کر شہر میں آیا اور سیدھا موثق کے پاس پہنچا۔ عامل کے بلانے پر موثق اُس کے پاس آیا تو اُس کا چہرہ فتح مندی کے نُور سے چمک رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا یہ رنگ دیکھ کر عامل کی آنکھیں غصّے سے انگارہ ہوگئیں۔ اُس نے چلّا کر موثق سے کہا "میں نے سُنا ہے کہ تم میرے ایک سپاہی کو پھانسی دینے والے ہو؟"

موثق نے اختصار کے ساتھ جواب دیا "جو کچھ ہوا ہے قانون کے مطابق اور جو کچھ ہوگا انصاف کی رُو سے ـــــ اگر حضور پسند فرمائیں تو وہ تحریری شہادت ملاحظہ فرمالیں جو مجرم کے خلاف پیش ہوئی ہے"

"لاؤ" عامل نے انتہائی اختصار سے کام لیا۔ موثق فوراً اپنے دفتر میں گیا، کاغذات سے بھری ہوئی ایک فیدک لے کر واپس آیا اور پیشہ ورانہ مہارت سے ایک طویل بیان پڑھنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں موثق کے دفتر کے پاس بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے تھے اور دونوں کی باتیں سُن رہے تھے ـــــ اشتیاق سے سُننے والوں کی گردنیں آگے کو بڑھی ہوئی اور مُنہ کھلے ہوئے تھے۔

"دیکھو" عامل نے موثق سے کہا "میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں اس بھیڑ میں تمھاری بات اچھی طرح نہیں سن سکتا۔" موثق گاڑی میں بیٹھ گیا اور کوچ بان نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ چابک کی ایک تیز آواز ہوئی اور بگھی گھوڑے، محافظ سب بے تحاشا الحمرا کی طرف بھاگے۔ مجمع یہ سارا تماشا حیرت سے دیکھتا رہا اور عامل نے الحمرا پہنچکر موثق کو قلعے کے ایک تاریک اور مضبوط تہ خانے میں ڈال دیا۔

اس کے بعد اُس نے فوجی انداز میں صلح کا پرچم حاکمِ شہر کے پاس بھیجا اور قیدیوں کے باہمی تبادلے کی تجویز پیش کی ـــــ موثق کے بدلے میں کارپورل۔ حاکمِ شہر کا احساسِ خود شناسی بیدار ہوا۔ اُس نے عامل کی تجویز حقارت کے ساتھ رد کر دی اور حکم دیا کہ کارپورل کو دار پر چڑھانے کے لئے محل کے صحن میں سُولی کھڑی کی جائے۔

عامل نے اُوپر سے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا "اوہو! یہ بات ہے!" اُس نے فوراً حکم دیا کہ قلعے کے ایک بڑے بُرج پر جو محل کے صحن سے پُوری طرح نظر آتا ہو ایک سُولی کھڑی کر دو۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے حاکمِ شہر

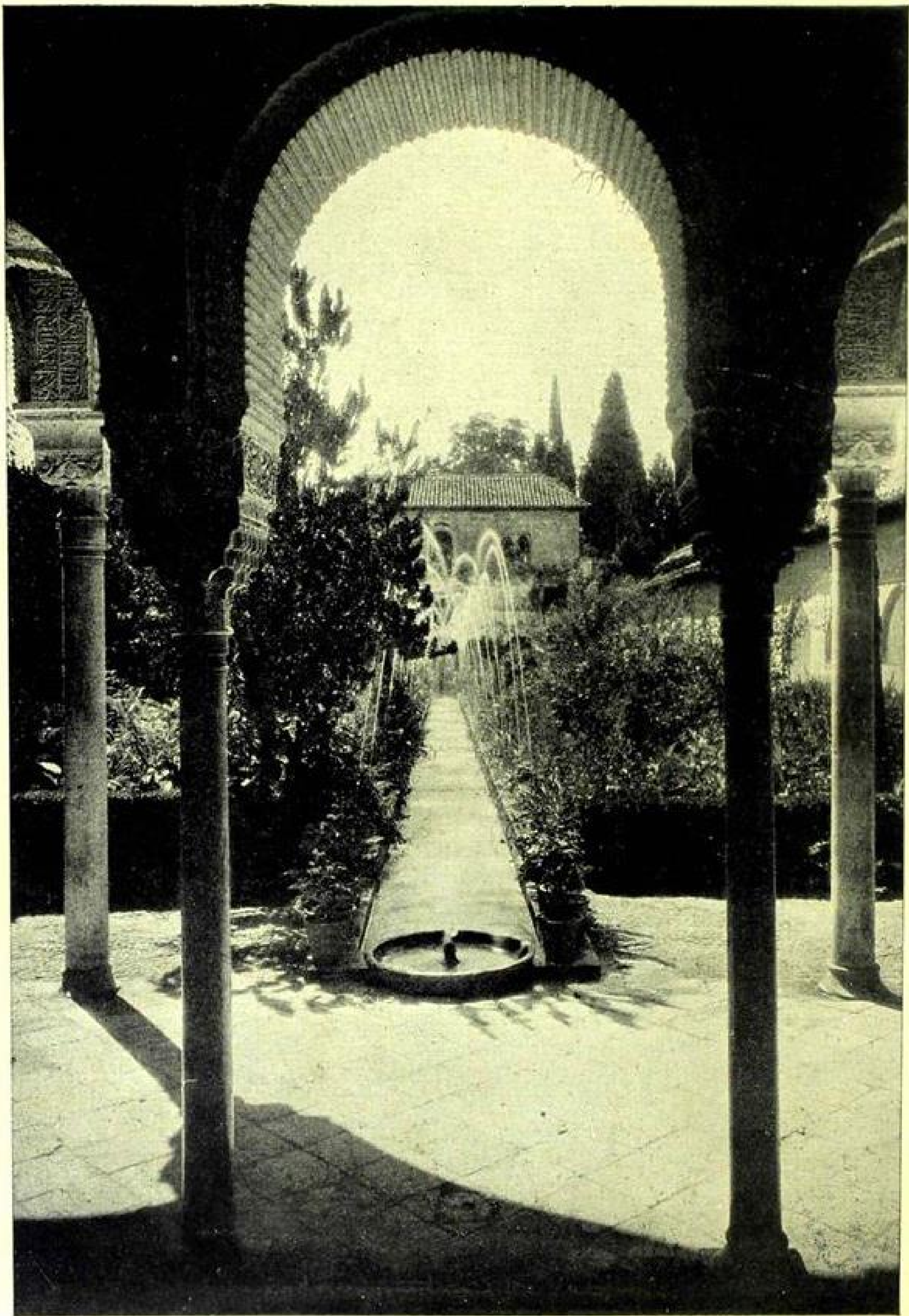
کو پیغام بھیجا کہ "میرے سپاہی کو جب چاہے سُولی دو لیکن ساتھ ہی ذرا اُوپر کی طرف بھی دیکھ لینا کہ تمھارے موثق کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کرتی نظر آئے گی"۔

حاکمِ شہر پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ صحن میں سپاہی صف بستہ کھڑے ہوئے، طبل پٹنے اور گھنٹے بجنے لگے۔ تماشائی سُولی کا تماشا دیکھنے کے لئے ہر طرف جمع ہوگئے۔ ادھر عامل نے بھی اپنی فوج صف بستہ کی اور بُرجِ اجراس، یا گھنٹے والے بُرج سے موثق کا نوحہ بجنے لگا۔

اتنے میں موثق کی بیوی مجمع کو چیرتی پھاڑتی، بچّوں کی چھوٹی موٹی فوج کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور حاکمِ شہر کے قدموں پر گر کر رو رو کر کہنے لگی "للّٰہ میرے شوہر کو اپنی خودداری اور عزّتِ نفس پر قربان نہ کیجئے اور اُس کے بیوی بچّوں پر ترس کھائیے۔ آپ عامل کے مزاج سے واقف ہیں۔ اگر آپ نے سپاہی کو پھانسی دی تو میرا شوہر بھی ضرور مارا جائے گا"۔

موثق کی بیوی کے نالہ و فریاد اور اُس کے بچّوں کی چیخ پکار نے حاکم کو مغلوب کر لیا۔ کارپورل کو ایک محافظ دستے کی نگرانی میں الحمرا بھیج دیا گیا۔ کارپورل کے جسم پر پھانسی کا لباس تھا، لیکن اُس کا سر اُونچا تھا اور چہرے پر آہنی عزم۔ معاہدے کے مطابق موثق کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ عامل کے حکم سے وہ ہوشیار اور شاطر ماہرِ قانون تہ خانے سے باہر نکالا گیا —— زندہ لیکن مُردوں سے بدتر۔ اُس کی ساری شیخی اور غرور ہوا میں پرواز کر چکے تھے۔ تھوڑے ہی سے وقفے میں خوف سے اُس کے سیاہ بالوں پر سفیدی غالب آگئی تھی اور اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا جیسے اب بھی اُسے اپنی گردن میں پھانسی کا پھندا پڑا نظر آرہا ہے۔

بوڑھا عامل اپنے ہاتھ کو کُولھے پر رکھ کر کھڑا ہوگیا، اُس کی بے چارگی پر تبسّم کی نظر ڈالی اور اُسے مخاطب کر کے کہا "میرے دوست! آئندہ دوسروں کو دار پر چڑھانے کے معاملے میں اتنا جوش ہرگز مت دکھانا اور یاد رکھنا کہ قانون تمھارا طرفدار ہو تب بھی تمھاری زندگی محفوظ نہیں۔ اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ کسی بوڑھے سپاہی پر اپنے داؤں ذرا سوچ سمجھ کر چلانا"۔



صحنِ فوّاره

# عاملِ مانکو اور پُراسرار سپاہی

الحمرا کے عامل مانکو کی خود پسندی اور ضدی سپاہیانہ سرشت سے جہاں الحمرا کے قلعے کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل ہوئی وہاں اُن بدمعاشوں اور آوارہ گردوں کی وجہ سے جنھوں نے قلعے کو اپنی پناہ گاہ بنا رکھا تھا وہ طعن و طنز کا مستقل اور دائم مرکز بھی رہا۔ لیکن ایک دن ایکا ایکی اُس نے الحمرا کی اصلاح کرنے کا تہیہ کیا اور اُس کے سپاہی ہر گھر اور ہر رہ گزر میں مشتبہ لوگوں کی جستجو کرنے لگے۔

گرمی کی ایک روشن صبح کو ایک فوجی دستہ، جس کی سرکردگی اُس تجربہ کار کارپورل کے ہاتھ میں تھی جس نے موثّق والے معاملے میں شہرت حاصل کی تھی، ایک ترمچی اور دو سپاہی جنّت العریف کے باغ کی دیوار تلے اُس سڑک کے کنارے بیٹھے تھے جو جبل الشمس سے نیچے کی طرف آتی ہے۔ اُنھوں نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُنی جس کا سوار غیر دلکش مردانہ آواز میں صحیح دُھن کے ساتھ ایک پُرانا فوجی نغمہ گا رہا تھا۔

ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ہی اُن کی نظر ایک مضبوط جسم اور سونلائے ہوئے چہرے کے ایک شخص پر پڑی جس کے جسم پر پیدل سپاہی کی بوسیدہ وردی تھی اور جو ایک شاندار عرب گھوڑے کی لگام ہاتھ میں پکڑے

اُن کی طرف آ رہا تھا۔ ویران پہاڑی کی طرف سے ایک اجنبی سپاہی کو آتا دیکھ کر کارپورل اپنی جگہ سے اُٹھا اور آگے بڑھ کر آواز لگائی۔

"کون جاتا ہے؟"

"ایک دوست!"

"تم کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ایک غریب سپاہی جو بوسیدہ لباس اور خالی جیبوں کا انعام لے کر میدانِ جنگ سے آ رہا ہے۔"

اتنی دیر میں سپاہی اور قریب آ گیا اور اُنھوں نے اُسے ذرا غور سے دیکھا تو اُس کے ماتھے پر ایک کالا نشان نظر آیا جس نے اُس کی خشخشی داڑھی کے ساتھ مل کر اُس کے بھیانک چہرے کو اور بھی بھیانک بنا دیا تھا۔

کارپورل کے سوالوں کا جواب دے چکنے کے بعد تازہ وارد نے اپنے آپ کو اس بات کا مستحق سمجھ لیا تھا کہ وہ دوسروں سے سوال کر کے اُن سے تعارف حاصل کرے۔ اُس کا پہلا سوال یہ تھا "پہاڑی کے دامن میں یہ سامنے کون سا شہر نظر آ رہا ہے؟"

ترمچی نے حیرت زدہ ہو کر سوال کا جواب سوال ہی میں دیا "کون سا شہر؟ کتنی عجیب بات ہے، جبل الشمس کی طرف سے آنے والا ایک شخص ہم سے غرناطہ جیسے عظیم الشان شہر کا نام پوچھ رہا ہے!"

"غرناطہ؟ کیا میں یقین کر لوں کہ تم سچ بول رہے ہو؟"

"تمہارا جی چاہے تو!" ترمچی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "تو شاید تمھیں یہ بھی نہیں معلوم ہو گا کہ وہ سامنے الحمرا کے برج نظر آ رہے ہیں۔"

"ترم کے فرزند!" اجنبی نے ظریفانہ انداز میں کہا "مجھ سے مذاق مت کرو۔ اگر واقعی یہ الحمرا ہے تو میں عامل کو کچھ عجیب و غریب باتیں بتانا چاہتا ہوں۔"

اس مرتبہ کارپورل بولا "تمھیں اس کا موقع ملے گا اس لئے کہ ہم تمھیں عامل ہی کے پاس لئے چل رہے ہیں۔"

اِس دوران میں ترمچی نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی تھی اور دونوں سپاہیوں نے نو وارد کے دونوں ہاتھوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کارپورل تیزی سے آگے بڑھا اور فوجی حکم دیا "فارورڈ —— مارچ!" اور سب کے سب الحمرا کی طرف چل پڑے۔

ایک بدحیثیت پیدل سپاہی اور ایک شاندار عرب گھوڑے کو الحمرا کے سپاہیوں کی حراست میں دیکھ کر قلعے کی آبادی اُن کی طرف متوجہ ہو گئی اور صبح سویرے ہی سے کنوؤں اور چشموں کے گرد اکٹھے ہو جانے والے بھول اُنھیں حیرت سے تکنے لگے۔ حوض کی چرخی چلتے چلتے رُک گئی اور وہ بھونڈی عورت جس کے ہاتھ میں خالی گاگر تھی کارپورل اور اُس کے مختصر قافلے کو جاتے دیکھ کر رُک گئی اور رفتہ رفتہ تماشائیوں کا خاصا ہجوم اُن کے پیچھے پیچھے قلعے کی طرف چلنے لگا۔ سب اپنی اپنی سمجھ اور مذاق کے مطابق اس نو وارد کے متعلق طرح طرح کے اشارے اور قیافے کرنے لگے۔ ایک بولا "یہ مغرور سپاہی ہے" دوسرے نے کہا "نہیں کوئی آوارہ گرد ہے" اور تیسرا اندازہ لگا کر چلایا "نہیں! قزّاق ہے" اور بالآخر کسی نے فیصلہ کُن انداز میں یہ خبر سنائی کہ یہ شخص ڈاکوؤں کے ایک خطرناک گروہ کا سردار ہے اور کارپورل اور اُس کے سپاہیوں نے اِسے بڑی دلیری سے گرفتار کیا ہے۔" اس پر ایک تجربہ کار بڑھا بولا "مغرور سپاہی ہو یا ڈاکوؤں کا سردار اہم تو جب جانیں کہ یہ ہمارے عامل کے پنجوں کی گرفت سے بچ نکلے —— گو یہ صحیح ہے کہ اُس کے ایک ہی ہاتھ ہے۔"

عامل مانکو قلعے کے ایک اندرونی کمرے میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ اُس کا پادری کافی میں اُس کا شریک تھا اور ایک سنجیدہ روغزالیں چشم دوشیزہ جو اُس کے میر ساماں کی بیٹی تھی اُن کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اپنی ظاہری سنجیدگی کے باوجود غزالیں آنکھوں اور گداز جسم والی اس حسینہ نے عامل کے فولادی دل کے کسی نرم گوشے میں اپنے لئے جگہ بنا لی تھی اور اُس پر پوری طرح قابض تھی۔ لیکن خیر! چھوڑیئے ان باتوں کو۔ ہمیں بڑے لوگوں کے ذاتی اور گھریلو معاملات پر اس طرح نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں۔

جب عامل کو اطلاع دی گئی کہ ایک مشتبہ آدمی کو جو قلعے کے حدود میں آوارہ گردی کر رہا تھا، کارپورل اور اُس کے سپاہی عامل کے حضور میں پیش کرنے لائے ہیں تو عامل کا سینہ حاکمانہ غرور اور شان سے پھول گیا۔ کافی کی پیالی فربہ دوشیزہ کے ہاتھ میں دے کر اُس نے اپنی تلوار منگائی، اُسے کمر سے باندھا، مونچھوں پر

تاؤ دیا اور اونچے تکیے والی شاہانہ کرسی پر بیٹھ کر چہرے پر رعب اور خشونت پیدا کر کے مشتبہ آدمی کو اپنے روبرو طلب کیا ۔ اجنبی سپاہی کو اپنے گھیرے میں لئے کارپورل اور اُس کے سپاہی اندر داخل ہوئے ۔ اجنبی کے چہرے پر خوف وہراس کے بجائے ایک طرح کی خود اعتمادی تھی ۔ اُس نے عامل کے خشونت زدہ چہرے اور چبھنے والی تیز نظروں کا جواب نیم باز آنکھوں کے تبسم سے دیا اور اس کی ذرا بھی پروا نہ کی کہ اُس کی یہ بے نیازی عامل پر گراں گزرے گی ۔

تھوڑی دیر تک خاموشی سے نو وارد کا جائزہ لینے کے بعد عامل اُس سے مخاطب ہوا "کیوں، مجرم! بتاؤ تمہیں اپنے متعلق کیا کہنا ہے ؟ ـــ تم کون ہو ؟"

" ایک سپاہی جو ابھی میدانِ جنگ سے آیا ہے اور سوائے زخموں اور خراشوں کے اپنے ساتھ اور کچھ نہیں لایا "

" سپاہی ! ہوں ! اور جیساکہ تمہارے لباس سے ظاہر ہے ، ایک پیدل سپاہی ۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے پاس ایک بہت اچھا عرب گھوڑا بھی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ زخموں اور خراشوں کے علاوہ یہ گھوڑا بھی تم میدانِ جنگ سے لائے ہو "

" اگر حضور اجازت دیں تو اس گھوڑے کے متعلق مجھے کچھ عجیب و غریب باتیں بتانی ہیں ۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ عجیب و غریب بھی ہے اور اُس کا تعلق قلعے کی بہبود ، بلکہ پورے غرناطہ کی فلاح وبہبود سے ہے ۔ لیکن یہ باتیں یا تو حضور سے تنہائی میں کہی جا سکتی ہیں یا صرف اُن منتخب لوگوں کے سامنے جنھیں مقربِ بارگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے "

عامل نے کچھ دیر سوچا اور کارپورل اور اُس کے سپاہیوں کو باہر ٹھہرنے کی تاکید کر کے رخصت ہونے کا حکم دیا ۔ اس کے بعد نو وارد سے مخاطب ہو کر کہا " یہ پادری صاحب ! میرے معتمد ہیں اور یہ حسینہ بڑی محتاط ہے اور ہر راز کی پوری طرح حفاظت کر سکتی ہے "

سپاہی نے حسینہ پر اعتماد اور پسندیدگی کی ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "حسینہ کے یہاں موجود رہنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں " یہ کہہ کر سپاہی نے اپنا عجیب و غریب افسانہ شروع کیا ۔ سپاہی اپنی ظاہری حیثیت

کے مقابلے میں زیادہ خوش بیان تھا۔ اُس کی باتوں میں خاصی روانی تھی۔ اُس نے بات بڑے ادب سے شروع کی۔

"حضور والا! جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، میں سپاہی ہوں اور میدانِ جنگ میں بہت سی مشکلوں سے گزرا ہوں۔ میری مدتِ ملازمت ختم ہو چکی تھی اس لئے مجھے فوج سے الگ کر دیا گیا۔ نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد میں اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا، جو اندلس کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کل میں قشتالۂ قدیم کے دبیز میدان سے گزر رہا تھا کہ آفتاب غروب ہو گیا۔"

"ٹھہرو!" عامل چلایا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ قشتالۂ قدیم یہاں سے تقریباً تین سو میل کے فاصلے پر ہے۔"

سپاہی نے سکون سے جواب دیا "یقیناً! لیکن میں حضور سے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے جناب کی خدمت میں بعض عجیب و غریب باتیں پیش کرنی ہیں اور حضور اگر میری باتوں پر توجہ دیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ باتیں انتہائی عجیب و غریب ہونے کے باوجود سچی ہیں۔"

عامل نے مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا "اچھا! آگے چلو۔"

سپاہی نے سلسلۂ کلام کو جاری کرتے ہوئے کہا "جوں ہی سورج غروب ہوا میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ سونے کی کوئی جگہ تلاش کر دں۔ لیکن جہاں تک میری نظر گئی مجھے دُور دُور کہیں آبادی کا نشان نہ ملا اور اس لئے میں نے طے کیا کہ فرشِ زمین کو اپنا بچھونا اور اپنے تھیلے کو تکیہ بنا کر سو جاؤں گا۔ حضور والا! آپ خود بھی سپاہی رہ چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ خاک کا بستر اور تھیلے کا تکیہ سپاہی کے لئے کوئی تکلیف کی چیز نہیں۔"

عامل نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک مکھی کو اُڑانے کے لئے جو اُس کی ناک کے پاس بھن بھنا رہی تھی اپنی پیٹی میں سے رومال کھینچا۔

"حضور! میں بات کو طول نہیں دینا چاہتا" سپاہی نے بات جاری رکھی "مختصر یہ کہ میں کئی میل تک آہستہ آہستہ چلتا رہا یہاں تک کہ ایک پُل آ گیا جو ایک گہری ندی پر بنا ہوا تھا۔ ندی گرمی کی شدت سے تقریباً خشک ہو چکی تھی اور اُس کے بیچ میں پانی کی ایک باریک لکیر کے سوا اور کچھ پانی نہ تھا۔ پُل کے ایک طرف شاہی عہد کا ایک بُرج بنا ہوا تھا، جس کا اُوپر کا حصہ قطعی مسمار ہو چکا تھا لیکن نچلا حصہ اب بھی بالکل محفوظ تھا۔ میں نے سوچا کہ رات یہاں آرام سے کٹ جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نیچے اُترا۔ ندی سے جی بھر کے پانی پیا

اس لئے کہ پہاڑی ندی کا پانی شفاف، سرد اور شیریں تھا۔ تھیلا کھول کر میں نے روٹی کے بچے کچے ٹکڑے نکالے اور ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر انہیں پیاز سے کھانے لگا۔ میں روٹی کھا رہا تھا اور جی ہی جی میں سوچ رہا تھا کہ رات برج کے گنبد میں بڑے آرام سے کٹے گی، اس لئے کہ جیسا حضور خود جانتے ہیں، لڑائی کا مزا چکھے ہوئے سپاہی کے لئے اس سے بہتر آرام گاہ اور کون سی ہو سکتی ہے۔"

عامل نے رومال کو پیٹی کے اندر ٹھونستے ہوئے جواب دیا "اپنے زمانے میں میں نے بھی بہت سی راتیں تکلیف دہ جگہوں پر بڑی خوشی اور اطمینان سے بسر کی ہیں۔"

سپاہی اپنی بات کہتا رہا "میں آہستہ آہستہ روٹی کے سوکھے ٹکڑے چبا رہا تھا کہ میں نے برج کے اندر کسی چیز کی آہٹ سنی ـــــ میں نے غور کیا تو یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز میرے قریب آتی گئی اور پھر میں نے دیکھا کہ برج کے نچلے حصے کے دروازے سے ایک آدمی باہر نکلا جس نے ایک شاندار گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ تاروں کی ہلکی سی روشنی میں میں اُسے غور سے نہ دیکھ سکا۔ لیکن اس ویران جگہ پر، برج کے کھنڈر میں رات کے وقت کسی آدمی کی موجودگی مجھے سخت مشتبہ معلوم ہوئی۔ میں نے سوچا ممکن ہے یہ کوئی راہ گیر ہو، کوئی لٹیرا ہو یا قزاقوں کا سردار! لیکن مجھے اس سے کیا؟ میں خدا کا اور اپنی ناداری کا ممنون تھا کہ لٹیرے اور قزاق۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس لئے میں سکون سے بیٹھا سوکھے ٹکڑے کھاتا رہا۔

"نو وارد اپنے گھوڑے سمیت اُس جگہ کے بالکل قریب آ گیا جہاں میں بیٹھا تھا اور اس لئے اب میں اُسے غور سے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُس نے عربوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے سر پر فولاد کا چمکیلا خود اور جسم پر شاندار زرہ بکتر تھی۔ اُس کے گھوڑے کی زین اور لگام بھی عربوں کی سی تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا عرب سوار اپنے گھوڑے کو ندی کے کنارے لایا اور گھوڑے نے آنکھوں تک اپنا سر پانی میں ڈال کر اتنا پانی پیا کہ میرے خیال میں اُس کا پیٹ پھٹ جانا چاہیئے تھا۔

میں نے عرب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اجنبی دوست! تمہارا گھوڑا خوب پانی پیتا ہے۔ گھوڑے کا بے جھجک پانی میں اپنی تھوتھنی ڈال دینا بڑی اچھی علامت ہے۔"

" اجنبی نے عربی لہجے میں جواب دیا ، اُسے خوب سیر ہو کر پی لینے دو ۔ اُسے آج پُورے سال بھر کے بعد پانی پینے کو ملا ہے ۔"

میں نے حیرت سے کہا ، بخُدا ! اِس نے تو اچھے سے اچھے اونٹوں کو بھی مات کر دیا ۔ لیکن خیران باتوں کو چھوڑو ۔ تم بھی میری طرح سپاہی معلوم ہوتے ہو اور شاید ایک سپاہی کی روکھی سوکھی روٹی میں شریک ہونے میں تکلف نہیں کرو گے ؟ حقیقت میں اس سنسان جگہ پہ مجھے ایک ساتھی کی کمی محسوس ہو رہی تھی ۔ اور ساتھی خواہ کیسا ہی ہو ، مجھے گوارا تھا ۔ علاوہ بریں ، جیسا کہ حضور جانتے ہیں ، سپاہی کو اس کی کبھی پروا نہیں ہوتی کہ اُس کے ہم نشین و ہم جلیس کا مذہب و عقیدہ کیا ہے اور اِسی لئے میدانِ جنگ سے باہر مُلک اور قوم کے سپاہی دوست اور بھائی ہوتے ہیں ۔"

عامل نے پھر اثبات میں سر ہلایا ۔

" جی ہاں ! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نو وارد کو روکھی سوکھی کھانے کی دعوت دی لیکن اجنبی نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ مجھے اتنی فرصت نہیں کہ کھانے پینے میں ایک لمحہ بھی ضائع کر سکوں ۔ مجھے صبح تک بڑی لمبی مسافت طے کرنی ہے ۔"

میں نے پوچھا " تمہاری منزلِ مقصود کیا ہے ؟"

اُس نے جواب دیا " اندلس !"

میں بولا " مجھے بھی اُسی طرف جانا ہے ۔ کیا تم مجھے ہم سفر بنا سکتے ہو ؟ تمہارا گھوڑا مضبوط ہے اور یقین ہے کہ آسانی سے دو آدمیوں کا بوجھ اُٹھا لے گا ۔"

سوار فوراً راضی ہو گیا اور شاید اِنکار اخلاق اور سپاہیانہ طرزِ عمل کے منافی بھی ہوتا خصوصاً اس صورت میں کہ میں اُسے کھانے کی دعوت بھی دے چکا تھا ۔ وہ فوراً ہی گھوڑے پر سوار ہوا اور میں اُس کے پیچھے بیٹھ گیا ۔

" دیکھو ذرا سنبھل کر بیٹھنا ۔ میرا گھوڑا ہوا کی طرح جاتا ہے ۔" " درست " میں نے جواب دیا اور گھوڑا اچھل پڑا ۔ پہلے آہستہ آہستہ ، پھر دُلکی ، دُلکی سے سرپٹ اور سرپٹ سے نہ جانے کیا ـــــ آندھی ، طوفان ، بھونچال معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ ، درخت ، عمارتیں ، میدان سب خشک پتوں کی طرح طوفان کے پیچھے رہ گئے ہیں ۔

تھوڑی دیر بعد میں نے سوال کیا " یہ کون سا شہر ہے ؟"

" اُشقوبیہ" ، اُس نے کہا ۔ اور لفظ کے پوری طرح ادا ہونے سے پہلے اُشقوبیہ کے بُرج و مینار ہماری نظر سے اوجھل ہو گئے ۔ ہم طوفان کی طرح وادئ رملہ کی پہاڑیوں سے گزرے ، اور ہوا کی طرح اسکوریال کو طے کرتے ہوئے میڈرڈ کی حدود میں داخل ہو گئے اور پھر افسوں کی طرح یہاں سے گزر کر لامنشا کے میدانوں پر چھاپا مارا۔ پہاڑیوں ، وادیوں ، شہروں اور بُرجوں کو محوِ خواب چھوڑتے ہوئے اور میدانوں اور دریاؤں کو ستاروں کی دھیمی روشنی میں چمکتا چھوڑ کر ہم یہ طوفانی سفر طے کرتے رہے ۔"

" حضور کی سمع خراشی ہو رہی ہے اس لئے مختصراً غرض ہے کہ ایکا ایکی سوار ایک پہاڑ کے دامن میں آ کر رُک گیا اور بولا " لو ! ہم منزلِ مقصود پر آ پہنچے " میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن کہیں آبادی کا نشان نہ پایا ، سوائے ایک غار کے جو ہمارے سامنے مُنہ پھاڑے کھڑا تھا اور اس غار کے اندر بہت سے آدمی ، عربی لباسوں میں ملبوس اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے ——— کچھ سوار ، کچھ پیدل ۔ اور اُن کے علاوہ ہر سمت سے بے شمار عرب آ آ کر اس طرح غار کے اندر داخل ہو رہے تھے جیسے چھتے میں شہد کی مکھیاں ۔ قبل اس کے کہ میں اپنے ساتھی سے کچھ پوچھ سکوں اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور دوسرے سواروں کے ساتھ تیزی سے غار میں جا گھسا ۔ ہم گھوڑے پر سوار ، ایک پتھریلے پیچدار راستے سے ہو کر جیسے پہاڑ کی تہ میں پہنچ گئے ۔ آگے بڑھے تو دھیمی دھیمی روشنی نظر آئی ، جیسے صبح کے دھندلکے میں ، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ روشنی کس چیز کی ہے ۔ ہم اسی طرح آگے بڑھتے رہے ۔ ہمارے داہنے بائیں بے شمار بڑے بڑے دالان بنے ہوئے تھے ، جیسے کسی بڑی فوجی چھاؤنی ۔ ان دالانوں میں سے کچھ کی دیواروں پر ڈھالیں ، خود ، زرہ بکتر ، برچھیاں ، تلواریں اور پیش قبض بڑے سلیقے سے سجے ہوئے تھے ۔ کچھ دالانوں میں فرش پر مختلف قسم کے اسلحوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔"

" اگر حضور جیسا پرانا سپاہی اس اسلحے کی ایک جھلک بھی دیکھ لے تو حضور کا نہ جانے کتنا خون بڑھ جائے ۔ ان دالانوں کے بعد والے دالانوں میں سواروں کے صف بستہ دستے ، سر سے پیر تک اسلحے میں ڈوبے ، تنی ہوئی برچھیاں اور لہراتے ہوئے پرچم ہاتھوں میں ، جیسے میدانِ جنگ کے اشتیاق میں کھڑے تھے ۔ دوسرے دالانوں میں جنگجو سوار اپنے جنگی گھوڑوں کے برابر گہری نیند میں غرق پڑے تھے ۔ ان کے بعد کے دالانوں میں پیدل سپاہی

وردیوں میں ملبس صف بستہ ہونے کے حکم کے منتظر نظر آتے تھے۔ سب کے جسموں پر قدیم عربی لباس اور اسلحے تھے اور سب بتوں کی طرح ساکن و صامت ۔"

" مختصر یہ حضور والا کہ ہم بالآخر ایک وسیع اور فراخ دالان میں ، بلکہ میں والان کے بجائے محل کہوں تو بجا ہے ، داخل ہوئے ۔ محل کی دیواریں گہرے نقرئی اور طلائی نقوش سے مزین و آراستہ تھیں اور ہیرے ، نیلم ، یاقوت اور دوسرے قیمتی جواہرات سے جگمگا رہی تھیں ۔ اس دالان کے ایک رُخ جڑاؤ طلائی تخت پر ایک عرب بادشاہ بیٹھا تھا ۔ اُس کے اِرد گرد مسندوں پر امیروں وزیروں کی نشستیں تھیں اور اُن کے پیچھے افریقی پہرہ داروں کا محافظ دستہ جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں بجلی کی طرح چمکتی ہوئی ننگی تلوار تھی ۔ وہ ہزاروں سوار جو غار کے راستے سے اندر داخل ہوئے تھے منظم قطاروں میں ایک ایک کر کے تخت شاہی کے سامنے سے گزر رہے تھے اور گزرتے وقت آدابِ شاہی کے مطابق تعظیم دے رہے تھے ۔ ان گزرنے والوں کے زرق برق اور پرشکوہ لباس ہیرے جواہرات سے جگ جگ کر رہے تھے ۔ کچھ کے جسموں پر آئینے کی طرح چمکتے ہوئے زرہ بکتر تھے ۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے لباس پھٹے پرانے اور زرہ بکتر شکستہ اور زنگ آلود تھے ۔"

" اب تک میں مبہوت اور متحیر سب کچھ دیکھ رہا تھا اور زبان نہ کھولی تھی ، اس لئے کہ حضور جانتے ہیں کہ سپاہی سوال جواب کرنے کے عادی نہیں ہوتے ۔ لیکن اب میرے لئے ضبط ناممکن تھا اس لئے میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا " عزیز دوست ! یہ سب کچھ آخر کیا ہے ؟"

سوار نے جواب دیا " اے مسیحی ! یہ سب کچھ ایک زبردست اور خوفناک راز ہے ، اور جو منظر تم اس وقت دیکھ رہے ہو یہ غرناطہ کے آخری مسلمان حکمران ابی عبداللہ کے دربار کا ہے ۔"

میں حیرت سے چیخ پڑا " یہ تم کیا کہہ رہے ہو ؟ ابی عبداللہ اور اُس کے درباری تو صدیاں گزریں یہاں سے جلاوطن ہو کر افریقہ چلے گئے تھے اور وہیں مر کھپ گئے ۔"

عرب نے تندی سے جواب دیا " بے شک ! تمہاری غلط سلط تاریخوں میں یہی لکھا ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابی عبداللہ اور اُس کے جاں باز ساتھی ، جو غرناطہ کے لئے آخری جد وجہد کرتے ہوئے شہید ہوئے ایک زبردست طلسم کے تحت پہاڑ کے غاروں میں بند ہیں ۔ رہے وہ لوگ جنھیں تم نے غرناطہ کے سقوط

کے وقت شہر سے باہر نکلتے دیکھا، تو وہ حقیقت میں ابی عبداللہ اور اُس کے جاں باز نہیں بلکہ اللہ کی بھیجی ہوئی روحیں تھیں، جو عیسائیوں کو دھوکا دینے کے لئے تعینات ہوئی تھیں ——— اور میرے دوست! یاد رکھو کہ ہسپانیہ کے سارے مُلک پر طلسم و افسوں کا قبضہ ہے۔ پہاڑوں کا کوئی غار، میدانوں کا کوئی مینار یا گنبد یا کوئی سنسان و ویران کھنڈر ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی جاں باز صدیوں سے سحر و طلسم کی تاثیر سے محوِ خواب نہ ہو۔ سحر و طلسم کی یہ تاثیر اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ مومنوں کے وہ گناہ معاف نہ کر دے جن کی وجہ سے سلطنت کچھ مدّت کے لئے اُن سے چھین لی گئی ہے۔ سال میں ایک بار، آج کی رات اُنھیں طلسم کی تاثیر سے رہا کر دیا جاتا ہے کہ اس غار میں اکٹھے ہو کر اپنے سلطان کو تعظیم دیں۔ جو پیدل اور سوار ہزاروں کی تعداد میں تُم نے غار کے اندر داخل ہوتے دیکھے ہیں وہ وہی مُسلمان جاں باز ہیں جو ہسپانیہ کے مختلف علاقوں سے سحر سے آزاد ہو کر یہاں آئے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں صدیوں سے قشتالۂ قدیم کے بُرج میں رہتا ہوں اور ہر سال مجھے آج کی رات یہاں طلب کیا جاتا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے میں اپنی طلسم گاہ میں پہنچ جاؤں گا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے وسیع دالانوں میں جو ہزاروں پیدل اور سوار تمھیں نظر آئے وہ غرناطہ کے سحر زدہ جنگ جُو سپاہی اور سردار ہیں۔ صحیفۂ تقدیر میں لکھا ہے کہ طلسم کی تاثیر ختم ہو جائے گی تو ابی عبداللہ اپنی فوج سمیت پہاڑی سے اُتر کر الحمرا کے تخت و تاج اور غرناطہ کی سلطنت پر قابض ہو جائے گا اور اسپین کے مختلف حصّوں میں جتنے جواں مرد اور جاں باز طلسم کی تاثیر کے پابند ہیں اُن سب کی مدد سے اپنی سلطنت دُور دُور پھیلائے گا۔"

"اور یہ سب کچھ کب ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

یہ صرف اللہ جانتا ہے! ہمارا خیال تھا کہ نجات اور رہائی کا وقت بہت قریب ہے، لیکن آج کل الحمرا ایک جہاندیدہ سپاہی کے زیرِ عمل ہے، جسے لوگوں نے عالی مانکو کا لقب دیا ہے۔ جب تک ایسا مستعد اور بہادر عامل موجود ہو، جو پہاڑ کی طرف سے پہلے ہی حملے کی روک تھام کر لے ابی عبداللہ اور اُس کی فوج کو اپنے غار میں پوشیدہ رہنا پڑے گا۔"

اس جملے پر عالی مانکو پہلے سے زیادہ تن کر بیٹھ گیا، اپنی تلوار کو دُرست کیا اور مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

" مختصر یہ ، حضور والا ! کہ طلسم کی یہ داستان سُنا کر سوار اپنے گھوڑے سے اُتر پڑا اور مجھ سے بولا " ذرا میرا گھوڑا پکڑ لو ۔ میں ابی عبد اللہ کو تعظیم دے کر ابھی آتا ہوں " ۔ یہ کہا اور دوسرے لوگوں کے پیچھے قطار میں شامل ہو کر تخت کی طرف چل دیا ۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیئے ۔ میں یہاں عرب سوار کی واپسی تک ٹھہرا تو سوار مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر خدا جانے کہاں پہنچا دے گا ۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ میں جلدی سے جلدی بھوتوں کی اس برات سے نکل کر بھاگوں ۔ جیسا کہ حضور والا جانتے ہیں سپاہی فیصلہ بھی جلدی کرتا ہے اور اُس پر عمل بھی اتنی ہی تیزی سے ہوتا ہے ۔ گھوڑے کو میں نے اپنے دین اور حکومت کے دشمنوں کی ملکیت سمجھ کر اُس پر قبضہ کرنے کو ثواب جانا ، اس لئے فوراً اُس پر سوار ہوا اور ایڑ لگا کہ اُسی راہ سے باہر نکلنے لگا جس سے داخل ہوا تھا جب میں اُن وسیع دالانوں کے قریب سے گزر رہا تھا ، جہاں تھوڑی دیر پہلے مجھے ہزاروں مُسلمان پیدل اور سوار سپاہی بُتوں کی طرح بیٹھے نظر آئے تھے ، مجھے اسلحے کی جھنکار اور لوگوں کی سرگوشیوں کی آواز آتی ہوئی سُنائی دی ۔ میں نے گھوڑے کو ایک ایڑ اور دی اور اُس نے رفتار تیز کر دی ۔ مجھے اپنے پیچھے سے آندھی کے تیز جھونکوں کی سنسناہٹ آتی محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ ہزاروں سوار میرا پیچھا کر رہے ہیں ۔ آندھی کے اس زور نے مجھے غار کے باہر پھینک دیا اور ہزاروں طلسمی سائے ہوا کے تیز جھونکوں کی طرح اُڑتے ہوئے باہر آ گئے ۔ "

" آندھی کے زور اور ہر طرف پھیلی ہوئی ہلچل میں میں گھوڑے سے گر کر بے ہوش ہو گیا جب ہوش میں آیا تو ایک چٹان پر پڑا تھا اور عرب گھوڑا میرے پاس کھڑا تھا ۔ گرتے وقت میرا ایک ہاتھ باگ میں پھنس گیا تھا اور شاید یہی چیز تھی جس کی وجہ سے عرب گھوڑا وہاں سے فرار ہو جانے کے بجائے وہیں کھڑا رہا ۔

میں نے اپنے آس پاس ہاتھ پھیر کر اور نظر دوڑا کر دیکھا تو گھنی جھاڑیوں اور انجیر کے پودوں کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ یہ سب آثار جنوب کی آب و ہوا کے ہیں ۔ لیکن مجھے سخت حیرت تھی کہ میں یہاں کس طرح پہنچا ۔ جب میں نے نیچے کی طرف دیکھا اور مجھے ایک عظیم الشان شہر کی شاندار عمارتیں ، بُرج اور مینار نظر آئے تو میری حیرت اور بھی بڑھ گئی ۔ بہر حال میں نے گھوڑے کی باگ تھامی اور پہاڑی کے نیچے اُترنے کا ارادہ کیا ۔ گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں پھر وہ آندھی بن کر مجھے کہیں سے کہیں نہ پہنچا دے ۔ نیچے اُترتے ہی میرا سامنا آپ کے پنزول سے ہوا اور کارپورل کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میری نظر کے سامنے پھیلا ہوا شاندار شہر غرناطہ ہے اور

میں الحمرا کے زیرِ سایہ کھڑا ہوں، جس کا عامل عظیم الشان مانگو ہے۔ طلسم زدہ مسلمان جس کی جوانمردی سے کانپتے ہیں۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں نے تہیہ کیا کہ جس طرح بھی ہو جلد ہی سے جلدی آپ کی خدمت میں پیش ہو کر یہ عجیب و غریب داستان سناؤں اور آپ سے درخواست کروں کہ اُن خطروں سے بچنے کی تدبیر اختیار کریں جن میں اس وقت آپ گھرے ہوئے ہیں اور جنھوں نے آپ کے قلعے اور ہماری سلطنت کو مستقل طور پر گھیر رکھا ہے۔"

عامل نے سپاہی کی روداد سن کر کہا "میرے عزیز دوست! تم خود بھی ایک تجربہ کار سپاہی ہو اور میدانِ جنگ کی آزمائشوں میں سے گزر چکے ہو، تم بتاؤ کہ مجھے اس خطرے سے بچنے کی کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیئے؟"

"مجھ جیسے کم مایہ سپاہی کو زیب نہیں دیتا" سپاہی نے انکسار کے ساتھ کہا "کہ آپ جیسے جہاندیدہ اور دانا و بینا کماندار کو کسی طرح کا مشورہ دے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں سب غاروں کے منہ پتھر کی مضبوط دیواروں سے بند کر دینے چاہئیں تاکہ ابی عبداللہ اور اُس کی سحر زدہ فوج ہمیشہ کے لئے غاروں میں مقیّد ہو کر رہ جائے۔ اور ساتھ ہی اپنے محترم بزرگ یعنی پادری صاحب سے میری درخواست یہ ہے کہ وہ اِن غاروں کے دہانوں پر صلیبیں، ولیوں کے مجسمے اور دوسرے روحانی تبرّکات رکھ کر اِن کے طلسمی اثرات کو زائل کر دیں۔"

پادری صاحب کا چہرہ احساسِ برتری سے چمک اُٹھا اور وہ بولے "یقیناً یہ تدبیر کارگر ثابت ہوگی۔"

عامل مانگو نے اپنا ہاتھ کولھے پر رکھا اور انگلیوں سے اپنی تلوار کے دستے کو ہلاتے ہوئے اپنی نظریں سپاہی پر جما دیں۔ پھر اپنے سر کو کئی بار دہنے بائیں جنبش دے کر بڑی سنجیدگی سے سپاہی سے کہا "میرے ذہین دوست! کیا سچ مچ تمھارا خیال ہے کہ اِن طلسمی پہاڑوں اور اُن کے اندر بسنے والے طلسمی عربوں کی داستان سے تم نے مانگو کو مرعوب کر لیا؟ —— بدمعاش! بس اپنی گستاخی ختم کر۔ ممکن ہے کہ تو ایک تجربہ کار سپاہی ہو، لیکن شاید تو یہ بھول گیا کہ تیرا مقابلہ ایسے سپاہی سے ہے جو تجھ سے زیادہ تجربہ کار ہے اور آسانی سے تیری باتوں میں نہیں آسکتا۔ سپاہیو! اِس بدمعاش کو حوالات میں بند کر دو۔"

گداز جسم والی حسین کنیز ممکن ہے کہ مجرم کی سفارش میں کچھ کہتی لیکن عامل کی ایک نظر نے اُسے خاموش

کر دیا ـــــ

سرکاری سپاہی مجرم کی کمر باندھ رہے تھے کہ انھیں اُس کی جیب میں کوئی وزنی چیز معلوم ہوئی۔ یہ وزنی چیز باہر نکالی گئی تو وہ چمڑے کی ایک مضبوط تھیلی تھی۔ سپاہی نے تھیلی کا منہ کھولا اور اُسے عالِ مانکو کی میز پر اُلٹ دیا۔ دیکھتے دیکھتے عال کے سامنے، انگوٹھیوں، بیش قیمت زیوروں، سچّے موتیوں، چمکیلے ہیروں اور بے شمار طلائی سکّوں کا ڈھیر لگ گیا۔ بہت سے سکّے فرش پر گر پڑے اور خوشگوار موسیقی کی صدا پیدا کرتے ہوئے ہر طرف پھیلنے لگے۔

تھوڑی دیر کے لئے منصفی وعدالت کا کام ملتوی ہو گیا۔ حاضرین میں سے ہر ایک نے ان طلائی مفروروں کا تعاقب کیا۔ صرف عالِ مانکو نے اپنے فطری ہسپانوی وقار کو برقرار رکھا اور شاہانہ مسند سے نہیں اُٹھا۔ اُس کی گردش کرتی ہوئی آنکھوں نے اُس کی تشویش کی تھوڑی سی غمازی البتہ کی اور جب تک سب جواہرات اور سکّے دوبارہ تھیلی میں نہیں پہنچ گئے اُسے اطمینان نہیں ہُوا۔

پادری کے چہرے پر مانکو کا سا سکون و اطمینان نہیں تھا۔ اُس کا پورا چہرہ اضطراب سے شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا اور اُس کی آنکھیں قیمتی تسبیحیں اور صلیبیں دیکھ دیکھ ہیرے اور لعل کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس نے اپنا اضطراب مجرم پر غصّہ اُتار کر، دُور کرنے کی کوشش کی "بے ادب کافر! تُونے کس گرجے یا خانقاہ پر ڈاکہ ڈال کر یہ نوادر حاصل کئے ہیں؟"

"محترم بزرگ! میں نے نہ ایک پر ڈاکہ ڈالا ہے نہ دوسرے پر" مجرم نے بڑے ادب سے پادری کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا "اگر واقعی یہ دولت کسی گرجے یا خانقاہ کی ہے تو صدیوں پہلے، میں نے نہیں، بلکہ اُس شہ سوار نے ڈاکہ ڈالا ہوگا جس کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔ میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ عالِ صاحب بہادر کے غصّے نے مجھے خاموش کر دیا۔ بات حقیقت میں یہ ہے کہ جب میں عرب شہ سوار کے گھوڑے پر چڑھا تو یہ چمڑے کی تھیلی مجھے اُس کی زین میں لٹکی ہوئی ملی، اور یقیناً اِس کے قیمتی جواہرات اُس لُوٹ کا حصّہ ہوں گے جس کا شکار صدیوں پہلے ہسپانیہ رہ چکا ہے۔"

اس مرتبہ عالِ مانکو کے بولنے کی باری تھی "ٹھیک ہے! لیکن سرِدست تمھیں "قرمزی بُرج" میں رہنے

پر اکتفا کرنی پڑے گی جس پر گو کسی طلسم کا اثر نہیں لیکن اُس میں تم اتنی ہی حفاظت سے رہو گے جیسے عربوں کے کسی طلسمی تہ خانے یا غار میں۔"

قیدی نے بڑے سکون سے کہا "حضور والا جو کچھ مناسب تصور فرمائیں وہی کریں۔ مجھے قلعے میں رہنے کی جو جگہ بھی دی جائے گی اُسے شکریے کے ساتھ قبول کروں گا۔ میدانِ جنگ میں رہا ہوا سپاہی، جیسا کہ حضور کو علم ہے، اپنے رہنے سہنے کے معاملے میں کسی طرح کے تکلّف کا عادی نہیں ہوتا۔ رات کو پیر پھیلانے کے لئے جگہ مل جائے اور پیٹ بھرنے کے لئے دو وقت کی روٹی ——— اس سے زیادہ کی مجھے ہوس اور ضرورت نہیں۔ میری یہ درخواست البتہ ہے کہ جس طرح حضور نے میرے معاملے میں احتیاط اور دُور اندیشی برتی ہے اِسی طرح قلعے کی طرف سے بھی غافل نہ ہوں ——— اور ہاں! میرے اُس ناچیز مشورے پر بھی توجہ فرمائیں جو میں نے غاروں کے مُنہ کو مضبوطی سے بند کرنے کے متعلق پیش کیا ہے۔"

یہ منظر یہیں تمام ہوا۔ مجرم کو قرمزی بُرج کے ایک مضبوط تہ خانے میں پہنچا دیا گیا، عرب گھوڑا عامل کے اصطبل میں بھیج دیا گیا اور چمڑے کی تھیلی سرکاری تجوری میں بند کر دی گئی۔ فیصلے کی آخری شق سے پادری صاحب نے اختلاف کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ مقدّس تبرکات کو، جو یقیناً کسی گرجے یا خانقاہ کو لُوٹ کر جمع کئے گئے ہیں سرکاری خزانے کے بجائے گرجے میں رکھا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ عامل کا فیصلہ ناطق تھا اور الحمرا کے حدود میں کوئی اُن پر نکتہ چینی نہیں کر سکتا تھا، پادری نے مصلحتاً اس بحث کو طول نہیں دیا لیکن دل میں یہ تہیّہ کر لیا کہ اس معاملے کی اطلاع غرناطہ کے گرجے کے بڑے پادری کو دے گا۔

عامل مانکو نے اجنبی سپاہی کے معاملے میں جو سخت فیصلہ صادر کیا اُس کی وضاحت کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انھیں دنوں غرناطہ کے گرد و نواح میں جبال البشرات میں قزاقوں کا ایک خطرناک گروہ مصروفِ عمل تھا اور اس گروہ کے قزاق، اپنے سردار مینول بوراسکو کی سرکردگی میں دیہاتوں کو تاراج کرتے پھرتے تھے اور کبھی کبھی بھیس بدل کر اس مقصد سے شہر میں بھی آ جاتے تھے کہ آنے جانے والے قافلوں یا دولت مند مسافروں کے نقل و حرکت کی اطلاعیں حاصل کریں اور انھیں دُور دراز کے ویران اور غیر آباد علاقوں میں جا کر لُوٹ لیں۔ ان مسلسل جارحانہ کارروائیوں نے حکومت کو اس معاملے کی طرف متوجہ کر رکھا تھا اور مختلف علاقوں کے عاملوں کو ہدایات بھیجی گئی تھیں کہ وہ مشتبہ لوگوں پر نظر

دکھیں ۔ گورنر مانکو کے قلعے اور اُس کے ادباش ساکنوں کے متعلق جو طرح طرح کی طنز آمیز باتیں اکثر کہی جاتی تھیں اُن کی بنا پر وہ دوسرے عاملوں کے مقابلے میں مشتبہ لوگوں کی طرف سے زیادہ ہوشیار اور باخبر رہتا تھا — اور اُسے یقین تھا کہ آج اُس نے اس گروہ کے کسی زبردست رُکن پر ہاتھ ڈالا ہے ۔

سپاہی کو قلعے میں قید کیا گیا اور اُس کے افسانے کو پر لگ گئے ۔ نہ صرف قلعے کے اندر بلکہ غرناطہ کے چپے چپے میں ہر ایک کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ بشرات کی پہاڑیوں والا نامی قزاق مینول بوراسکو عالی مانکو کے چنگل میں پھنس گیا ہے اور قرمزی برُج کی ایک حوالات میں قید ہے ۔ اس خبر کے پھیلتے ہی لوگ جوق در جوق اُس کے نظارے کیلئے آنے لگے ۔

قرمزی برُج ، جیسا کہ سب جانتے ہیں ، الحمرا سے الگ ایک دوسری پہاڑی پر بنا ہوا ہے ۔ ایک پُل دونوں پہاڑیوں کو ملاتا ہے اور اسی کے نیچے سے غرناطہ کی مشہور سڑک سوق الکبیر گزرتی ہے ۔ جس حوالات میں قیدی بند تھا اُس کی کھڑکیوں میں مضبوط سلاخیں جڑی ہوئی تھیں اور اُس کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا ۔ غرناطہ کے لوگ اس صحن میں قزاق کو دیکھنے کے لئے یوں جمع ہوتے تھے جیسے چرغ کے کٹہرے کے سامنے چڑیا گھر میں ۔ آنے والوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے جنھیں بوراسکو نے لوٹا تھا ۔ لیکن اس قیدی کو دیکھ کر اُن سب کی رائے یہ تھی کہ وہ قزاقوں کا سردار بوراسکو ہرگز نہیں تھا اس لئے کہ قزاق کی صورت بڑی ہیبت ناک تھی اور قیدی کے ہنس مکھ چہرے سے بالکل مشابہ نہ تھی ۔ لوگ شہر ہی کے اندر سے نہیں بلکہ دور دور سے اسے دیکھنے آئے لیکن کسی نے اس بات کی تائید نہیں کی کہ یہ مینول بوراسکو ہے ۔ اور اس لئے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ جو داستان مجرم نے سُنائی ہے کہیں وہ ٹھیک ہی نہ ہو ۔ یہ بات کہ ابی عبداللہ اور اُس کی فوج پہاڑ کے غار میں بند ہے لوگ اپنے آباؤ اجداد سے سُنتے آئے تھے اس لئے بہت سے لوگ اُس غار کی تلاش میں جس کا ذکر قیدی نے اپنی داستان میں کیا تھا جبل الشمس پر گئے ۔ کچھ نے غار کو باہر سے جھانک لینے پر اکتفا کی ، کچھ اُس کے اندر دور تک چلے گئے ۔

رفتہ رفتہ قیدی سپاہی اور آنے جانے والوں میں بے تکلفی ہو گئی ، وہ اُسے پسند کرنے لگے ۔ سپین میں پہاڑی قزاقوں کو ذلت کی اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا جو دوسرے ملکوں میں قزاقوں کے لئے عام ہے ۔ اس کے برخلاف نچلے طبقے کے لوگ اُسے ایک طرح کا سُورما سمجھتے ہیں ۔ عوام کا ایک دوسرا میلان یہ ہے کہ وہ حاکم طبقے کے فیصلوں پر نکتہ چینی

کرتے ہیں اس لئے بہت سے لوگوں نے عاملِ مانکو کی سخت گیری کو خاموش احتجاج کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا اور قیدی کو مظلوم و مقہور سمجھا جانے لگا۔

اِدھر قیدی کا یہ حال تھا کہ اُس کی خوش مزاجی و زندہ دلی ہر آنے جانے والے کے لئے ایک دلچسپ فقرہ تلاش کر لیتی۔ عورتوں سے خصوصاً وہ بڑی نرمی اور خوش خلقی سے بولتا تھا۔ اُسے کہیں سے ایک پرانا ستار مل گیا تھا۔ وہ ستار لے کر حوالات کی کھڑکی میں بیٹھ جاتا اور اُس پر محبت کے شیریں نغمے بجاتا۔ آس پاس کی عورتیں کھڑکی کے سامنے والے صحن میں اکٹھی ہو جاتیں، اُس کے نغمے سن کر خوش ہوتیں اور کبھی کبھی اُس کی تال پر رقص بھی کرنے لگتیں۔ بڑھی ہوئی داڑھی سلیقے کے ساتھ تراش دی گئی تو اُس کے سانولے چہرے میں ایک طرح کی کشش پیدا ہو گئی اور عورتوں نے عموماً اور عاملِ مانکو کی گداز جسم کنیز نے خصوصاً یہ کہنا شروع کر دیا کہ اُس کی چشمِ نیم باز میں بلا کی کشش ہے۔ نرم دل کنیز تو ملکہ پہلے ہی دن سے اُس کے معاملات میں دلچسپی اور ہمدردی ظاہر کرنے لگی تھی۔ جب وہ عامل کے دل کو موم نہ کر سکی تو اُس نے خاموشی سے قیدی کی راحت کا سامان مہیا کرنے کی طرف توجہ کی۔ وہ ہر روز عامل کے خوانِ نعمت سے بچے ہوئے کچھ ٹکڑے اُس کی معمولی غذا میں شامل کر دیتی، اور جب کبھی موقع مل جاتا تو انگوری شراب کا ایک سکون بخش شیشہ بھی اُس تک پہنچا دیتی۔

ایک طرف تو بوڑھے عامل کے زیرِ سایہ اس چھوٹی سی بغاوت کا سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف اُس کے بیرونی دشمن اُس کے خلاف ایک طوفان اٹھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ بات، خاصے مبالغوں کے ساتھ، غرناطہ کے حلقۂ اقتدار میں پہنچا دی گئی تھی کہ قیدی کے پاس سے سونے اور جواہرات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ برآمد ہوا ہے۔ اس خبر سے اختیارات کے حدود کا مسئلہ ایک بار پھر تازہ ہو گیا۔ عامل کے دائمی حریف، حاکم شہر کا دعوےٰ تھا کہ ملزم الحمرا کے حدود سے باہر گرفتار ہوا ہے اور اس لئے اُس پر عاملِ الحمرا کو کوئی اختیار نہیں۔ اس دعوے کے بعد اُس نے ملزم اور اُس کے پاس برآمد ہونے والے مال کو غرناطہ منتقل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اِسی طرح غرناطہ کے پادری کا دعوےٰ تھا کہ ملزم کے مال میں تسبیحوں، صلیبوں اور دوسرے تبرکات کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ اُس نے کسی گرجے یا خانقاہ کو تاراج کیا ہے اس لئے یہ مال سرکاری خزانے سے گرجا میں منتقل ہونا چاہیئے۔ اس اختلاف نے آہستہ آہستہ شدت اختیار کی۔ عامل چیخا چلایا اور اس فیصلے کا اعلان کیا کہ ملزم کو کسی اور کے حوالے

کرنے کے بجائے وہ اُسے جاسوسی کے جرم میں، الحمرا کے حدود میں پھانسی دے گا۔

اس خبر پر حاکم شہر نے دھمکی دی کہ وہ اپنے سپاہی لاکر ملزم کو زبردستی قرمزی برج سے شہر کی حوالات میں منتقل کرلے گا۔ غرناطہ کے بڑے پادری نے بھی حاکم شہر کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ عامل مانکو کو خاصی رات گئے حاکم شہر اور پادری کے فیصلوں کی اطلاع ملی۔ اُس نے اعتماد اور استقلال کے ساتھ جواب دیا "اُنھیں آنے دو۔ وہ مجھے پوری طرح تیار پائیں گے۔ جس شخص کا سابقہ کسی پرانے سپاہی سے ہو اُسے علی الصبح بیدار رہنا چاہیئے۔ اُس نے حکم دے دیا کہ علی الصبح قیدی کو الحمرا کی اندرونی حوالات میں منتقل کر دیا جائے۔ اور ساتھ ہی اپنی حسین کنیز کو ہدایت کی کہ "دیکھو! ننھی کنیز! مرغ کی بانگ سے پہلے دستک دے کر مجھے جگا دینا تاکہ سارے معاملے کی نگرانی میں خود کرسکوں۔"

صبح ہوئی اور مرغ نے بانگ دی لیکن عامل کی خواب گاہ پر کسی نے دستک نہ دی۔ سورج پہاڑی کی اوٹ میں سے نکل کر شہر کے برجوں اور میناروں کو روشن کرنے لگا اور اُس کی کرنیں عامل کی خوابگاہ کے دریچوں میں اٹھکیلیاں کرنے لگیں تو اُس کے معتمد کارپورل نے اُسے خواب شیریں سے بیدار کیا۔ کارپورل کے آہنی چہرے پر خوف کے نقوش ثبت تھے۔ وہ بہ مشکل سانس لیتے ہوئے چلایا "وہ چلا گیا، وہ بھاگ گیا!"

"کون چلا گیا؟ کون بھاگ گیا؟"

"سپاہی، قزاق، شیطان —— اُسے آپ جو چاہیں کہیے۔ اُس کی حوالات خالی ہے اور دروازہ مقفل ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح فرار ہوا۔"

"اُسے آخری بار کس نے دیکھا تھا؟"

"آپ کی کنیز نے۔ وہ اُس کے لیے رات کا کھانا لے کر گئی تھی۔"

"اُسے فوراً بلاؤ۔"

اور اس منزل پر ایک نئی اُلجھن پیدا ہو گئی۔ حسین کنیز کا کمرہ بھی خالی تھا۔ وہ رات کو اپنے پلنگ پر سوئی بھی نہیں تھی۔ یقیناً وہ بھی قیدی کے ساتھ فرار ہوئی، اس لیے کہ پچھلے چند دنوں سے دونوں کو رازدارانہ انداز میں باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔

یہ خبر عامل کے لیے بڑی دل شکن تھی لیکن ابھی اُسے اس غم کا ماتم کرنے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ ایک تازہ غم

اور پیش آیا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا تو اُس کی تجوری کا مُنہ کھلا پڑا تھا۔ سپاہی کی چمڑے کی تھیلی غائب تھی اور اُس کے ساتھ رائج الوقت ہسپانوی سکّوں کی دو تھیلیاں بھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ مفرور کیسے فرار ہوئے اور کس راستے سے فرار ہوئے؟ ایک بوڑھے کسان نے جو پہاڑ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہتا تھا، بیان کیا کہ صبح ہونے سے ذرا پہلے اُس نے ایک عرب گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی تھی۔ جب اُس نے اپنی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو عرب گھوڑے پر ایک مرد اور عورت سوار تھے۔

عاملِ مانکو نے چیخ کر کہا "اصطبل کی تلاشی لو۔"

اصطبل دیکھے گئے تو سب گھوڑے موجود تھے سوائے عرب گھوڑے کے۔ گھوڑے کے تھان کے قریب ایک موٹا سا ڈنڈا رکھا تھا۔ اُس میں ایک پرچہ بندھا ہوا تھا جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:

"عاملِ مانکو کی خدمت میں ــــ ایک پرانے سپاہی کی حقیر پیش کش۔"

---

# عرب نجومی کی داستان

کئی صدیاں گزریں غرناطہ پر ایک عرب بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام ابن حبوس تھا۔ ابن حبوس کی جوانی فتح و ظفر کی ایک مسلسل داستان تھی۔ لیکن اب جب کہ بڑھاپے نے اُسے ضعیف و ناتواں کر دیا تھا اُس کی واحد آرزو یہ تھی کہ اُس کی زندگی صلح و آشتی میں گزرے اور وہ اپنے روز و شب سکون کے ساتھ اپنی فتوحات کی حسین یادوں اور ان فتوحات سے حاصل کی ہوئی نعمتوں کی آسائشوں میں بسر کرے۔

لیکن زمانے نے سکون و آسائش کی یہ آرزو پُوری نہ ہونے دی۔ اس صلح جو اور آشتی پسند حکمراں کا مقابلہ ایسے حریفوں سے تھا جن کے جسموں میں شباب کا تازہ خون موجزن اور سروں میں شہرت و اقتدار کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اُس کے یہ نوجوان حریف بوڑھے جاں باز سے اپنے آباؤ اجداد کی شکستوں کا انتقام لینے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُس کی وسیع سلطنت کے وہ دُور افتادہ علاقے جنھیں اُس نے اپنی ہمت کے دِنوں میں مغلوب و محکوم رکھا تھا اب سرکشی اور بغاوت پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اور یہ بوڑھا جاں باز ہر طرف سے غنیموں سے گھرا ہوا تھا۔ چونکہ غرناطہ کے ہر طرف جنگلی اور پتھریلی پہاڑیاں ہیں اس لئے بدنصیب ابن حبوس کو

ہر وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی تھیں کہ نہ جانے شورش کے بادل کس طرف منڈلانے لگیں۔

اُس نے پہاڑیوں پر جا بجا حفاظتی چوکیاں قائم کر کے ہر ممکن رہ گزر پر فوجی دستے تعینات کر دیئے تھے کہ جب وہ دن یا رات کے وقت کسی طرف سے دشمن کو آتا دیکھیں تو مشعل اور دھوئیں کے ذریعے آنے والے خطرے کا اعلان کر دیں۔ لیکن ابن جبوس کی یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اس لئے کہ اُس کے دشمن کسی نہ کسی ایسے راستے سے جس کی طرف اُس کا دھیان بھی نہ جاتا تھا اُس کی سرزمین میں داخل ہوتے اور اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے تاراج کر کے پہاڑوں کی اوٹ میں جا چھپتے۔ یوں ابن جبوس جس سکون و راحت کا آرزومند تھا اُس سے محروم رہتا۔

بے چارہ ابن جبوس انہیں اُلجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا تھا کہ ایک دن ایک عرب حکیم اُس کے دربار میں حاضر ہوا۔ حکیم کی سفید ریش اُس کے پُورے سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور اُس کے جسم کا ہر عضو اُس کی پیرانہ سالی کا شاہد تھا۔ اس کے باوجود اُس نے مصر سے غرناطہ تک کا تقریباً پورا راستہ پا پیادہ طے کیا تھا اور اس طویل سفر میں اُس کا عصائے پیری اُس کا تنہا رفیق رہا تھا۔ اس بزرگ کا نام ابراہیم بن ابو ایّوب تھا۔ ابو ایّوب رسول اللہ صلعم کے صحابی تھے اور ابراہیم نے بھی آنحضرتؐ کا زمانہ دیکھا تھا۔ ابراہیم بن ابو ایّوب اپنے بچپن میں عمرو بن العاص کی فاتح فوجوں کے ساتھ مصر میں داخل ہوا اور یہیں مقیم رہ کر مصری راہبوں کی صحبت میں سحر کی تعلیم حاصل کی۔

ابراہیم کی شہرت اُس سے پہلے غرناطہ پہنچ چکی تھی اور لوگوں کا بیان تھا کہ وہ انسانی عمر کو طویل کرنے کے راز سے واقف تھا اور یہی راز تھا جس کی بدولت اب اُس کی عمر دو سو سال کی تھی۔ لیکن چونکہ اُسے اس راز کا علم اُس وقت ہوا جب اُس کے بال سفید ہو چکے تھے اور اُس کے چہرے پر جھرّیاں پڑ چکی تھیں اس لئے کہنہ سالی کی یہ دونوں علامتیں اُس میں موجود تھیں۔

ابن جبوس نے ابراہیم کا خیر مقدم بڑے احترام سے کیا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی اُس کا ایسا گرویدہ ہوا کہ اُسے اپنے محل کے اندر رکھنے پر آمادہ تھا۔ لیکن بزرگ نجومی نے قصرِ شاہی میں رہنے کے بجائے غرناطہ کے قریب کی اُس پہاڑی کے ایک غار میں رہنے کو ترجیح دی جہاں اب الحمرا بنا ہوا ہے۔ نجومی نے غار کو کشادہ کروا کے اُسے

ایک وسیع دالان کی شکل دے دی اور اُس کے اوپر کے رُخ ایک گول سوراخ بنوا دیا جس میں سے وہ نصف النہار کے وقت بھی ستاروں کا نظارہ کر سکتا تھا۔ اس دالان کی دیواروں پر ہر طرف علمُ الرّجال و علم الانساب کے شجرے، علاماتِ سحر اور نجوم کی علامتی صُورتیں نصب و آویزاں تھیں۔ دالان کے مختلف حصّوں کو ایسے آلات سے آراستہ کیا گیا تھا جو غرناطہ کے ماہر کاریگروں کے بنائے ہوئے تھے اور جن کے مقصد اور خواص سے سوائے ابراہیم کے اور کوئی واقف نہ تھا۔

تھوڑی ہی مدّت میں ابراہیم حکیم بادشاہ کا مقرّب ترین مشیر بن گیا اور بادشاہ تمام ضروری اُمور میں اُس کے مشوروں کا محتاج رہنے لگا۔ ایک دن ابن حبوس ابراہیم کے سامنے اپنے ہمسایہ حکمرانوں کے اُس ظلم و ناانصافی کا شکوہ کر رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کا سارا سکون و اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ بادشاہ اپنی بات ختم کر چکا تو حکیم نے کچھ دیر خاموش رہ کر بادشاہ سے کہا کہ "اے بادشاہ! اپنے مصر کے قیام میں مجھے ایک راہب کی بنائی ہوئی ایک حیرت انگیز چیز دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ شہر بورسا کے اُوپر وادیٔ نیل کے رُخ کی ایک پہاڑی پر ایک بھیڑ کا مجسمہ بنا ہُوا تھا۔ بھیڑ کے مجسّمے پر ایک مُرغ کا مجسّمہ تھا۔ یہ دونوں مجسّمے پیتل کے تھے اور ایک محور پر گردش کرتے رہتے تھے۔ جب کبھی مُلک پر کسی دُشمن کے حملے کا خطرہ ہوتا بھیڑ کا مُنہ اُس طرف کو پھر جاتا جدھر سے دُشمن آنے والا ہوتا اور مُرغ بانگ دینے لگتا۔ یہ بانگ لوگوں کو آنے والے خطرے سے خبردار کر دیتی اور وہ حملے کی مدافعت کی پُوری تیاری کر لیتے۔"

حکیم کی بات سُن کر بادشاہ نے کہا "اللہ اکبر! اس طرح کی بھیڑ اگر مجھے میسّر آجائے اور اس طرح کا مُرغ اگر خطرے کے وقت مجھے بھی بانگ سُنا سکے تو میں سمجھوں کہ مجھے دُنیا کی سب سے بڑی دولت مل گئی۔ اللہ اکبر! ان دو پاسبانوں کی پاسبانی میں میں کتنے سکون کی نیند سوؤں؟"

حکیم اُس وقت تک خاموش رہا جب تک بادشاہ کا جوش کم نہ ہو گیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:

"مصر کی فتح کے بعد بھی میں وہیں رہا اور راہبوں میں رہ کر اُن کے دین و عقیدے کے رسوم و قواعد کا مطالعہ کرنے لگا۔ میری خواہش یہ تھی کہ اُن کی صحبت میں رہ کر اُن پوشیدہ علوم میں مہارت حاصل کروں جن

کے لیے راہب دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں دریائے نیل کے کنارے بیٹھا ایک معمّر راہب سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے راہب نے اُن سربلند اہرام کی طرف اشارہ کیا جو ریگستان میں پہاڑوں کی طرح استادہ تھے اور کہنے لگا "جو علم تم ہم سے حاصل کر رہے ہو وہ اُس علم کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو اِن عظیم الشّان عمارتوں میں مخفی ہے۔ مرکزی اہرام کے وسط میں ایک گنبد ہے، جس میں اُس بزرگ راہب کی ممی محفوظ ہے، جس کے ذہن میں ان عظیم الشان اہرام کی تعمیر کا تصوّر پیدا ہوا۔ اِن بزرگ کے ساتھ ایک کتاب بھی مدفون ہے، جو سحر و فن کے جملہ بیش بہا علوم کا سربستہ خزینہ ہے۔ یہ کتاب ہبوطِ آدم کے بعد اُنھیں ملی تھی اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہوئی حضرت سلیمان الحکیم تک پہنچی تھی۔ اسی کتاب کے سکھائے ہوئے رموز کی مدد سے اُنھوں نے بیت المقدّس کی تعمیر کی۔ یہ کتاب اہرام کے بانی کے ہاتھ کس طرح آئی —— اس کا علم صرف اُسے ہے جو سب داناؤں کا دانا ہے۔"

مصری راہب کی یہ باتیں سُن کر میرے دل میں اِس کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش شعلے کی طرح مشتعل ہو گئی۔ فاتح لشکر کے بہت سے سپاہیوں اور مصر کے بہت سے مقامی باشندوں کی مدد سے میں نے اہرام کے سنگین آہنی پتھروں میں سوراخ کرنے کا تہیّہ کیا، اور بالآخر عرصے کی محنتِ شاقّہ اور جاں فشانی کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ پتھر میں سوراخ ہو گیا اور میں اندر داخل ہوا تو ایک پوشیدہ راستہ نظر آیا۔ اس راستے پر چلتا اور اس میں سے نکلنے والے بے شمار پیچ در پیچ راستوں کے جال سے گزرتا، جو پتھروں کا سینہ چیر کر بنائی گئی تھیں، میں بالآخر اس گنبد میں پہنچ گیا جہاں بزرگ راہب کی ممی صدیوں سے محفوظ و مدفون تھی۔ میں نے ممی کے بیرونی بکسوں کو توڑا اور اُن بے شمار غلافوں کو اُتارا جن میں ممی لپٹی ہوئی تھی تو علوم کا خزینۂ سربستہ ممی کے سینے پر رکھا ہوا ملا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتاب کو اُٹھایا اور ممی کو اُس کے تاریک اور خاموش مستقر میں یوم الحساب کا منتظر چھوڑ کر بھول بھلیّاں بھٹکتا اہرام کے باہر نکل آیا۔"

ابن حبوس یہ روداد سُن کر حسرت سے بولا "اے ابن ابو ایّوب! تم بہت بڑے سیّاح ہو اور تم نے اپنی زندگی میں حیرت انگیز چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن اہرام کا رازِ سربستہ اور سلیمان الحکیم کی کتاب العلم میرے کس کام کی؟"

"نہیں! اے بادشاہ! ایسا نہیں۔ کتاب کے مطالعے سے میں نے علومِ سحر کے بے شمار راز سیکھے ہیں اور جنّات سے اپنے ہر کام کی تکمیل میں مدد لے سکتا ہوں۔ میں بورسا کے طلسم سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور اس سے زیادہ موثر

طلسم تیار کر سکتا ہوں۔"

ابن حبوس بے تابی سے بولا "اے حکیم دانا، ابن ابو ایوب! پہاڑوں پر میں نے جتنے حفاظتی بُرج تعمیر اور سرحدوں پر جتنے حفاظتی دستے تعینات کیے ہیں، تمھارا طلسم اُن سب سے زیادہ مؤثر ہوگا۔ خدا کے لیے یہ طلسم بناؤ ——— میرے خزانے کے سب زر و جواہر تمھارے قدموں پر نثار ہیں۔"

دانا نجومی بادشاہ کے حکم اور خواہش کے مطابق اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے جبل البیازین کے کنارے پر، قصرِ شاہی کے اُوپر ایک بہت بڑا بُرج بنوایا۔ اس بُرج کی تعمیر کے لیے اہرامِ مصر کے پتھر لائے گئے تھے۔ بُرج کے بالائی حصّے میں ایک مدوّر دالان تعمیر ہوا اور اس کے ہر رُخ پہ ایک کھڑکی بنوائی گئی۔ ہر کھڑکی کے سامنے ایک میز لگائی گئی۔ اِس میز پہ شطرنج کے مہروں کی طرح، لکڑی کے پیادہ اور سوار سپاہیوں کی ایک فوج ترتیب دی گئی جس کی سرداری میں اُس خاص سمت کے دیوتا کا مجسمہ بنایا گیا، جدھر کھڑکی کا رُخ تھا۔ ہر میز کے ساتھ ایک چھوٹی سی برچھی آویزاں تھی، جس پر کلدانی زبان میں کوئی عبارت نقش تھی۔ اس دالان کا پھاٹک پیتل کا تھا، جو ہر وقت مقفّل رہتا تھا اور اس کی کنجی بادشاہ کے قبضے میں رہتی تھی۔

بُرج کے اُوپر ایک عرب سوار کا ایک کانسی کا بنا ہوا مجسمہ نصب تھا۔ مجسمے کے ایک ہاتھ میں ڈھال تھی اور دوسرے میں برچھی۔ یہ مجسمہ ایک گردش کرنے والے محور پر نصب کیا گیا تھا اور اس کا رُخ شہر کی طرف تھا لیکن کسی سمت سے دُشمن کے حملے کا خوف ہوتا تو مجسمے کا منہ اِسی رُخ پھر جاتا اور مجسمے کے ہاتھ کی برچھی اس طرح تن جاتی جیسے حملہ کرتے وقت۔

طلسم بن کر تیار ہو گیا تو ابن حبوس کا دل اس کی تاثیر آزمانے کے لیے بے قرار ہوا۔ پہلے اُس کا دل جنگ و جدال سے بچنے کی جس آرزو سے بے چین رہتا رہتا اُس کی جگہ اب جنگ جوئی کی تمنّا مچلنے لگی۔ ابن حبوس کی یہ تمنّا بہت جلد پوری ہوئی۔ ایک صبح بُرج کا محافظ سنتری یہ خبر لایا کہ کانسی کے مجسمے کا منہ جبل البیرۃ کی طرف پھر گیا ہے اور مجسمے نے اپنی برچھی درۂ لوپہ کی طرف تان رکھی ہے۔

ابن حبوس نے یہ خبر سُنی تو طبل و قرنا بجانے اور غرناطہ کے لوگوں کو جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم صادر کر دیا۔ دانا نجومی نے یہ سُنا تو بادشاہ سے کہنے لگا: "اے بادشاہ! شہر والوں کو پریشان نہ کیجیے اور اپنے سپاہیوں

کو بھی مسلح ہونے کی تکلیف نہ دیجئے۔ ہمیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجوں کی مدد کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے ملازمین کو رخصت کر دیجئے اور میرے ساتھ برج کے خفیہ دالان میں تشریف لے چلئے۔"

بوڑھے ابن حبوس نے اپنے سے بھی زیادہ بوڑھے ابراہیم بن ابو ایوب کے بازو کا سہارا لیا اور برج پر چڑھنے لگا۔ پیتل کا دروازہ کھلا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ دروازہ دوبہ کے رخ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

نجومی نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اے بادشاہ! خطرے کا رخ یہی ہے۔ ذرا آگے بڑھیے اور طلسمی میز کا تماشا ملاحظہ فرمائیے۔"

ابن حبوس میز کی شطرنج نما بساط کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ بساط کے سب مہرے، پیدل اور سوار، حرکت میں تھے۔ گھوڑے جست و خیز میں مصروف تھے اور جنگجو سپاہی نیزے اور تلواریں چلا رہے تھے۔ طبل و قرنا کی دھیمی دھیمی آوازیں اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ بساط کے میدانِ کارزار میں گونج رہی تھی بالکل اس طرح جیسے شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ یا بھونرے کی گن گناہٹ جو دوپہر کے سناٹے میں سونے والے نیند کے ماتوں کو مدہوشی کے نغمے سناتی ہے۔

"بادشاہ سلامت! دیکھیے" نجومی نے بادشاہ سے کہا "آپ کے دشمن میدانِ جنگ میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ دشمن کی صف میں انتشار پیدا ہو جائے اور وہ جان کے زیاں کے بغیر میدانِ جنگ سے بھاگ جائیں تو ان کٹ پتلیوں پر اس طلسمی برچھی کا دستہ پھیر دیجئے۔ اگر آپ میدانِ جنگ میں قتل و خوں ریزی کا نظارہ کرنے کے خواہش مند ہیں تو ان کے جسموں پر برچھی کی نوک لگا دیجئے۔"

ابن حبوس کے چہرے پر خون کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے برچھی امید و بیم کے کانپتے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ اس کی سفید ڈاڑھی کے بالوں پر اشتیاق کی ہیبت بکھر گئی اور طلسمی میز کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے نجومی سے کہا "ابن ابو ایوب! میرا جی چاہتا ہے کہ خون کی سرخی دیکھوں۔"

یہ کہا اور ننھی برچھی کا ایک سرا بساط کے کچھ مہروں پر پھیر دیا اور پھر برچھی کا رخ بدل کر بساط کے کچھ اور مہروں پر پھیر دیا۔ اس طلسمی عمل سے کچھ مہرے مردوں کی طرح بے حس و حرکت بساط پر گر پڑے اور کچھ بے تحاشا اور اندھا دھند ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

بوڑھے نجومی نے بہ مشکل "صلح جو" اور "امن پسند" جموس کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ طلسمی برچھی کی مدد سے قتل و غارت کے شعلوں کو سرد کرے۔

طلسمی جنگ ختم ہو چکی تو نجومی اور بادشاہ طلسمی برج سے باہر نکل آئے اور سرکاری جاسوس جبل البیرۃ کی سمت روانہ کئے کہ خبریں لے کر آئیں۔ جاسوس بہت جلد واپس آ گئے اور یہ خبر سنائی کہ عیسائیوں کی ایک فوج غرناطہ کے رُخ آ رہی تھی کہ اُن میں پھوٹ پڑ گئی اور خاصی جنگ و خون ریزی کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئی۔

طلسم کی تاثیر دیکھ کر ابن جموس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ وہ فرطِ مسرت سے چلّا اُٹھا "آخر اب میں سکون و راحت کی زندگی بسر کر سکوں گا اور میرے سب دشمن میرا لوہا مانیں گے۔ اے ابو ایوب کے دانا فرزند! بتاؤ اتنی بڑی نعمت مہیا کرنے کے عوض میں تمھیں کیا انعام دوں؟"

"ایک بوڑھے فلسفی کی ضرورتیں مختصر اور سادہ ہوتی ہیں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ آپ میرے غار کو ایک درویش کی کٹیا کی طرح آراستہ کروا دیں۔ مجھے اس سے زیادہ کی آرزو نہیں۔"

انعام کی سادگی پر دل ہی دل میں مسرور ہو کر ابن جموس نے کہا "جو لوگ حقیقت میں حکیم و دانا ہیں اُن کے انکسار میں کتنی عظمت و سربلندی ہے!" اُس نے خزانچی کو طلب کیا اور حکم دے دیا کہ حکیم کو غار کے آراستہ کرنے کے لئے جتنی رقم کی ضرورت ہو وہ سرکاری خزانے سے مہیا کی جائے۔

نجومی نے ٹھوس اور سنگین چٹان کو ترشوا کر اُس کے اندر ایک دوسرے سے ملحق کئی ایوان تعمیر کروائے۔ ان ایوانوں کو بیش بہا مسندوں اور دیوانوں سے آراستہ کیا۔ دیواروں پر دمشق کے نادر ریشم کے زردوزی پردے آویزاں کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے لئے اُس کے پاس یہ جواز تھا کہ "میں بڈھا ہوں اور میری ہڈیوں کو پتھر کے بچھونوں پر آرام نہیں مل سکتا، اور نم اور مرطوب دیواروں کے لئے پوشش لازمی ہے۔"

کٹیا کے حماموں کو عطروں اور عود و عنبر کی خوشبوؤں سے معطر کیا گیا۔ نجومی کا خیال تھا کہ "عمر کی درشتی کو دور کرنے اور مطالعے کی گرمی سے جھلس جانے والے جسم میں تازگی و شگفتگی پیدا کرنے کے لئے حمام کا غسل ضروری ہے۔"

نجومی نے اپنے مسکن کے گوشے گوشے میں نقرئی اور بلوریں چراغ آویزاں کروائے اور ان کے لئے ایک خاص روغن تیار کروایا جس کا نسخہ اُس نے اہرامِ مصر کے نہاں خانوں سے حاصل کیا تھا۔ اس روغن کی بھینی خوشبو

دائمی تھی اور اس کی نرم اور دھیمی روشنی صبح صادق کے نور سے مشابہ تھی۔ دانا نجومی کا خیال تھا کہ "سورج کی تیز روشنی بڈھوں کی نظر کے لئے خیرہ کن ہوتی ہے۔ فلسفی کی مطالعہ کرنے والی آنکھوں کو چراغ کی مانوس روشنی میں زیادہ سکون ملتا ہے۔"

شاہ ابن حبوس کا خزانچی فلسفی کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے تنگ آ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن شاہی حکم صادر ہو جائے تو اسے واپس نہیں لیا جا سکتا۔ بادشاہ نے کندھوں کو جھٹک کر کہا۔ "گھبراؤ مت! ذرا تحمل سے کام لو۔ بڈھے فلسفی کے تصورات کا مخزن و منبع اہرام مصر کے تہہ خانے اور وہاں کے وسیع پر شکوہ ویرانے ہیں ——— لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ فلسفی کی کٹیا کی آرائش بھی آخر ایک دن ختم ہو جائے گی۔"

بادشاہ کا قیاس درست نکلا۔ آخر ایوان حکمت کی آرائش و زیبائش ختم ہوئی اور فلسفی کی کٹیا نے ایک عدیم النظیر زمین دوز قصر شاہی کی صورت اختیار کر لی۔ فلسفی نے آرائش و زیبائش پر پسندیدگی اور اطمینان ظاہر کیا اور اپنے ایوان کو ہر طرف سے بند کر کے تین شب و روز مطالعے میں مستغرق رہا۔ لیکن تین دن کے بعد وہ پھر خزانچی کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا "ایک چیز کی ضرورت باقی رہ گئی ——— ایک معمولی سی چیز کی، جو مطالعے کی جانکاہی کے بعد مجھے تھوڑا سا سکون دے سکے۔"

"اے حکیم دانا! آپ کو اپنی مراقبے کی زندگی میں جس چیز کی بھی ضرورت ہو یہ خادم بسر و چشم مہیا کرے گا۔ بتائیے اب آپ کو کیا چاہیئے؟"

"مجھے رقص کرنے والی چند لڑکیوں کی ضرورت ہے۔"

"رقص کرنے والی لڑکیاں" خزانچی نے حیرت سے اس کی بات دہرائی۔

"رقص کرنے والی لڑکیاں" حکیم نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا "لیکن اس کا خیال رکھیئے کہ رقص کرنے والیاں نوجوان ہوں اور حسین ہوں۔ اس لئے کہ حسن و شباب کا نظارہ فرحت بخش ہوتا ہے ——— اور ہاں! دیکھو میری ضرورت کے لئے صرف چند کافی ہیں اس لئے کہ فلسفیوں کی عادتیں سادہ ہوتی ہیں اور انھیں زیادہ چیز کی ہوس نہیں ہوتی۔"

ایک طرف تو فلسفی مزاج ابراہیم ابن ابو ایّوب اپنی کٹیا میں یوں درویشی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور دوسری طرف "صلح پسند" ابن حبوس اپنے بُرج میں بند خونی مہمیں سر کرنے میں مگن تھا۔ اُس جیسے پیرانہ سال اور تنہائی پسند بادشاہ کے لئے جنگوں کا اس طرح آسان ہو جانا اور بڑے بڑے لشکروں کا مکھیوں کے جھنڈوں کی طرح دیکھتے دیکھتے فنا ہو جانا ایک ایسی عجیب و غریب بات تھی جس میں اُسے انتہائی لطف آتا تھا۔

کچھ عرصے تک ابن حبوس کی لطف اندوزی کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ وہ اپنے ہمسایہ بادشاہوں کو طعنے دے دے کر اُن کی توہین کرتا کہ وہ مشتعل ہو کر حملہ کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کے ہمسائے اپنی تباہی سے اتنے عاجز آئے کہ حملے اور جنگ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے۔ مہینوں کانسی کا پاسبان اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا اور مہینوں اُس کی طلسمی برچھی فضا میں سیدھی تنی رہی، اور بوڑھے ابن حبوس کو اپنی بے شغلی اور صلح و آشتی کے روز و شب سے اُلجھن اور بے چینی ہونے لگی۔

لیکن آخر کار، ایک دن طلسمی مجسمے کو حرکت ہوئی اور وہ اپنی برچھی جبل قادش کی طرف تان کر کھڑا ہو گیا۔ ابن حبوس فوراً طلسمی بُرج میں آیا لیکن جس سمت برچھی کا رُخ تھا اُدھر کی میز آج ہنگاموں سے خالی تھی۔ کوئی پیادہ و سوار حرکت میں نہ تھا۔ اس عجیب و غریب صورت حال سے پریشان ہو کر اُس نے کچھ سوار جبل قادش کی طرف روانہ کیے کہ وہاں کے حالات کی خبر لائیں۔ مخبر دو تین دن بعد واپس لوٹے اور آ کر یہ پیام دیا:۔

"ہم نے پہاڑ کا کونا کونا چھان مارا لیکن وہاں نہ برچھیاں ہیں نہ تلواریں۔ البتہ اپنی تلاش و جستجو میں ہمیں ایک عیسائی حسینہ دوپہر کے وقت ایک فوارے کے قریب سوتی ہوئی ملی۔ حسینہ شباب و رعنائی کا لاثانی مرقع ہے اور ہم اُسے گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں لائے ہیں۔"

"ایک عیسائی حسینہ — شباب و رعنائی کا لاثانی مرقع" یہ کہتے ہوئے ابنِ حبوس کی آنکھیں جوشِ مسرت سے چمک اُٹھیں اور اُس نے حکم دیا "حسینہ کو فوراً میری خدمت میں حاضر کرو۔"

حسینہ بادشاہ کے حضور لائی گئی۔ عرب فتح کے وقت ہسپانوی دوشیزائیں جس طرح کے زیورات پہنتی تھیں، اس عیسائی حسینہ کا جسم ان کے منتخب اور بیش بہا نمونوں سے آراستہ تھا۔ اُس کی آبنوسی زلفوں کا ہر تار خیرہ کن سفید موتیوں سے گندھا ہوا تھا، اور اُس کی پیشانی پر پڑے ہوئے ٹیکے کے گوہر تابدار تابانی میں اُس

کی چشمِ رعنا کی ہمسری کے دعوے دار تھے۔ اُس کی مرمریں گردن میں ایک طلائی زنجیر تھی جس میں ایک نقرئی بربط آویزاں تھا۔

حسینہ کی سیاہ شعلہ سامان آنکھوں کے شعلوں نے ابنِ حبوس کے پژمردہ لیکن آتش گیر دل کو گرمیٔ محبت سے مشتعل کر دیا، اور اُس کے عشرت خیز قدِ رعنا کی شرابِ سیّال نے اُس کے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ اُس نے عالمِ مدہوشی میں حسینہ کو مخاطب کر کے کہا "نسوانی حسن کی مکمل ترین تصویر! تم کون ہو اور کیا ہو؟"

"ایک عیسائی حکمراں کی شہزادی، جو چند دن پہلے تک ایک وسیع مملکت کا آقا و سرتاج تھا لیکن اُس کی فوجیں، جیسے کسی طلسم کی تاثیر سے پہاڑوں میں غارت ہو گئیں۔ بادشاہ نے ترکِ وطن کیا اور اُس کی چہیتی بیٹی اسیر ہوئی۔"

ابراہیم ابن ابوایوب نے بادشاہ کے کان میں جھک کر کہا "اے بادشاہ! خبردار! ممکن ہے کہ یہ بھی ویسی ہی کوئی ساحرہ ہو، جو عجیب عجیب بھیسوں میں آ کر غافلوں کو اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بناتی ہیں۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں سحر اور ہر حرکت میں طلسم کا سایہ نظر آتا ہے۔ یقیناً یہی وہ غنیم ہے جس کی طرف طلسمی سنتری نے اشارہ کیا تھا۔"

"اے ابوایوب کے فرزند!" بادشاہ نے جواب دیا "مانا کہ تم صاحبِ حکمت و دانش ہو اور دُنیا کا کوئی علم تمہاری نظر سے پوشیدہ نہیں لیکن تم صنفِ نازک کے رازوں سے ناآشنا ہو۔ اِس علم میں میں کسی کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ اس معاملے میں سلیمان الحکیم کی حکمت کا بھی قائل نہیں ہوں، اس کے باوجود کہ اُن کے حرم میں بے شمار کنیزیں اور شہزادیاں تھیں —— اور جہاں تک اس حسینہ کا تعلق ہے مجھے اُس میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا پھر وہ میری منظورِ نظر بھی ہے۔"

"سنو! اے شہنشاہ!" نجومی نے جواب دیا "میرے دیئے ہوئے طلسم سے تم نے نہ جانے کتنی فتوحات حاصل کی ہیں لیکن کبھی مالِ غنیمت میں مجھے اپنا شریک نہیں بنایا۔ اِس مالِ غنیمت میں میرا جو حصّہ ہے اُس کے بدلے میں مجھے یہ حسین قیدی دے دو کہ میں اپنی تنہائیوں میں اس کے بربط کے نغموں سے سکون و راحت پا سکوں۔ اگر یہ واقعی کوئی ساحرہ ہے تو میرے پاس اس کے سحر کے بے شمار رَد موجود ہیں۔"

" کیا کہا ؟" ابن حبوس نے چیخ کر کہا "ابھی حسین عورتوں سے تمہارا جی نہیں بھرا؟ کیا تمہارے ایوان میں رقص کرنے والی دوشیزاؤں کی کوئی کمی ہے ؟"

" یہ صحیح ہے کہ میرے ایوان میں حسین رقاصاؤں کی کمی نہیں۔ لیکن یہ ایوان کسی مطربہ کے دلنواز نغموں سے خالی ہے ۔ اور مطالعے کی تھکن کے بعد مجھے نغمہ جیسے سامانِ راحت کی ضرورت ہے ۔"

بادشاہ بے صبری سے چلایا " تمہاری درویشانہ آرزوؤں پر اللہ کی رحمت! اس حسینہ کو میں نے اپنے لئے منتخب کیا ہے ۔ اس کا نظارہ میرے لئے اسی طرح سکون بخش ہے جس طرح داؤدؑ کے لئے ابیشغ کا قرب ۔"

نجومی کی زیادہ خوشامدوں اور زیادہ دھمکیوں نے بادشاہ کے رویّے میں زیادہ سختی پیدا کی اور بالآخر اُس کے ایک شکست جواب نے نجومی کو قطعی مایوس کر دیا اور وہ ناخوش و ناراض وہاں سے رخصت ہوا ۔ تاہم چلتے چلتے اُس نے ایک بار پھر بادشاہ کو حسین قیدی کے خطروں سے آگاہ کر دیا ۔ لیکن بڑھاپے کا عشق مشوروں اور انجام دونوں کی طرف سے غافل ہوتا ہے ۔ نجومی اور بادشاہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ——— ایک اپنے کلبۂ حکمت میں اپنی مایوسی و محرومی کا ماتم کرنے اور دوسرا قصرِ شاہی میں اپنی ہوس پرستی کی داد دینے ۔

زندگی میں اب اُس کی واحد تمنّا یہ تھی کہ اپنے آپ کو حسین شہزادی کی نظر میں محبوب بنائے ۔ جوانی نہیں تھی کہ اُس کی سفارش کرتی لیکن اس کی تلافی کے لئے اُس کے پاس دولت تھی اور جب عاشق بوڑھا ہو تو وہ عموماً دریا دل ہوتا ہے ۔ غرناطہ کے سلاطین کے ہر گوشے سے مشرقی دُنیا کے بیش بہا تحائف مہیّا کئے گئے ——— ریشمی ملبوس، قیمتی زیور، موتی جواہرات، عطر، تیل، ایشیا اور افریقہ کی تمام نادر و بیش بہا مصنوعات شہزادی کے قدموں پر نثار کر دی گئیں ۔ اُس کی دل دہی کے لئے نئے سے نئے مناظر اور دلچسپ سے دلچسپ تفریحات فراہم کی گئیں ——— رقص و سرود، بازیٔ و نغمہ، کھیل تماشے، کشتیاں اور جانوروں کی لڑائیاں، اور غرناطہ کچھ عرصے کے لئے عیش و نشاط کا اکھاڑا بن گیا ۔ حسین شہزادی نے اس سارے ساز و سامان، اس سارے شان و شکوہ کو اس بے نیازی کی نظر سے دیکھا جیسے وہ اُس کے معمولات میں داخل ہوں ۔ وہ ان سب چیزوں کو اپنے منصبِ بلند، بلکہ بارگاہِ حسن میں نذرانہ سمجھ کر قبول کرتی، اس لئے کہ حسن کا شکوہ مراتب و مناصب کے شکوہ

سے بلند تر ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف تو بادشاہ کی ہر فیاضی و دریادلی کو شب و روز کا ایک معمولی تماشا سمجھتی اور دوسری طرف دل ہی دل میں اس خیال سے مسرور ہوتی کہ اُس کی یہ فیاضی و دریادلی اُس کے خزانے کو خالی کر رہی ہے —— اور ستم یہ تھا کہ یوں اپنے گھر کو آگ لگا کر بھی بادشاہ کو یقین نہ تھا کہ اُس نے اپنی حسین محبوبہ کے دل میں کوئی جگہ بنائی ہے یا نہیں۔ یہ درست ہے کہ شہزادی کبھی اُس سے خفگی سے پیش نہیں آئی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُسے دیکھ کر کبھی اُس کے لبوں پر تبسّم نہیں کھیلا۔

کبھی کبھی جب بادشاہ شہزادی کے سامنے اپنا جوشِ محبت ظاہر کرتا تو وہ اپنا نقرئی بربط بجانے لگتی اور اُس کے سحر آگیں نغمے کی تاثیر سے بادشاہ از خود رفتہ ہو جاتا، اُس پر مدہوشی طاری ہوتی اور وہ دیکھتے دیکھتے خوابِ راحت کے مزے لینے لگتا۔ کچھ دیر بعد جب اُس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو شگفتہ و مسرور پاتا اور اُس کا جوشِ محبت کم از کم اُس وقت کے لئے رخصت ہو چکا ہوتا۔ بادشاہ کے لئے اس مدہوشی اور از خود رفتگی میں ایک عجیب لذّت تھی۔ وہ مدہوش ہوتا تو اُسے اتنے حسین خواب دکھائی دیتے کہ اُس نے زندگی کی ہر چیز ان خوابوں پر نثار کر دی۔ غرناطہ کا پیراں سال بادشاہ خوابِ نوشیں کی لذتوں میں سرشار صرف خوابوں کی لذت کے لئے جی رہا تھا، اُس کی رعایا اُس کی اِس مدہوشی پر طعنہ زن تھی اور نقرئی بربط کے ایک نغمے کے عوض غرناطہ کا خزانہ خالی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اور بالآخر ابن حبوس کے سر پر ایک ایسی بلا نازل ہوئی جس کی اطلاع طلسمی سنتری نے بھی اُسے نہ دی۔ خود غرناطہ میں بغاوت کا ایک فتنہ اُٹھا۔ مسلح باغیوں نے قصرِ شاہی کو گھیر لیا اور بادشاہ اور اُس کی حسین محبوبہ کی جان کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا۔ بادشاہ کے سینے میں جان بازی کے فطری جذبے کی ایک چنگاری روشن ہوئی، وہ اپنے محافظ دستے کو لے کر باہر نکل آیا اور بغاوت کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

بغاوت فرو ہو گئی تو بادشاہ نے نجومی کی طرف رُخ کیا، جو اب بھی اپنے ایوانِ حکمت میں بند مایوسی کی تلخی کو خوشگوار بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

ابن حبوس نے صلح جوئی اور دوست داری کے لہجے میں اُسے مخاطب کیا "اے ابوایوب کے دانا فرزند! تم نے مجھے اُن خطروں سے خبردار کیا تھا جو مجھے اِس حسین قیدی سے پیش آنے والے ہیں۔ کیا

تم جس کی نظر آنے والی ہر چیز پر ہے، مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ میں ان خطروں سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہوں؟"

"خطروں سے محفوظ رہنے کی صرف یہ ترکیب ہے کہ جو چیز ان خطروں کا سبب بننے والی ہے اُسے اپنے سے دُور کر دو۔"

ابن حبوس مایوسی کے عالم میں چلّایا "اپنی سلطنت سے جدائی ممکن ہے، لیکن اُس سے نہیں۔"

"تو اندیشہ ہے کہ تم دونوں کو نہ کھو بیٹھو" نجومی نے جواب دیا۔

"اے حکیموں کے حکیم اور داناؤں کے دانا! غصّے سے کام نہ لو۔ ایک بادشاہ اور ایک عاشق کے غم کو پہچانو اور مجھے کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ میں اُن خطروں سے بچ سکوں جن میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے شان و شکوہ کی آرزو نہیں، مجھے قوّت و جبروت کی تمنّا نہیں۔ مجھے سکون چاہیئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے کوئی ایسا گوشۂ عافیت مل جائے جہاں مجھے دُنیا سے، اُس کے غموں سے، اُس کی فکروں سے، اور اُس کی ذمہ داریوں سے نجات مل سکے اور میں اپنے دن سکون اور محبت کی آغوش میں بسر کر سکوں؟"

نجومی نے بادشاہ کو اپنی گھنی پلکوں میں سے دیکھا اور پوچھا:۔

"اور اگر تجھے ایسا گوشۂ عافیت مل جائے تو مجھے کیا دے گا؟"

"اپنا انعام تم خود تجویز کرو۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ اگر وہ میرے اختیار میں ہے تو تمہیں ملے گا۔"

"اے بادشاہ! تو نے باغِ ارم کا نام سُنا ہے، جس کا وعدہ اللہ نے مومنوں سے کیا ہے؟"

"ہاں سُنا ہے! اس کا ذکر قرآن پاک میں ہے اور بارہا اُن کی زبانی میرے کانوں تک پہنچا ہے جو مکّے کی زیارت کر کے واپس آئے ہیں۔ لیکن باغِ ارم کی جو حیرت انگیز باتیں میں نے سُنی ہیں اُنھیں میں نے کبھی سیّاحوں کے دلفریب افسانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔"

"اے بادشاہ! سیّاحوں کی باتوں کو محض افسانہ سمجھنے کی عادت چھوڑ دو" نجومی نے بڑی سنجیدگی سے کہا "اس لئے کہ سفر میں کبھی کبھی علم و دانش کے ایسے جواہر ان کے ہاتھ آتے ہیں، جو شاہوں کے خزانے میں بھی نایاب ہیں۔ رہیں قصرِ ارم اور باغِ ارم کی باتیں، سو تم نے ان کے متعلق جو کچھ سُنا ہے وہ حرف بحرف سچ ہے۔ میری آنکھوں نے اُن کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں تمہیں اپنے بچپن کا ایک قصہ سُناتا ہوں۔ اسے غور سے سُنو اس لئے کہ اس کا تمھارے مقصد سے

بڑا گہرا تعلق ہے۔

"یہ میرے بچپن کا ذکر ہے جب میں صحرا میں اپنے باپ کے اُونٹ چرایا کرتا تھا۔ میں اپنے اونٹوں سمیت صحرائے عدن میں سے گزر رہا تھا کہ گلّے میں سے ایک اونٹ پیچھے رہ گیا۔ میں نے کئی دن تک اُسے تلاش کیا لیکن نہ مِلا۔ ایک دن دوپہر کو میں تھک ہار کر ایک خالی کنوئیں کے پاس ایک کھجور کے پیڑ کے نیچے پڑ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک شہر کے پھاٹک کے قریب پڑا ہوں۔ میں جلدی سے اُٹھا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ شہر کی کشادہ و فراخ سڑکیں، آراستہ و پیراستہ بازار اور باغ بغیچے دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا۔ لیکن شہر میں ہر طرف سنّاٹا تھا، کہیں کسی متنفّس کا پتہ نشان تک نہ تھا۔ میں تنہا کوچوں اور بازاروں میں گھُومتا رہا، یہاں تک کہ ایک محل کے دروازے پر جا پہنچا۔ محل میں داخل ہُوا تو ہر طرف گلشن اور گلشنوں میں شفّاف حوض اور دُر بار فوّارے نظر آئے۔ حوضوں میں روپہلی سُنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں اور کُنجوں اور روشوں کے درخت اور پودے رنگین پھولوں اور رسیلے خوش ذائقہ پھلوں سے لدے ہوئے تھے ـــــ لیکن آدم زاد وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ اس تنہائی سے گھبرا کر میں نے محل سے باہر نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ محل سے نکل کر باہر آیا اور پھر شہر سے باہر آ گیا۔ لیکن میں نے مُڑ کر دیکھا تو نہ شہر نظر آیا اور نہ اُس کے قصر و باغ۔ میری آنکھوں کے سامنے سوائے خشک صحرا کے اور کچھ نہ تھا۔"

"تھوڑی دُور جا کر میری ملاقات ایک معمّر درویش سے ہوئی، جسے اس سرزمین کی روایات اور یہاں کے رسوم و رموز کا پُورا علم تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اُس کا حال درویش سے بیان کیا۔ درویش نے میری روداد سُن کر کہا کہ جو کچھ تُم نے دیکھا ہے وہ حقیقت میں باغِ ارم ہے اور صحرا کے عجائب میں سب سے عجیب۔ یہ شہر اُس کے قصر و بُرج، اُس کے گلشن، شجر، ثمر اور پھُول صرف کبھی کبھی آنے جانے مسافروں کو نظر آتے ہیں اور پھر نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی حقیقت یوں ہے ـــــ مدّتوں پہلے کی بات ہے، جب یہاں قوم عاد آباد تھی، حضرت نوح کی اولاد عاد کے بیٹے شدّاد نے یہاں ایک عظیم الشّان شہر کی بنیاد رکھی۔ شہر بن کر تیار ہو گیا اور شدّاد نے اس کے حسن و شکوہ کا نظارہ کیا تو اُس کا دِل غرور و تمکنت سے بھر گیا اور اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ اس شہر میں ایک ایسا قصر اور ایسا باغ تعمیر کروائے گا جو اللہ کی بنائی ہوئی بہشتِ بریں کا ثانی ہو۔ اُس نے اپنی پسند کے قصر و باغ تعمیر کروائے لیکن اُس پر اللہ کا عتاب ہُوا۔ اُس کے قصر و خیاباں اور اِن قصروں اور خیابانوں کے ساکن نیست و نابود ہو گئے۔

اللہ نے انھیں انسانی نظر سے پوشیدہ کر دیا اور وہ صرف کبھی کبھی کسی مسافر کو اس لئے نظر آجاتے ہیں کہ اس کے گناہ کی یاد تازہ رہے!

اے بادشاہ! شداد کی بہشت کا یہ افسانہ میرے دل پر نقش تھا اس لئے جب مصر کے قیام میں سلیمانِ اعظم کی کتابِ حکمت میرے ہاتھ آئی تو میں نے تہیہ کیا کہ اس کی مدد سے ایک بار پھر باغِ ارم کی سیر کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور بہشتِ شداد کے سارے مناظر میری نظر کے سامنے آگئے۔ میں کئی دن تک اس جنتِ ارضی میں مقیم رہا۔ جو جنات اس جنت کے نگران و پاسبان ہیں وہ سب میری قوتِ تسخیر کے تابع ہوگئے۔ اُن جنات نے مجھ پر وہ سب طلسم آشکارا کر دیئے جن کی مدد سے یہ جنت تعمیر ہوئی تھی اور جن کے اثر سے وہ عام نظر سے مخفی رہتی تھی۔ اس طرح کی بہشت اور اس کے گلشن و قصر میں سامنے والی پہاڑی پر آپ کے لئے تعمیر کر سکتا ہوں — اس لئے کہ اے بادشاہ! سلیمان اعظم کی کتاب الحکمت میرے تصرف میں ہے اور میں دنیا کے ہر سحر و طلسم کا عالم با عمل ہوں۔"

ابن حبوس نے ابراہیم حکیم کی باتیں سنیں تو وہ فرطِ شوق سے کانپ گیا اور عاجزی سے حکیم سے کہنے لگا "اے ابو ایوب کے فرزندِ دانا! تم صحیح معنوں میں سیاح ہو اور تم نے حیرت انگیز چیزوں کا مشاہدہ کیا اور علم حاصل کیا ہے۔ میرے لئے اس طرح کی جنت تعمیر کروا دو تو منہ مانگا انعام پاؤ — میں اپنی سلطنت کا آدھا حصہ بھی تمھاری نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

نجومی نے آہ بھر کر جواب دیا "تمھیں معلوم ہے کہ میں بوڑھا ہوں، فلسفی ہوں اور میری ضرورتیں مختصر اور خواہشیں قلیل ہیں۔ اس جنت کے عوض وہ پہلا چوپایہ جو جنت کے دروازے میں قدم رکھے اور اس پر لدا ہوا سامان میرا انعام ہوگا۔"

بادشاہ نے بخوشی یہ شرط منظور کر لی اور ابراہیم جنتِ ارضی کی تعمیر کی تیاریاں کرنے لگا۔ اپنے زمین دوز خانۂ حکمت سے اوپر والی پہاڑی چوٹی پر اس نے ایک مضبوط برج اور عالیشان فصیل تعمیر کروائی۔

فصیل اور برج کا نقشہ یہ تھا کہ پہلے بلند محراب والی ایک بیرونی شہ نشین تھی اس کے اندر ایک اور شہ نشین تھی جو ٹھوس، وزنی ستونوں پر استادہ تھی۔ اندرونی شہ نشین کی ڈاٹ پر نجومی نے اپنے ہاتھ سے ایک بہت بڑی کنجی کی تصویر بنائی اور بیرونی شہ نشین کے محراب پر، جو اندرونی شہ نشین سے بہت اونچا تھا

اُس نے ایک زبردست ہاتھ کی شکل بنائی۔ یہ شکلیں طلسم کی علامتیں تھیں۔ نجومی نے یہ علامتیں بنا کر کسی انوکھی زبان میں کچھ منتر پڑھنے شروع کئے۔

جب یہ عالیشان فصیل مکمّل ہو گئی تو نجومی دو دن تک اپنے خانۂ حکمت میں بند رہا۔ تیسرے دن وہ پہاڑ پر چڑھا اور سارا دن اُس کی چوٹی پر گزارا۔ خاصی رات گئے وہ چوٹی سے نیچے اُترا اور ابنِ حبوس کے حضور میں پیش ہو کر بادشاہ سے عرض کی:

"اے بادشاہ! آخر کار میرا کام مکمّل ہو گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسا لاجواب قصر تعمیر ہو گیا ہے جس سے بہتر کا تصوّر انسان کے ذہن کے لئے اور جس سے بہتر کی خواہش انسان کے دل کے لئے ممکن نہیں۔ اِس میں ہر طرف نفیس ایوان و دالان ہیں، دلکش گلستان و بوستان ہیں، فرحت بخش حوض اور فوّارے ہیں، معطّر حمّام ہیں۔ مختصر یہ کہ پہاڑی زمین پر جنّت کا مکمّل نمونہ ہے —— لیکن جنّتِ ارم کی طرح یہ بہشت بھی ایک زبردست طلسم کے زیر اثر چشمِ بینا سے مخفی ہے۔ اس کا نظّارہ صرف وہی کر سکتے ہیں جو اس طلسم کے رازداں ہیں۔"

"بس!" ابنِ حبوس فرطِ مسرت سے چلایا "کل نیرِ اعظم کی پہلی کرن کے ساتھ ہم پہاڑی پر چڑھ کر اس بہشت کا نظّارہ کریں گے۔"

مسرور و شادماں ابنِ حبوس اُس رات بالکل نہ سویا۔ سورج کی پہلی کرنوں نے پہاڑ کی برفانی چوٹی سے اٹھکیلیاں شروع کیں اور ابنِ حبوس نے اپنے مرکب پر سوار ہو کر اپنے منتخب مقربین کے ہمراہ ایک تنگ ڈھلوان کے راستے پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ اُس کے برابر برابر حسین شہزادی ایک بُراق گھوڑے پر سوار مستی و ناز کے ساتھ ہمراہ تھی —— تنِ نازک مرصّع و جواہر پوش ملبوس سے مستور اور گردن میں نقرئی بربط آویزاں۔ بادشاہ کے دوسرے بازو پر نجومی ہمر کاب تھا۔ وہ اپنے عصائے پیری کے سہارے پہاڑی پر چڑھ رہا تھا، اس لئے کہ اُسے گھوڑے کی سواری پسند نہیں تھی۔

ابنِ حبوس گردن اُٹھا اُٹھا کر قصر کے برجوں اور اُس کے گل پوش گلشنوں کا نظّارہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ نجومی نے ابنِ حبوس کی بے تابی دیکھ کر کہا "یہی اس بہشتِ ارضی کی حفاظت کا طلسمی راز ہے۔ جب تک آپ سحر زدہ پھاٹک میں داخل ہو کر بہشت کے مالک نہ بن جائیں آپ

کسی چیز کا نظارہ نہیں کر سکتے۔"

یہ مختصر قافلہ پھاٹک کے قریب پہنچا تو نجومی چلتے چلتے رُک گیا اور محراب پر بنی ہوئی کُنجی اور ہاتھ کی شکلوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ دو طلسم بہشت کے دروازے کے پاسبان ہیں۔ جب تک یہ ہاتھ بڑھ کر کُنجی کو نہ پکڑ لے کسی انسان کی طاقت یا طلسم کی تاثیر اس پہاڑ کے دیوتا پر غالب نہیں آ سکتی۔"

ابن حبوس حیرت و استعجاب میں غرق، کشادہ لب ان طلسمی علامتوں کو تک رہا تھا اور شہزادی کی گھوڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پھاٹک میں داخل ہو کر برج کے عین وسط میں پہنچ گئی۔

"دیکھو!" نجومی چلایا "پہلا چوپایہ اور اُس پر لدا ہوا سامان، جو طلسمی پھاٹک میں داخل ہوا ہے، میرا انعام!"

بادشاہ نجومی کی اس بات کو محض پیرانہ مزاح سمجھ کر مسکرا دیا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ نجومی کی بات مذاق نہیں حقیقت ہے تو وہ غصّے سے کانپ اُٹھا۔ اُس نے درشتی سے کہا "اے ابو ایوب کے فرزند! یہ کیا مذاق ہے؟ تو میرے وعدے کا مطلب جانتا ہے: پہلا چوپایہ، اور اس پر لدا ہوا بوجھ، جو پھاٹک میں داخل ہو ——— شاہی اصطبل سے سب سے مضبوط خچر لے لے، اُسے شاہی خزانے کے قیمتی سے قیمتی جواہرات سے لاد دے اور وہ تیری ملکیت ہے۔ لیکن وہ جو میرے دل کی ملکہ ہے اُس کا خیال اپنے دل میں لانے کی ہمت نہ کر۔"

"جواہرات!" نجومی نے حقارت سے جواب دیا "مجھے زر و جواہر کی کیا پروا؟ کیا میرے قبضے میں سلیمانِ اعظم کی کتاب الحکمت نہیں، جس کی روشنی میں سب مخفی دفینے میری نظر کے لئے کھلے ہوئے ہیں؟ شہزادی پر میرا حق ہے۔ بادشاہ کا وعدہ اٹل ہے۔ اس لئے شہزادی میری ہے اور میں اُسے طلب کرتا ہوں۔"

شہزادی نے غرور سے سر اُٹھایا، اور دو سفید ریش بوڑھوں کو حسن و شباب کی ملکیت پر جھگڑتے دیکھ کر اُس کے لبِ لعلیں پر حقارت آمیز تبسّم بکھر گیا، اور بادشاہ کی مصلحت اندیشی پر غصّہ غالب آ گیا۔ اُس نے چیخ کر کہا، "اے صحرا کے لعین فرزند! تیرے سینے میں علم و فن کے کتنے ہی خزانے مستور رہوں، لیکن یہ سمجھ لے کہ میں تیرا آقا ہوں، بادشاہ ہوں ——— اور آقا اور بادشاہ سے سودے بازی اچھی نہیں۔"

"آہا! بادشاہ!" نجومی نے تحقیر کے ساتھ یہ الفاظ دہرائے "مٹی کے ڈھیروں پر حکومت کرنے والا بادشاہ اُس کا آقا بننے کا دعوے دار ہے جس کے دستِ تصرف میں سلیمان کا طلسم ہے۔ خدا حافظ! ابن حبوس! تم اپنی حقیر مملکت پر حکومت کرو اور اپنی احمقوں کی جنت میں مگن رہو۔ اور میں تمہاری حماقتوں پر قہقہے لگانے کے لئے اپنے گوشۂ حکمت میں جاتا ہوں۔"

یہ کہا، شہزادی کے مرکب کی لگام پکڑی اور اپنا عصائے طلسمی زمین پر مارا۔ زمین شق ہو گئی اور وہ شہزادی سمیت اُس میں سما گیا۔ شگاف بند ہو گیا اور زمین جیسی ہموار پہلے تھی ویسی ہی پھر ہو گئی۔

ابن حبوس کچھ دیر دریائے حیرت میں غرق وہیں کھڑا رہا۔ لیکن جلد ہی حواس پر قابو پا کر اُس زمین کو کھودنے کا حکم دیا جہاں نجومی اور شہزادی سمائے تھے۔ ہزار مزدوروں نے کدال اور پھاوڑے سے زمین کا سینہ چھلنی کر ڈالا، لیکن بے سود۔ جب کدالوں اور پھاوڑوں کی نوکیں کُند ہو گئیں تو بادشاہ نے نجومی کے زمین دوز محل کا رُخ کیا۔ لیکن جب وہ پہاڑی کے نیچے اُترا تو کہیں اُس غار کا نام و نشان تک نہ تھا جس میں نجومی نے محل تعمیر کرایا تھا۔ جہاں کبھی غار تھا وہاں اب ایک سنگین چٹان کے سوا کچھ نہ تھا۔ ابراہیم بن ابو ایوب رخصت ہوا تو اُس کے بنائے ہوئے سارے طلسم بھی ختم ہو گئے۔ کانسی کا مجسمہ اپنی جگہ بُت بنا کھڑا تھا اور اُس کی برچھی کی نوک اُدھر اشارہ کر رہی تھی جدھر نجومی گیا تھا ــــ گویا وہ ابن حبوس کو بتا رہی تھی کہ تمہارا سب سے خطرناک دشمن وہاں چھپا ہُوا ہے۔

کبھی کبھی پتھر کی چٹانوں میں سے موسیقی کی دھیمی آوازوں اور نسوانی نغموں کا دل دوز ترنم فضا میں پرواز کرتا سنائی دیتا ــــ اور بالآخر ایک دن دہقان بادشاہ کی خدمت میں یہ خبر لایا کہ "کل رات مجھے چٹان میں ایک شگاف نظر آیا۔ میں اس شگاف کے راستے اندر اُترا تو ایک وسیع ایوان میں پہنچ گیا، جہاں ایک پرشکوہ مسند پر ایک بوڑھا بیٹھا گردن ہلا رہا تھا اور اُس کے حواس شہزادی کے بربط کے طلسمی نغموں کی دُھن پر رقص کر رہے تھے۔"

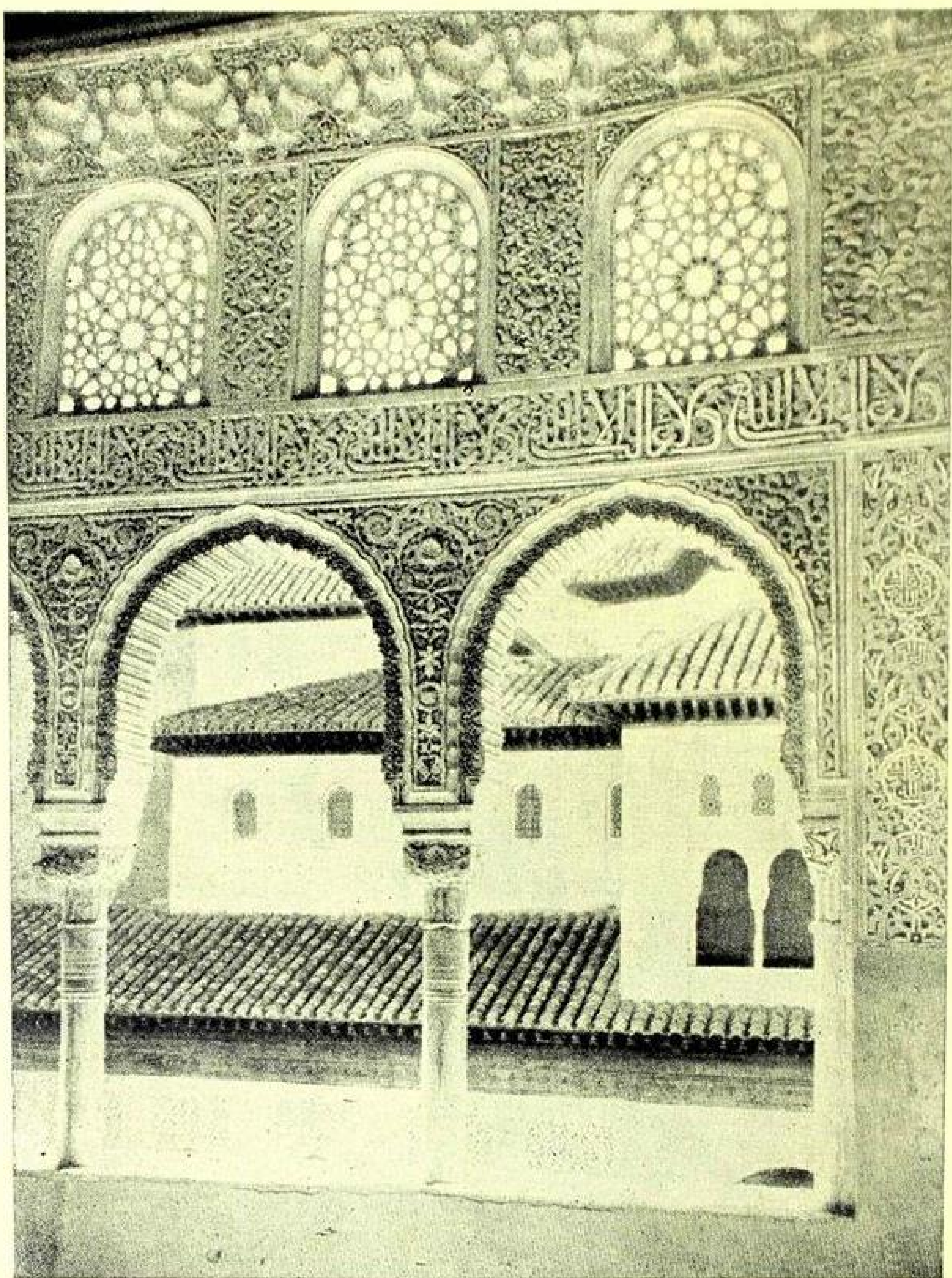
ابن حبوس نے چٹان کا شگاف تلاش کیا لیکن وہ بند ہو چکا تھا۔ اُس نے پھر چٹانوں کی کھدائی شروع کرائی لیکن بغیر کسی نتیجے کے۔ ہاتھ اور کنجی کا طلسم اتنا بے جان نہ تھا کہ انسانی قوت اُسے توڑ سکتی ــــ

رہی وہ پہاڑی کی چوٹی جس پر نجومی نے قصرِ جنت تعمیر کروایا تھا، سو وہ سنسان ویران پڑی تھی — شاید اس لئے کہ طلسمی جنتیں عام نظروں سے مخفی رہتی ہیں اور یا شاید اس لئے کہ جنت کی حقیقت ساحر کا پیدا کیا ہوا محض ایک فریب تھا۔ اہلِ دنیا کے نزدیک دوسری بات صحیح تھی اس لئے کچھ لوگوں نے اس جگہ کا نام "حماقت الملک" رکھا تھا اور کچھ اسے "جنت الحمقا" کہتے تھے۔

ابن حبوس کی آتشِ غضب کو بھڑکانے کے لئے ایک آندھی اور چلی۔ اُس کے اُن ہمسایہ حکمرانوں نے جنھیں اُس نے اب تک شکست و تسخیر کا نشانہ بنایا تھا طلسم کی قوت ختم ہو جانے کے بعد اُس کی بے بسی دبے کسی کا اندازہ لگایا تو ہر طرف سے اُس پر ٹوٹ پڑے اور امن پسند اور صلح جو بادشاہ کی باقی زندگی مصائب کے آغوش میں بسر ہوئی۔

اور بالآخر ابن حبوس مر گیا اور اُسے زیرِ زمین دفن کر دیا گیا۔ اُسے مرے ہوئے اور دفن ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ اُس کے مرنے کے بعد اُسی پہاڑی پر، جو حوادث کا گہوارہ و مرکز تھی، الحمرا تعمیر ہوا۔ وہ کسی حد تک باغِ ارم کی خیالی مسرتوں کی تلافی کر رہا ہے۔ طلسم زدہ پھاٹک اب بھی موجود ہے۔ اب بھی طلسمی ہاتھ اور طلسمی کنجی اُس کے محافظ ہیں۔ یہی پھاٹک ہے جسے زمانے نے "باب العدل" کا نام دیا ہے اور اِسی میں ہو کر ہم الحمرا کے قلعے میں داخل ہوتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اِسی "باب العدل" کے نیچے تہ خانے کے اندر ساحر اب بھی شہزادی کے نقرئی بربط کے نغمے سُنتا، اِن پر سر دُھنتا اور اپنے ہوش و حواس نثار کرتا رہتا ہے۔

باب العدل پر پہرہ دینے والے بوڑھے سنتری اب بھی کبھی کبھی بہار کی راتوں کو یہ نغمہ سُنتے اور اس کی تاثیر سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ ان سنتریوں ہی پر کیا موقوف ہے، اس جگہ کے گرد و پیش کے چپّے چپّے پر مدہوشی و سرمستی طاری ہے۔ اب بھی دن کے وقت بہت سے لوگ پتھر کی بنچوں پر اور سایہ دار درختوں کی خنکی میں اسی نغمے کی تاثیر سے مخمور یا محوِ خواب نظر آتے ہیں۔ دُنیا میں شاید ہی کوئی پہرہ چوکی اتنی مخمور کُن اور خواب آور ہو۔ روایت ہے کہ سحر و نغمہ کی تاثیر یوں ہی باقی رہے گی، شہزادی یوں ہی ساحر کے دامِ سحر میں اسیر رہے گی۔ اور ساحر یوں ہی شاہزادی کے نغموں کے سحر سے مدہوش و محوِ خواب رہے گا — یہاں تک کہ روزِ جزا آ جائیگا۔ یا شاید اُس سے پہلے یہ واقعہ پیش آ جائے کہ طلسمی ہاتھ آگے بڑھ کر طلسمی کنجی پر قابض ہو جائے اور قسمت اس پہاڑی دامن کو سحر کے آہنی پنجے سے رہائی دلادے۔



برج قمارش کا ایک حصہ

# تین حسین شہزادیاں

پُرانے زمانے میں غرناطہ پر ایک عرب بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام محمد تھا، لیکن اُس کی رعایا نے اُس کے نام کے ساتھ الہیجری کے لقب کا اضافہ کر دیا تھا، جس کے معنی ہیں کھبّا یا بائیں ہاتھ والا۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ اُسے داہنے ہاتھ کے مقابلے میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی زیادہ مہارت تھی۔ اس کے برخلاف کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اِس لقب کی بنا اُس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا اُسے اُلٹا کر کے رکھ دیتا۔ بہر صورت لقب کی بنیاد خواہ کچھ بھی ہو، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بد قسمتی کی وجہ سے یا بد نظمی کے سبب یہ بے چارہ ہمیشہ کسی نہ کسی مصیبت میں مُبتلا رہتا تھا ——— اُسے تین بار اپنا تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور ایک مرتبہ تو اُسے اور اُس کی ملکہ کو مچھیرے کے بھیس میں افریقہ جا کر پناہ لینی پڑی۔

لیکن احمد الہیجری غلط کار ہونے کے باوجود بہادر تھا اور کھبّا ہونے کے باوجود تلوار اتنی اچھی چلاتا تھا کہ محض اسی کے زور پر تین مرتبہ تخت و تاج سے محروم ہو کر پھر ان پر قابض ہو گیا۔ لیکن ہر نئی مصیبت اُسے راہِ راست پر لانے کے بجائے اُسے زیادہ سرکشی اور زیادہ غلط بینی کا سبق سکھاتی تھی۔ اُس کے مزاج کی سرکشی اور غلط کاری د

غلط روی کی بدولت اُس پر اور اُس کی سلطنت پر جو آفتیں آئیں اُن کا حال دلچسپی رکھنے والوں کو غرناطہ کی روایتوں اور تاریخوں میں مل جائے گا۔ ہم تو آج ایک ایسا افسانہ سنا رہے ہیں جس کا تعلق اُس کی خارجی حکمتِ عملی سے نہیں بلکہ داخلی طرزِ عمل سے ہے۔

ایک دن سُلطان محمد اپنے کچھ درباریوں سمیت جبلِ طلیطلہ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اُسے سواروں کا ایک دستہ ملا جو کسی عیسائی سلطنت کو تاراج کر کے واپس آ رہا تھا۔ اِس کے ساتھ مالِ غنیمت سے لدے ہوئے خچروں کی ایک لمبی قطار کے علاوہ دونوں جنسوں کے کچھ قیدی بھی تھے۔ ان قیدیوں میں سے ایک دوشیزہ کا حُسن بادشاہ کی آنکھوں میں کھُب گیا۔ دوشیزہ ایک چھوٹے سے خچر پر سوار تھی۔ قیمتی لباس اُس کے زیبِ تن تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور کسی کی دل دہی سے بھی تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔

بادشاہ نے سواروں کے سردار سے دوشیزہ کا حال پوچھا تو معلوم ہُوا کہ وہ ایک سرحدی قلعے کے سردار کی بیٹی ہے اور قلعے کے حملے میں مالِ غنیمت کے ساتھ اُن کے ہاتھ لگی ہے۔ بادشاہ نے دوشیزہ کو مالِ غنیمت کا شاہی حصّہ قرار دے کر اُسے الحمرا کے حرم میں بھجوا دیا۔ محل میں اُس کی دل جوئی کا ہر ممکن سامان مہیا کیا اور اُسے اپنی ملکہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ دوشیزہ نے بادشاہ کو بے دین سمجھ کر اُس کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ وہ اُسے اپنے دین اور وطن کا دُشمن جانتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بوڑھا تھا۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ وہ اپنی التجاؤں سے دوشیزہ کی چشمِ التفات میں جگہ نہ پا سکا تو اُس نے اُس کنیز سے مدد لینے کا تہیہ کیا جو دوشیزہ کے ساتھ قید ہو کر آئی تھی۔ یہ کنیز نسلاً اندلسی تھی۔ اُس کے عیسائی نام کا علم کسی کو نہیں لیکن الحمرا کی داستانوں اور روایتوں میں اُسے ہمیشہ دانشمند خدیجہ کہا گیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ خدیجہ تھی بھی دانش مند، جیسا کہ اُس کی زندگی کی پوری داستان سے ظاہر ہے۔ بادشاہ نے جوں ہی خدیجہ کو ہم راز بنایا، وہ اُس کی ہم نوا بن گئی اور اپنی نوجوان مالکہ کے دل میں اُس کی گنجائش پیدا کرنے کی مُہم شروع کر دی۔

"بی بی! اب بس کرو!" وہ نوجوان سردار زادی سے کہتی "آخر یہ رونا دھونا کب تک؟ کیا تمھیں اپنے والد کے ویران سرحدی قلعے میں قید رہنا اس خوبصورت محل کی ملکہ بننے اور اُس کے باغوں اور فوّاروں پر حکمرانی کرنے سے زیادہ پسند ہے؟ رہی یہ بات کہ بادشاہ کافر ہے تو تمھیں اس سے کیا؟ تمھیں تو بادشاہ سے شادی کرنی ہے

اُس کے دین سے نہیں ۔ اور اگر تمہیں یہ غم ہے کہ وہ ذرا بوڑھا ہے تو اس میں غم کی کیا بات ہے ؟ جتنا بوڑھا ہے، اُتنی ہی جلدی مرے گا اور تم اپنی مرضی کی مالک ہو گی ——— اور ذرا یہ بھی سوچو کہ تم اُس کی قید میں ہو، وہ تمہیں اپنی ملکہ بھی بنا سکتا ہے اور کنیز بھی ۔ انسان کو قزاقوں کا خطرہ ہو تو اپنا مال سستے داموں بیچ دینا اُسے لٹوانے سے کہیں بہتر ہے ۔"

دانش مند خدیجہ کی دلیلیں کارگر ہوئیں ۔ ہسپانوی دوشیزہ نے آنسو پونچھے اور محمد الہیجری کی ملکہ بن گئی ۔ اُس نے بظاہر اپنے شوہر کا دین بھی قبول کر لیا اور دانش مند خدیجہ تو سچے دل سے پکی مومنہ بن گئی ۔ اُسے مومنوں کا نام اور اس بات کی اجازت ملی کہ ہمیشہ اپنی نوجوان مالکہ کی خدمت میں رہے ۔

بادشاہ، اُس کی حسین ملکہ اور دانش مند کنیز ہنسی خوشی محل میں رہنے لگے اور کچھ مدّت کے بعد ملکہ کے تین جڑواں بیٹیاں پیدا ہوئیں ۔ پہلے تو بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ کاش بیٹیوں کی جگہ اللہ بیٹے دیتا ۔ لیکن فوراً ہی یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ ایک ہی وقت میں تین بیٹیاں، ایک ایسے آدمی کے لئے خاصا کارنامہ ہے، جو بوڑھا بھی ہو اور کھبّا بھی !

بیٹیاں پیدا ہوئیں تو بادشاہوں کے دستور کے مطابق اُس نے نجومیوں کو طلب کیا ۔ نجومیوں نے تینوں شہزادیوں کے زائچے دیکھے اور اپنی گردنیں مٹکا کر کہنے لگے "اے بادشاہ ! بیٹیوں کو ہمیشہ مخدوش جائیداد سمجھا جاتا ہے ——— لیکن یہ تین بیٹیاں، خصوصاً جوان ہو کر آپ کی خاص توجہ کی طالب ہوں گی جب وہ اُس عمر کو پہنچیں تو اُنھیں صرف اپنے سایۂ عاطفت میں رکھیے اور اُنھیں کسی اور کے سپرد نہ کیجیے ۔"

بادشاہ الہیجری کے درباری اُس کی دانش مندی کے قائل تھے اور وہ خود اُن سے زیادہ اپنی فہم و فراست کا مدّعی ۔ نجومی کی پیشین گوئی سے وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوا اس لیے کہ اُسے یقین تھا کہ اُس کی فراست تقدیر کو شکستِ فاش دے گی ۔

تین جڑواں بیٹیاں بادشاہ کے لیے شادی کا آخری انعام تھیں ۔ اس کے بعد اُس کے یہاں اور اولاد نہ ہوئی ۔ نوجوان ملکہ اس کے کچھ عرصے بعد اپنی معصوم بچیوں کو بادشاہ کی محبت اور خدیجہ کی فراست کے حوالے کر کے اس دُنیا سے رخصت ہوئی ۔

خطرے کی منزل تک پہنچنے کے لئے شہزادیوں کو ابھی کئی سال کی مسافت طے کرنی تھی لیکن دُور اندیش بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا "احتیاط، علاج سے بہتر ہے" اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ شہزادیوں کی پرورش شلوبینہ کے محل میں ہو۔ یہ محل ایک مضبوط عرب قلعے کے اندر بنا ہوا تھا، جو بحیرہ روم کے ساحل پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ قلعہ ایک قسم کی شاہی خلوت گاہ ہے، جس میں مسلمان بادشاہ اپنے ایسے عزیزوں کو نظر بند رکھتے تھے جن سے اُن کا تخت و تاج یا جان خطرے میں ہو۔ یہ نظر بند عزیز محل کی اِس شاندار خلوت گاہ میں بڑے عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہزادیاں اس حسین محل میں، دُنیا کی نظر سے دُور، ناز و نعم اور عیش و نشاط کی آغوش میں پرورش پانے لگیں۔ اُن کے ہر طرف مستعد کنیزوں کا ایک لشکر تھا جو اُن کی آنکھوں کے اشاروں پر چلتیں اور اُن کے دل کی ہر تمنا پوری کرتیں۔ محل کے چاروں طرف دلکش گلستان و بوستان تھے، نادر و نایاب ثمردار درختوں اور گل پوش پودوں سے مالا مال، اور خوشبودار و معطر کنجوں اور حوضوں سے مزین۔ محل کے تین طرف سرسبز و شاداب وادی تھی جس کا چپہ چپہ تہذیب کے حُسن و نُور سے معمور تھا۔ وادی سے ذرا پرے ہٹ کر لشبرات کی بلند پہاڑیاں تھیں اور چوتھی طرف سُورج کی سُنہری روشنی میں چمکتا ہُوا وسیع و کشادہ سمندر۔

اس نشاط انگیز ماحول میں، نکھرے ہوئے بے داغ آسمان کے سائے میں تینوں شہزادیاں شباب و رعنائی کا دلفریب مرقع بن گئیں۔ گو اُن کی پرورش ایک ہی ماحول میں ہوئی تھی لیکن شخصیت و سیرت کا تنوع اُن کی چال ڈھال میں جھلکتا تھا۔ تینوں شہزادیوں کے نام تھے زاہدہ، زبیدہ اور ثریّا اور تینوں کی عمروں میں تین تین منٹ کا وقفہ تھا۔

زاہدہ، جو سب سے بڑی تھی، طبعاً جری اور دلیر تھی۔ وہ کام میں سبقت کرتی اور باقی دونوں اُس کی پیروی و تقلید کرتیں۔ وہ مزاجاً متجسس تھی اور ہر بات کی تہ تک پہنچنے کی خواہش مند۔

زبیدہ، اپنے اور دوسروں کے حُسن کے معاملے میں بڑی نفاست پسند تھی۔ وہ آئینے اور حوض کے شفّاف پانی میں اپنا عکسِ رُخ دیکھ کر خوش ہوتی اور پھولوں کی رنگینی، جواہرات کی آب و تاب اور اپنے گردوپیش پھیلے ہوئے حُسن میں گم رہتی۔

سب سے چھوٹی شہزادی، ثریّا طبعاً نرم و نازک اور حد درجہ حسّاس تھی اور اُس کے گردوپیش کی ساری فضا اُس کی نزاکتِ حس کے نور سے معمور تھی۔ وہ ہر وقت اپنے پسندیدہ پھولوں اور پالتو طائروں اور چوپایوں میں گھری،

اُن پر شفقت و توجہ کی بارش کرتی۔ اُس کی تفریحات دوسری بہنوں سے مختلف تھیں۔ سیدھی سادی تفریحوں سے جی بہلانے کے بعد سکون و خاموشی سے کسی گوشۂ فراغت میں بیٹھ کر اُسے بڑا سکون ملتا تھا۔ بہار کی خاموش راتوں میں، وہ گھنٹوں شہ نشین پر بیٹھی ننھے ننھے چمکدار ستاروں کا نظارہ کرتی یا چاندنی رات کے مضطرب مشاہدے میں گم رہتی۔ ان خاموش تنہائیوں میں مچھیرے کے گیتوں کی دُور سے آنے والی دھیمی دھیمی تانیں یا کسی عرب نوجوان کی بانسری سے نکلے ہوئے مستی بھرے نغمے اُس کے جذبات میں تموّج پیدا کر دیتے۔ مظاہرِ فطرت کی ادنےٰ سی ہلچل اُسے خوفزدہ کر دیتی اور بادل کی ہلکی سی گرج سُن کر وہ بے ہوش ہو جاتی۔

دن، مہینے اور سال، خاموشی سے اور سنجیدگی سے گزرتے رہے اور دانش مند خدیجہ بڑی دیانت اور وضعداری سے شہزادیوں کی خدمت اور نگرانی میں مصروف رہی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے شلوبینہ کا محل سمندری ساحل پر ایک پہاڑی کے اُوپر بنا ہوا تھا۔ محل کی ایک بیرونی دیوار پہاڑی کے عین مقابل میں تھی اور اُس کا ایک سرا پہاڑی کی ایک جھکی ہوئی چٹان سے بالکل ملحق تھا۔ دیوار کے نیچے تنگ ریتلا ساحل تھا، جس پر ہر وقت سمندر کی موجیں اٹکھیلیاں کرتی رہتیں۔ اِس چٹان پر ایک حفاظتی مینار بنا ہوا تھا جس کے اُوپر ایک جالی دار شہ نشین تھی، جو سمندر کی فرحت بخش ہوا کی گذرگاہ تھی۔

تجسّس پسند زاہدہ ایک دن دوپہر کے وقت شہ نشین کی ایک کھڑکی پر بیٹھی تھی اور اُس کی دونوں بہنیں نرم بستروں پر دراز میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے زاہدہ نے دیکھا کہ ایک کشتی آہستہ آہستہ سمندر کی لہروں کو کاٹتی ساحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کشتی قریب آئی تو زاہدہ نے دیکھا کہ وہ مسلّح آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کشتی مینار کے عین نیچے آ کر ٹھہری اور کچھ عرب سپاہی، کچھ عیسائی قیدیوں کو لے کشتی میں سے اُترے۔ زاہدہ کی مشتاق نظروں نے ان لوگوں کو دیکھا تو جلدی سے اپنی دونوں بہنوں کو جگا دیا اور تینوں شہ نشین کی جالی سے لگ کر اُترنے والوں کو دیکھنے لگیں۔ قیدیوں میں تین ہسپانوی نوجوان بھی تھے، جنھوں نے امیرانہ لباس زیب تن کر رکھے تھے اُن کے جسم شباب کی رعنائیوں میں غرق اور بُشرے شرافت و نجابت کے غمّاز تھے۔ یہ پابہ زنجیر جوان، دشمنوں کے حلقے میں گھرے ہوئے بھی استغنا کی جس شان سے چل رہے تھے اُس سے اُن کی عظمتِ نفس کا اندازہ ہوتا تھا۔ شہزادیاں ساکت و صامت پُر شوق نظروں سے اُنھیں آگے بڑھتا دیکھ رہی تھیں۔ شہزادیوں کی پرورش ہم جنس کنیزوں کے

حلقے میں ہوئی تھی اور اب تک اُن کا مردانہ حسن کا مشاہدہ یا تو اپنے حبشی غلاموں کے سیاہ چہروں تک محدود تھا یا سمندر پر نظر آنے والے گنوار مچھیروں کے بھدّے جسموں تک ــــ اس لئے یہ کچھ حیرت کی بات نہ تھی کہ شہزادیوں کے مردانہ حسن و وقار کے نظارے سے اُن کے سینوں میں ایک ہلکا سا طوفان پیدا ہو گیا۔

زاہدہ حیرت و استعجاب کے ساتھ بولی "کیا ارغوانی لباس والے جوان سے زیادہ حسین کوئی ہو سکتا ہے؟ دیکھو اس کی چال میں کتنی خود پسندی، کتنا وقار ہے، جیسے اُسے حلقے میں لے کر چلنے والے سب اُس کے غلام ہیں۔"

"لیکن ذرا اُس سبز پوش جوان کو دیکھو!" زبیدہ چلائی۔ "کیسی شان! کتنی تمکنت! کتنی مردانگی!"

نرم و نازک سربیٰہ خاموش رہی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ نیلے لباس والے نوجوان کے حسن و جلال کی داد دے رہی تھی۔

جب تک حسین قیدی نظر سے اوجھل نہ ہو گئے شہزادیاں اُنھیں دیکھتی رہیں، پھر لمبی سرد آہیں بھر کر کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئیں اور ایک دوسرے پر اُچٹتی ہوئی نظریں ڈال کر خاموش، دَم بخود اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھ گئیں۔

دانش مند خدیجہ تھوڑی دیر میں شہ نشین میں آئی تو اُنھیں اسی طرح بُت بنا دیکھا۔ شہزادیوں نے جو کچھ دیکھا اُس کی روداد سنائی تو اُس کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی بھی کھِل گئی۔ وہ آہ بھر کر سوچنے لگی "بے چارے قیدی! اِن کی اسیری پر اِن کے وطن میں نہ جانے کتنی حسین امیرزادیوں کے دِل تڑپ رہے ہوں گے! افسوس! میری بچیو! تمھیں اندازہ نہیں کہ اپنے وطن میں یہ نوجوان کیسی زندگی گزارتے ہوں گے ــــ بازی گاہوں کی شمشیر زنی، حسین شہزادیوں کی آغوشِ محبت اور شبوں کا نغمہ و سرود!"

خدیجہ کی یہ باتیں زاہدہ کی فطرتِ تجسس پسند کے لئے تازیانہ بنیں۔ اُس کا فرطِ شوق سوال پر سوال بن کر اُبلتا رہا اور خدیجہ اپنے عہدِ شباب کی رنگین تصویریں بنا بنا کر آتشِ شوق کو تیز تر کرتی رہی۔ جب بات ہسپانوی دوشیزاؤں کے حسن تک پہنچی تو زبیدہ چپکے سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حسن و شباب کا جائزہ لینے لگی، اور جب چاندنی رات کی نشاط انگیز محفلوں کا ذکر آیا تو اُس کے سینے سے ایک خاموش آہ نکلی اور فضا میں بکھر گئی۔

ہر روز خدیجہ سے پُرشوق سوال کرنا زاہدہ کا معمول بن گیا۔ ہر روز شباب و رعنائی کی وہی کہانیاں دُہرائی جاتیں اور ہر روز حسین سامع انھیں اُسی شوق سے سُنتے ــــــ البتہ سینوں سے آہیں اب ذرا کم نکلتی تھیں۔ اور بالآخر ایک دن تجربہ کار خدیجہ کو یہ احساس ہوا کہ کہیں اُس کی کہانیاں کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ بن جائیں۔ حسن و عشق کی ولولہ انگیز داستانیں سُناتے وقت وہ یہ بھول گئی کہ کہانیاں سُننے والی شہزادیاں اب بچیاں نہیں، غنچے کھل کر پھول بن چکے ہیں اور اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ بادشاہ کو شہزادیوں کے شباب کی آمد کی خبر دے دے۔

ایک صبح محمد دا ہیجری الحمرا کے ایک پُرسکون و پُرراحت ایوان میں بیٹھا تھا کہ شلوبینہ کا ایک غلام اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور شہزادیوں کی سالگرہ کے موقع پر خدیجہ کی طرف سے بادشاہ کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کیا۔ ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہوئے غلام نے ایک چھوٹی سی خوبصورت اور نازک ٹوکری اُس کے سامنے رکھ دی۔ ٹوکری رنگین پھولوں سے سجی ہوئی تھی اور انگور اور انجیر کے سبز پتّوں پر ایک آڑو، ایک خوبانی اور ایک شفتالو رکھا ہوا تھا۔ شبنم کی شیریں شادابی میں ڈوبے ہوئے پھلوں سے رس ٹپکا پڑتا تھا۔

بادشاہ پھلوں اور پھولوں کی شاعرانہ زبان سے واقف تھا۔ وہ فوراً اِس تحفے کا علامتی مفہوم سمجھ گیا۔ وہ سوچنے لگا "اچھا! تو جس نازک وقت کی طرف نجومیوں نے اشارہ کیا تھا وہ آپہنچا۔ میری بچیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئیں۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ انھیں مردوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ وہ دانش مند خدیجہ کی نگرانی میں ضرور ہیں، اور جیسا کہ نجومی نے چاہا تھا میری نظر کے سائے سے دُور ہیں۔ مجھے چاہیئے کہ اب اُنھیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھوں اور کسی اور کی نگرانی پر بھروسا نہ کروں۔"

یہ سوچا اور فوراً حکم دے دیا کہ الحمرا کا ایک برج شہزادیوں کے خیر مقدم کے لئے آراستہ کیا جائے۔ برج آراستہ ہونے لگا اور بادشاہ بہ نفسِ نفیس، اپنے محافظوں کے ساتھ محل شلوبینہ کی طرف چلا کہ خود جا کر شہزادیوں کو اپنے ساتھ الحمرا میں لے آئے۔

بادشاہ نے شہزادیوں کو تین سال سے نہیں دیکھا تھا اس لئے جب اُس نے شباب و رعنائی کے ان تین مجسموں کو دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ سوچ رہا تھا "کیا اتنی تھوڑی سی مدّت انسان میں زمین آسمان کا

یہ فرق پیدا کر سکتی ہے؟ تین سال کی مدت میں وہ اُس حدِّ فاصل سے گزر چکی تھیں جو الھڑ، بے ڈھنگ اور بے فکر طفلی کو رسیلے، ہٹیلے اور مخمورِ شباب سے جدا کرتی ہے۔ اُن کا بچپن لا مانشا کے خشک سپاٹ اور غیر دلچسپ میدانوں سے گزر کر اندلس کی شاداب وادیوں اور اُبھرتی ہوئی پہاڑیوں میں قدم رکھ چکا تھا۔

زاہدہ کا قد لمبا اور رعنائی کا مجسمہ تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایک وقار اور آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ وہ شاہانہ وقار اور پُر عزم قدموں سے بادشاہ کی طرف بڑھی اور اُسے اس طرح تعظیم دی جیسے وہ باپ سے زیادہ شہنشاہ ہے۔ زبیدہ کا قد متوسط تھا، اُس کا چہرہ پرکشش، شخصیت جاذبِ نظر اور حسن خیرہ کُن، جسے اُس کے بناؤ سنگار نے اور زیادہ جاذب اور شوخ بنا دیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی بادشاہ کے سامنے آئی، اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور بادشاہ کا خیر مقدم عربی کے ایک ہر دلعزیز شاعر کے شعروں سے کیا۔ ثریّا قد میں دونوں بہنوں سے چھوٹی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیا کی نزاکت اور چال میں شرمگیں لطافت تھی۔ اُس کا حسنِ لطیف وسیع محبت کی نگہبانی کا طالب نظر آتا تھا۔ بڑی بہن کی طرح وہ حکومت کرنے کے لئے نہیں اور منجھلی بہن کی طرح نظروں کو خیرہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ مرد کی قوی محبت کی آغوش میں پناہ لینے، سکون حاصل کرنے اور شادماں رہنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ وہ دھیمے اور جھجکتے قدموں سے باپ کے پاس آئی اور چاہتی تھی کہ باپ کے شفیق ہاتھ پر اپنے لبِ نازک ثبت کر دے لیکن اُس کی نظر باپ کے چہرے پر پڑی تو وہ پدرانہ شفقت کے نور سے خنداں تھا، اس لئے اُس نے فوراً اپنے بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

محمد الہیجری نے اپنی بیٹیوں کے شباب کی شادابی پر نظر ڈالی تو اُس کا دل فخر اور پریشانی کے ملے جلے احساس سے کانپ اُٹھا۔ وہ اُن کے حسن کی رعنائی کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، لیکن نجومیوں کے الفاظ رہ رہ کر اُس کے دل میں دھڑکا پیدا کر رہے تھے "تین بیٹیاں! تین بیٹیاں! اور تینوں شباب کی سرمستیوں میں ڈوبی ہوئی —— ان زہرہ جبینوں کی حفاظت صرف اژدہے کر سکتے ہیں!"

اُس نے شہزادیوں کو غرناطہ چلنے کی خبر سنائی، اور قاصدوں کو آگے بھیجا کہ کسی کو اُس راستے پر نہ آنے دیں جدھر سے انھیں گزرنا تھا —— اور رہ گزر کے سب در اور دریچے بند رکھے جائیں۔ سیاہ فام حبشی سواروں کے حلقے میں بادشاہ اور شہزادیاں غرناطہ کی طرف چلیں۔

شہزادیاں بادشاہ کے دونوں پہلوؤں پر تھیں۔ اُن کے چہروں پر نقاب پڑے ہوئے تھے اور وہ سفید حسین گھوڑیوں پر سوار تھیں، جن کی قرمزی مخمل اور زردوزی کی جھولیں فرش زمین تک پھیلی ہوئی تھیں، رکابیں اور مہمیزیں سونے کی تھیں اور ریشمیں لگاموں پر موتی اور جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ گھوڑیوں کی گردنوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں تھیں، جن سے قدم قدم پر حد درجہ مترنم نغمے چھوٹ رہے تھے۔ بدنصیب ہوتا وہ شخص جو گھنٹیوں کی آواز سن کر بھی راستے سے نہ ہٹتا۔ محافظ دستے کو حکم تھا کہ راہ میں حائل ہونے والوں کو بے دریغ قتل کر دیا جائے۔

یہ حسین قافلہ غرناطہ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دریائے شنیل کے کنارے عرب سپاہیوں کا ایک دستہ، جو کچھ قیدیوں کو لئے آگے بڑھ رہا تھا، اُس کے سامنے آگیا۔ سپاہی جلدی میں راستے سے ہٹ تو نہ سکے لیکن اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے اور قیدیوں کو اپنی تقلید کا حکم دیا۔ قیدیوں میں وہ تینوں سردار بھی تھے جنھیں شہزادیوں نے شہ نشین کے جھروکے میں سے دیکھا تھا۔ وہ یا تو سپاہیوں کی بات کا مطلب نہ سمجھے یا جان بوجھ کر حکم عدولی کی، اس لئے کہ وہ سڑک پر سیدھے کھڑے رہے اور آگے بڑھتے ہوئے شاہی قافلے کو غور سے دیکھتے رہے۔

حکم عدولی اور سرتابی کے اس مظاہرے پر بادشاہ کا شعلۂ غضب بھڑک اُٹھا۔ تلوار میان سے نکال کر وہ تیزی سے آگے بڑھا، لیکن قبل اس کے کہ اس کا مُہلک وار گھورنے والوں میں سے ایک کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا تینوں شہزادیوں نے اُسے گھیر لیا اور قیدیوں کے لئے رحم کی التجا کی۔ یہاں تک کہ شرمیلی سرینڈا بھی اُس کی دامنگیر ہونے سے باز نہ رہ سکی۔

محمد الہیجری نے تلوار روک لی اور فوراً ہی شاہی دستے کے سردار نے زمیں بوس ہو کر عرض کی "حضور! کوئی ایسا اقدام نہ فرمائیں کہ سارے مُلک میں ہلچل مچ جائے۔ یہ تینوں نوجوان جری اور جاں باز ہسپانوی سردار ہیں، جو میدانِ جنگ میں شیروں کی طرح لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے ہیں۔ وہ عالی نسب ہیں اور ان کا "جاں بہا" کثیر ہوگا"

"بس! خاموش!" بادشاہ نے جواب دیا "میں ان کی جانیں بخشتا ہوں، لیکن انھیں ان کی بے ادبی کی سزا ضرور ملے گی —— انھیں قرمزی برجوں میں لے جاؤ اور ان سے سخت مشقت لو"

وقت گزر گیا لیکن محمد الہیجری سے اُسی قسم کی حماقت سرزد ہوگئی جس کی بدولت اُسے الہیجری کا لقب ملا

تھا۔ اس ہنگامے اور ریل پیل میں شہزادیوں نے نقاب اُلٹ دیئے تھے اور اُن کے حسن کا جلوہ عام ہو گیا تھا۔ پھر بادشاہ نے باتوں کو طول دے کر حسنِ بے حجاب کو اپنا جادو جگانے کا پورا موقع دیا تھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اُس زمانے میں لوگوں کو عاشق ہونے میں اتنی دیر نہیں لگتی تھی جتنی آج کل۔ اس لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اتنی دیر میں تینوں ہسپانوی سرداروں کے دل پوری طرح شہزادیوں کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔ خصوصاً اس لئے کہ اُن کی وارفتگیٔ محبت میں جذبۂ تشکر بھی شامل ہو گیا تھا۔ یہ بات ذرا عجیب ضرور ہے لیکن ہے سچ کہ تینوں سردارزادوں کی نظرِ انتخاب مختلف شہزادیوں پر پڑی۔ رہیں شہزادیاں، تو اُن کے دلوں پر نوجوان قیدیوں کی شاندار شخصیتوں نے اور بھی گہرا اثر کیا، اور انھوں نے وہ ساری باتیں اپنے دل کے پردوں میں چھپا لیں جو قیدیوں کی مردانگی اور عالی نسبی کے متعلق اُن کے سامنے کہی گئی تھیں۔

شاہی قافلے نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ گھنٹیوں کی موسیقی جاری تھی اور تینوں شہزادیاں کسی خیال میں گم اپنے حسین مرکبوں پر سوار تھیں۔ وہ کبھی کبھی دُزدیدہ نظر سے پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھیں کہ شاید نوجوان قیدیوں کی ایک جھلک دکھائی دے جائے —— اور نوجوان قیدیوں کو عرب سپاہی قرمزی بُرجوں کی طرف لئے جا رہے تھے۔

شہزادیوں کے قیام کے لئے جو جگہ منتخب کی گئی تھی ذہن کے لئے اُس سے بہتر کا تصوّر محال ہے شہزادیوں کا نیا مسکن ایک بُرج تھا جو الحمرا کے قصر سے ذرا فاصلے پر تھا اور اُسے اُس دیوار کے ذریعے قصر سے ملایا گیا تھا جس نے پہاڑ کی پوری چوٹی کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ اُس کا ایک رُخ قلعے کے اندرونی حصّے کی طرف کھلتا تھا، اُس کے عین نیچے ایک چھوٹا سا پائیں باغ تھا جس کا ہر کنج نادر و نایاب پھولوں سے آراستہ تھا۔ دوسرے رُخ کنجوں میں گھری ہوئی ایک ندی بہتی تھی، جو الحمرا اور جنت العریف کے درمیان حد بندی کرتی تھی۔ بُرج کے اندرونی حصّے کو کئی چھوٹے چھوٹے حسین ایوانوں میں تقسیم کر کے بڑی نزاکت و حسن سے مشرقی انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ حسین ایوان ایک بلند ایوان کا حلقہ کئے ہوئے تھے، جس کی چھت اتنی اُونچی تھی کہ تقریباً برج کی بلندی تک پہنچتی تھی۔ بڑے ایوان کی دیواریں اور چھتیں گل کاری اور منبت کاری سے آراستہ اور طلائی خطوط سے مزین تھیں۔ مرمریں فرش کے بیچ میں سنگِ موسیٰ کا فوارہ تھا، جس کے گرد خوشبودار پھولوں کی خوبصورت جھاڑیاں تھیں۔ فوارے میں سے پانی کا ایک جھرنا پھوٹتا تھا جس سے پوری عمارت میں خوشگوار خنکی پیدا ہو جاتی تھی اور فضا میں ہر طرف

ایک خواب آور موسیقی بکھر جاتی تھی - ایوان کے چاروں طرف طلائی اور نقرئی پنجرے لٹکے ہوئے تھے جن میں رنگ رنگے پروں والی چڑیاں ہر وقت نغمہ سنج رہتی تھیں -

بادشاہ برابر سنتا رہتا تھا کہ شہزادیاں شلوبینہ کے محل میں شاداں و فرحاں رہتی ہیں اس لئے اُسے یقین تھا کہ الحمرا کا قیام اُنھیں اور بھی زیادہ شادماں و مسرور کرے گا - لیکن اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ اس ماحول میں غمگین اور یہاں کی ہر چیز سے غیر مطمئن ہیں - یہاں کے پھولوں میں اُنھیں خوشبو محسوس نہ ہوتی - یہاں کی بلبل کے نغمے اُن کی نیندوں میں خلل انداز ہوتے اور سنگِ موسیٰ کا فوارہ تو اپنے کبھی نہ تھمنے والے اور شب و روز چلنے والے آبشار کی جھنکار سے اُن پر دیوانگی کی کیفیت طاری کر دیتا -

بادشاہ کی بے تحملی اور سخت مزاجی پر شہزادیوں کا یہ رویّہ سخت گراں گزرا - لیکن پھر اُس نے سوچا کہ شہزادیاں اب اُس عمر کو پہنچ گئی ہیں جب ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے اور دل فضا میں کشادگی کا طالب و خواستگار ہوتا ہے " یہ وہ اب بچیاں نہیں ہیں " وہ اپنے دل میں سوچتا " وہ جوان ہیں اور اُنھیں اپنے آس پاس اپنی دلچسپی کی چیزیں چاہئیں " یہ سوچ کر اُس نے غرناطہ کے سقاطین کے سب درزیوں، سناروں اور جوہریوں کو طلب کیا اور دیکھتے دیکھتے شہزادیوں کے آگے ریشم و کمخواب کے بیش بہا زردوزی ملبوسات، موتیوں اور ہیرے جواہرات کے گلوبندوں، کنگنوں اور کرن پھولوں اور بیش قیمت سامانِ آرائش کا انبار لگ گیا ـــــ لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی - اس سارے ساز و سامان کے باوجود شہزادیوں کا غم اُنھیں گھلاتا رہا - اُن کے چہروں کی زردی بڑھتی رہی - وہ تینوں گلاب کی کلیوں کی طرح مرجھاتی اور کمھلاتی رہیں - اور بے چارہ باپ! اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے! دوسرے سے مشورہ لینے کا وہ عادی نہ تھا اور اُس کی عقل نے جیسے جواب دے دیا تھا - اُس نے سوچا " تین جوان شہزادیوں کے خبط اور اُلجھنیں شاید ایک آدمی کے بس کی نہیں " اور بالآخر اُس نے مشورہ طلب کرنے کا فیصلہ کیا -

اس سلسلے میں اُس کی نظر سب سے پہلے تجربہ کار خدیجہ کی طرف گئی -

" خدیجہ! " بادشاہ نے اعتماد کے لہجے میں کہا " میرے نزدیک دُنیا میں تم سے زیادہ عقلمند کوئی اور عورت نہیں ـــــ اور پھر تم پر بھروسا بھی کیا جا سکتا ہے - یہی وجہ ہے کہ میں نے تمھیں اپنی بیٹیوں کا نگران و نگہبان

مقرر کیا تھا۔ اور یہ خدمت تمہارے سپرد کر کے مجھے بڑا اطمینان تھا۔ اب میں ایک اور خدمت تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ کسی طرح معلوم کرو کہ شہزادیوں کو کیا غم ستا رہا ہے۔ اُن کی صحت اور خوشی کو بحال کرنے کی کوئی تدبیر سوچو۔"

خدیجہ نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا۔ شہزادیوں کا غم کیا ہے! —— یہ بات اُسے شہزادیوں سے بھی زیادہ معلوم تھی۔ لیکن اُن تینوں کا مکمل اعتماد حاصل کرنے کے لئے وہ ایک دن تخلیے میں اُن سے اُن کے دل کی بات پوچھنے بیٹھی:

"پیاری بچیو! ایسے اچھے محل میں رہ کر، جہاں تمہیں دُنیا کی ہر نعمت میسّر ہے، تم افسردہ و غمگین کیوں ہو؟"

شہزادیوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک آہ بھر کر چپ ہو رہیں۔

"تمہیں آخر کیا چاہیئے؟ کیا میں تمہارے لئے غرناطہ کا بولنے والا طوطا منگا دوں؟"

"لعنت ہو اُس پر!" شہزادی زاہدہ نے چلّا کر کہا "مجھے تو اُس کی آواز سے وحشت ہوتی ہے۔ بے سوچے سمجھے بکواس کرتے رہنے کے سوا اُسے اور کیا آتا ہے۔ صرف بے عقلے ہی اُس عذاب کو گوارا کر سکتے ہیں۔"

"اگر چاہو تو تمہیں جبل الطارق سے ایک بندر منگوا دوں جو ہر وقت اپنی شرارتوں سے تمہارا جی بہلاتا رہے؟"

"بندر!" زبیدہ نے حقارت سے جواب دیا "مجھے تو سخت نفرت ہے اُس سے۔ دوسروں سے نقلیں کرنے کے سوا اُسے آتا ہی کیا ہے؟"

"تو پھر مراکش کے شاہی حرم سے مشہور حبشی مغنّی قاسم کو بلوا دوں؟ کہتے ہیں کہ اُس کے لحن میں عورتوں کے لحن کی شیرینی و نزاکت ہے۔"

"مجھے ان وحشی غلاموں کی صورت سے ڈر لگتا ہے،" سربتہ نے کانپتے ہوئے کہا "اور پھر اب مجھے رقص و سرود میں کوئی لطف بھی نہیں آتا۔"

"میری بیٹی"، بوڑھی خدیجہ نے مکاری سے منہ بنا کر کہا "ایسا مت کہو! اگر کہیں تم اُن تین جوان سرداروں کا گانا سن پاتیں جو ہمیں اُس دن راستے میں ملے تھے تو تم موسیقی کو کبھی بُرا نہ کہتیں —— مگر میری بچیو! یہ کیا ہوا؟ اُن

سرداروں کا نام سنتے ہی تمہارا رنگ کیوں اُڑ گیا؟ تُم اتنی پریشان کیوں نظر آنے لگیں؟

"کچھ نہیں، کوئی بات نہیں! امّی جان! آپ اپنی بات کہیے" سب ہم زبان ہو کر بولیں۔

"بیٹیو! بات یہ ہے کہ کل رات میں قرمزی بُرج کے پاس سے گزر رہی تھی کہ تینوں سردار مجھے حوالات میں بیٹھے نظر آئے۔ دن بھر کی مشقت کے بعد وہ آرام کر رہے تھے اور اپنا جی بہلا رہے تھے۔ ایک گٹار بجا رہا تھا اور باقی دونوں باری باری گا رہے تھے۔ اُن کے گانے میں کچھ ایسی کشش تھی کہ پہرے کے سپاہی بھی بُت بنے کھڑے تھے، جیسے کسی نے اُن پر جادو کر دیا ہو۔ اللہ میرا گناہ معاف کرے۔ میں نے اپنے وطن کے نغمے سُنے تو مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ کھڑی ہو کر اُن کا گانا سُننے لگی۔ دل پر بڑا اثر ہُوا اور ایسے شریف اور حسین نوجوانوں کو قید اور غلامی میں دیکھ کر بے حد دُکھ ہوا۔"

باتیں کرتے کرتے بوڑھی خدیجہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

زاہدہ نے اُس کے آنسوؤں سے فائدہ اُٹھایا "خدیجہ امّاں! کیا ہمیں بھی اُن سرداروں کی ایک جھلک دکھا سکتی ہو؟"

زبیدہ بولی "اُن کا گانا سن کر ضرور جی خوش ہو گا۔"

شرمیلی سرینہ کچھ نہ بولی۔ اُس نے اپنے ہاتھ خدیجہ کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

"اللہ مجھ پر رحم کرے!" خدیجہ نے جیسے ڈر کر کہا "میری بچیو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اگر بادشاہ کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو مجھے اور تمہیں سب کو مروا ڈالے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تینوں سردار بڑے شریف اور نیک معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا؟ وہ ہمارے دین کے دشمن ہیں اور تمہیں اُن کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے۔"

عورت کے ارادے میں ایک قابلِ تحسین جرأت ہوتی ہے خصوصاً عہدِ شباب میں اور اس ارادے کے سامنے وہ خطروں اور رکاوٹوں کی قطعی پروا نہیں کرتی۔ شہزادیاں اپنی بوڑھی خادمہ سے چمٹ گئیں اور روٹھنے سے، نرمی سے، التجاؤں سے، ہر طرح یہ ظاہر کیا کہ انکار سے اُن کے دل ٹوٹ جائیں گے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ خدیجہ آخر کیا کرے؟ یہ صحیح ہے کہ بادشاہ کے نزدیک دُنیا میں خدیجہ سے زیادہ

عقلمند کوئی اور عورت نہیں تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ بادشاہ کو اُس کی وفاداری پر پُورا بھروسا تھا لیکن کیا وہ شہزادیوں کو گٹار کے ایک نغمے سے محروم کر کے اُن کا دِل توڑ دے؟ علاوہ بریں، اگرچہ وہ اتنی مدّت تک عربوں میں رہی تھی اور اپنی مالکہ کی تقلید میں ایک وفادار خادمہ کی طرح اپنا دین چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیا تھا لیکن اصلاً وہ ہسپانوی تھی اور اب بھی اُس کے دِل میں عیسائیت کی چنگاری روشن تھی، اور اس لئے اُس نے شہزادیوں کی آرزو پُوری کرنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔

عیسائی قیدی قرمزی بُرج میں قید تھے اور اُن کی نگہبانی لمبی مونچھوں اور چوڑے چکلے کندھوں والے ایک حبشی کے سپرد تھی۔ حبشی کا نام حسین بابا تھا اور وہ ہر طرف اپنی کھُجلاتی ہوئی ہتھیلی کے لئے مشہور تھا۔ خدیجہ اُس کے پاس گئی اور سونے کا ایک سکّہ اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولی "حسین بابا! میری آقازادیوں، یعنی اُن تینوں شہزادیوں نے جنھیں بادشاہ نے الحمرا میں لا کر رکھا ہے ہسپانوی سرداروں کے گانے کی تعریف سُنی ہے اور کسی وقت اُسے سُننے کی مشتاق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جیسا نرم دِل انسان اُن کی اِس معصوم آرزو کو رَد نہیں کرے گا۔"

"کیا کہا؟ آرزو پُوری کر کے اسی بُرج قرمزی پر سُولی چڑھوں؟ اس لئے کہ اگر بادشاہ کو اس بات کی خبر ہو گئی تو سمجھ لو کہ سُولی ہی میرا انعام ہے۔"

اس طرح کا اندیشہ جی میں نہ لاؤ۔ اس معاملے کو اِس خوش اسلوبی سے انجام دیا جا سکتا ہے کہ شہزادیوں کی خواہش بھی پُوری ہو جائے اور بادشاہ کو بھی خبر نہ ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ الحمرا کی بیرونی دیوار کے نیچے ایک ندی بہتی ہے۔ تینوں قیدیوں کو وہاں کسی کام پر لگا دو اور انھیں اجازت دو کہ کام کے وقفوں میں اپنا جی بہلانے کے لئے خوب گائیں بجائیں۔ اس طرح شہزادیاں اپنے بُرج کے دریچوں سے اُن کا گانا سُن سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو سمجھ لو کہ انعام سے تمھارا جی خوش ہو جائے گا۔"

بوڑھی خدیجہ نے اپنی تجویز پیش کی اور حسین بابا کے منتظر ہاتھوں میں چپکے سے ایک طلائی سکّہ اور سرکا دیا۔ اُس کی فصاحت اور طلائی سکّوں کی گرمی نے حسین بابا کا دِل پگھلا دیا اور تجویز پر عمل شروع ہو گیا۔ نوجوان سرداروں کو ندی کے کنارے کام پر لگا دیا گیا۔ دوپہر کی تیز گرمی میں جب دوسرے مزدور

درختوں کے سائے میں لیٹ کر خراٹے لینے لگے اور پہرے کا سنتری ایک جگہ بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ تینوں برج کے نیچے آرام سے سبزے پر بیٹھ گئے اور گٹار کی ہم نوائی میں ایک ہسپانوی نغمہ شروع کر دیا۔

وادی غمگین تھی اور برج بلند لیکن گرم دوپہر کے سکوت میں نغمہ کی آوازیں دور تک گونجیں اور شہزادیوں نے اپنی شہ نشین میں بیٹھ کر قیدیوں کے گیت سنے۔ اُنھیں ہسپانوی زبان آتی تھی اس لئے نغمے کی شیرینی اور گھلاوٹ نے اُن کے دلوں میں جگہ کی لیکن دانش مند خدیجہ کو یہ نغمہ سن کر غصہ آنے لگا "اللہ ہمیں محفوظ رکھے!" اُس نے چلّا کر کہا "وہ تو محبت کا گیت گا رہے ہیں اور اُن کا مخاطب شہزادیوں سے ہے! اتنی بے ادبی! اتنی گستاخی! میں ابھی حسین بابا کے پاس جاتی ہوں اور اِس گستاخی کے عوض اُن کے ڈنڈے لگواتی ہوں"

"کیا؟ ایسے بہادر آدمیوں کے ڈنڈے؟ اور اتنے میٹھے گیت کی سزا میں"! تینوں حسین شہزادیاں اس ہولناک تصوّر سے کانپ گئیں۔ بوڑھی خدیجہ کو غصہ تو بہت تھا لیکن فطرتاً اُس کے مزاج میں نرمی تھی ——— پھر وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ قیدی سرداروں کے نغمے نے شہزادیوں پر خوشگوار اثر کیا ہے۔ ان کے زرد رخساروں پر سُرخی کی جھلک اور سوگوار آنکھوں میں چمک نمایاں تھی۔ اس لئے اُس نے آسانی سے سرداروں کا قصور معاف کر دیا۔

گیت ختم ہو گیا اور شہزادیوں پر کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ لیکن اس کے بعد شوخ زبیدہ نے اپنی بانسری اُٹھائی اور دھیمی الاپتی لیکن میٹھی لے میں ایک عربی نغمہ بجانے لگی۔ نغمے کی تان اس بول پہ ٹوٹتی تھی:

"پھول پتیوں کی آڑ میں چھپا ہوا ہے لیکن وہ خاموشی اور مسرت سے بلبل کے نغمے سن رہا ہے"

اُسی دن سے نوجوان قیدی ہر روز ندی کے کنارے کام کرنے لگے۔ حسین بابا ہر روز اپنی معمولی سخت گیری میں کمی کرتا رہا اور محبت کرنے والوں کے درمیان گیتوں اور نغموں کے ذریعے محبت کے پیام آتے جاتے رہے۔ دونوں طرف کے گیتوں میں دل کی دھڑکنوں کا شور ہر روز بڑھتا رہا ——— اور بالآخر شہزادیوں نے بند دریچوں کے پٹ کھول دیئے اور محافظ سپاہیوں کی نظر بچا کر وہ کبھی کبھی اپنے عاشقوں کو اپنے حسن کی جھلک دکھانے لگیں۔ اُنھوں نے پھولوں کی زبانی (جن کی شاعرانہ زبان سے عاشق و معشوق دونوں واقف تھے) ایک دوسرے سے گفتگو بھی شروع کر دی۔

محبت کرنے والوں کی راہ میں سنگِ گراں حائل ہوں تو حسن کی کشش زیادہ بڑھتی اور آتشِ شوق زیادہ بھڑکتی ہے ۔ محبت کا پھول کانٹوں میں اُلجھ کر زیادہ شگفتہ اور آتشِ فراق میں تپ کر زیادہ رنگین ہوتا ہے ۔

شہزادیوں کے کمھلائے ہوئے چہروں کو پھر شگفتہ اور افسردہ دِلوں کو پھر شادماں دیکھ کر بادشاہ متحیّر بھی ہوا اور مسرور بھی اور تجربہ کار خدیجہ اس تصوّر پر نازاں کہ یہ شگفتگی اُس کی چلائی ہوئی ہواؤں کا نتیجہ ہے ۔

لیکن ایک دن محبت کے باہمی پیاموں کا یہ سلسلہ ایکا ایکی ختم ہوگیا۔ قیدی سرداروں کے ندی کے کنارے آنے کا سلسلہ نہ جانے کیوں منقطع ہوگیا۔ شہزادیاں برج کے نیچے نظریں لے جاتیں لیکن بے سود، وہ اپنی ہنس کی سی گردنیں شہ نشین کے نیچے جھکا جھکا کہ اِدھر اُدھر تکتیں لیکن بے نتیجہ ۔ برج کے نہاں خانوں سے وہ اسیر بلبلوں کی طرح غم کے گیت گاتیں لیکن کوئی اُنھیں سُننے والا نہ تھا۔ کنجوں سے ان گیتوں کا جواب نہ ملتا اور کوئی قیدی سردار کی خبر نہ سناتا ــــــ آخر خدیجہ خبر کی جستجو میں نکلی اور بہت جلد یہ غم ناک پیام سنایا ” افسوس میری بچیو! میں جانتی تھی کہ اس کا انجام یہی ہوگا، لیکن تم کسی طرح نہ مانیں ، اور اب تمھیں اپنی بانسریاں ہمیشہ کے لئے بند کرکے رکھنی پڑیں گی ۔ ہسپانوی سرداروں کے عزیز کثیر رقمیں لے کر اُنھیں رہائی دلانے کے لئے آگئے ہیں اور سردار اپنے وطن جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں “

اس غم ناک خبر نے شہزادیوں پر بجلی گرادی ۔ زاہدہ اِس بات پر سخت ناراض تھی کہ اُن کے عاشق اُنھیں کوئی رخصتی پیغام دیئے بغیر یوں اپنے وطن جارہے ہیں۔ اسے وہ اپنی محبت کی توہین سمجھتی تھی ۔ زبیدہ یہ خبر سُنتے ہی رونے لگی ۔ وہ اپنے ہاتھ ملتی، آئینے کے سامنے جاکر کھڑی ہوتی اور پھر زار و قطار رونے لگتی۔ نرم و نازک سریتہ شہ نشین کی آڑ میں کھڑی ہوتی اور خاموشی سے آنسو بہاتی ۔ اُس کے آنسوؤں کے قطرے شبنم کی طرح پھولوں کے اُس کنج میں گرتے جہاں بیٹھ کر قیدی سردار زادے محبت کے گیت گاتے تھے ۔

بے چاری خدیجہ جس طرح ممکن ہوتا اُن کے زخمی دلوں پر مرہم رکھتی ۔ وہ اُن سے برابر کہتی ” میری بچیو! صبر کرو ۔ غم کی عادت پڑ جائے تو وہ تکلیف نہیں دیتا ۔ دنیا کا دستور یہی ہے ۔ جب تم بھی میری عمر کو پہنچو گی تو تمھاری سمجھ میں آئے گا کہ مرد کیا ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ تینوں سردار قرطبہ یا اشبیلیہ کی کسی نہ کسی ہسپانوی دوشیزہ کی زلفوں کے اسیر ہیں ۔ وہ بہت جلد اپنی شہ نشینوں میں رقص و سرود کی بزمیں آراستہ کریں گے اور

الحمرا کی حسین شہزادیوں کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیں گے۔ —— اس لئے میری بچیو! صبر سے کام لو اور اُن کا خیال اپنے دلوں سے نکال دو۔"

دانش مند خدیجہ کے سکون آمیز لفظوں سے شہزادیوں کا غم اور بڑھتا۔ دو دن تک اُن کے دلوں کو ذرا قرار نہ آیا۔ تیسرے دن علی الصبح بوڑھی خدیجہ اُن کے کمرے میں داخل ہوئی اور غصے سے چلائی "کوئی سوچ سکتا ہے کہ انسان اتنا گستاخ بھی ہو سکتا ہے؟"

وہ غصے سے بے قابو ہو کر کہتی رہی "مجھے اُس بے وفائی کی بھی سزا ملنی چاہیئے تھی، جو میں نے تمہارے باپ کے ساتھ کی —— خبردار جو اب تم میں سے کسی نے اپنے ہسپانوی چہیتوں کا نام بھی لیا!"

شہزادیاں اُس کا غصہ دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگیں "لیکن اچھی خدیجہ! بتاؤ تو سہی کہ کیا بات ہوئی؟"

"کیا بات ہوئی؟ —— بغاوت ہوئی، بغاوت کی گئی، یا بغاوت کی سازش کی گئی —— اور مجھ سے کی گئی، جو اپنے بادشاہ کی سب سے وفادار رعیت اور اپنی شہزادیوں کی سب سے باوفا خادمہ ہے —— ہاں! میری بچیو! یقین جانو کہ اِن گستاخ ہسپانوی سرداروں نے مجھے بغاوت کی سازش میں اُلجھایا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تمہیں یہاں سے فرار ہو کر قرطبہ جانے اور ہسپانوی سرداروں سے شادی کرنے کی سازش میں مدد دوں۔"

اتنا کہہ کر بوڑھی وفا پرست خادمہ نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تینوں حسین شہزادیوں کے چہرے زرد پڑ گئے، پھر اُن پر سُرخی دوڑ گئی، پھر وہ زرد ہوئے اور پھر سُرخ۔ وہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ شرمیلی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مُنہ سے کچھ نہ بولیں —— اور بوڑھی خادمہ اپنی جگہ بیٹھی غصے سے ہچکولے کھاتی رہی —— کبھی آگے کو جھکتی، کبھی پیچھے کو ہٹ جاتی اور پھر غصے سے چلا اٹھتی:

"کیا میں اب تک یہی ذلت سہنے کے لئے زندہ رہی تھی —— میں، جو نوکروں میں سب سے زیادہ وفادار ہوں!"

آخر بڑی شہزادی، جو تینوں میں زیادہ جری تھی اور ہر کام میں پیش قدمی کرتی تھی اُس کے قریب آئی اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی "امّاں خدیجہ! فرض کرو کہ ہم عیسائی سرداروں کے ساتھ جانے پر راضی ہوں —— تو کیا یہ ممکن ہے؟"

بوڑھی خادمہ کے غصّے کو تھوڑا سا وقفہ ملا۔ شہزادی کی بات سُن کر اُس نے گردن اُٹھائی اور تیزی سے بولی "ممکن! ــــــ ممکن کیوں نہیں؟ یقیناً ممکن ہے، اس لئے کہ قیدی سرداروں نے حسین بابا کو رشوت دے کر اس سازش میں شریک کر لیا ہے، اور سارا منصوبہ تیار ہے ــــ لیکن ذرا سوچو کہ بادشاہ کو دھوکا دینا کس طرح ممکن ہے ــــ بادشاہ کو، جو مجھ پر اتنا بھروسا کرتا ہے۔"

اتنا کہہ کر بوڑھی خادمہ پر غم کا ایک اور دَورہ پڑا۔ وہ پھر ہچکولے لے لے کر اپنے ہاتھوں کو مَلنے لگی۔

بڑی شہزادی نے متانت سے جواب دیا "لیکن ہمارے باپ نے ہم پر تو کبھی بھروسا نہیں کیا۔ اُس نے صرف مضبوط دروازوں اور آہنی سلاخوں پر بھروسا کیا ہے اور ہمیں قیدی بنا کر رکھا ہے۔"

بوڑھی خادمہ اپنے غم کو ایک اور وقفہ دیتے ہوئے بولی "ہاں! یہ تو بالکل درست ہے۔ اُس نے یقیناً تمھارے ساتھ معقول برتاؤ نہیں کیا۔ تمھیں اس طرح قید میں رکھ کر اُس نے تمھارے شباب پر ظلم کیا ہے۔ گلاب کے پھولوں کو گلدانوں میں سجا کر شگفتہ نہیں رکھا جاسکتا ــــ لیکن پھر؟ کیا تم اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ جانے کے لئے تیار ہو؟"

"لیکن بھاگ کر جس سرزمین میں ہم جارہے ہیں کیا وہ ہماری ماں کا وطن نہیں، جہاں ہم قیدی بن کر نہیں آزاد رہ کر زندگی بسر کریں گے اور کیا وہاں جا کر ہمیں ایک ظالم اور سخت گیر باپ کے عوض ایک محبّت کرنے والا شوہر نہیں ملے گا؟"

اس میں شبہہ نہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ تمھارا باپ ظالم ہے ــــ لیکن اس سے کیا؟" غم کا دَورہ پھر شروع ہوا۔ "کیا تم مجھے اُس کے انتقام کی آگ میں جلنے کے لئے یہیں چھوڑ جاؤ گی؟"

"بالکل نہیں، اچھی خدیجہ! کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے میری بچّی! ــــ اگر سچ پوچھو تو حسین بابا نے اس معاملے پر گفتگو کرتے وقت مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے تمھارے ساتھ جانے میں مدد دیگا ــــ لیکن پیاری! ایک بات اور سوچ لو۔ کیا تم اپنے باپ کا دین چھوڑنے کے لئے تیار ہو؟"

"ہماری ماں عیسائی تھی ——— میں بھی عیسائی بننے کو تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری بہنیں میرا ساتھ دیں گی۔"

"چلو، یہ بھی ٹھیک رہا" بوڑھی عورت اطمینان کے لہجے میں بولی "تمہاری ماں کا اصلی دین عیسائیت تھا اور اُسے مرتے دم تک اس کا غم رہا کہ اُس نے اسے کیوں چھوڑا۔ مرتے وقت میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری رُوحوں کی حفاظت کروں گی۔ اس وقت مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمہاری رُوحیں مُردہ نہیں ہوئیں۔ میری بچیو! میں بھی عیسائی پیدا ہوئی تھی اور دل سے اب بھی عیسائی ہوں۔ میں نے تہیّہ کیا ہے کہ عیسائی ہو کر مروں گی۔ میں نے حسین بابا سے سب باتیں طے کر لی ہیں۔ وہ اصلاً ہسپانوی ہے اور اُس کا گاؤں میرے گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ وہ بھی اپنے وطن جانے کے لئے تڑپ رہا ہے اور دوبارہ عیسائی ہونے کے لئے بے قرار ہے۔ سرداروں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم دونوں نے آپس میں شادی کر لی تو وہ ہمارے رہنے سہنے کا معقول انتظام کر دیں گے۔"

مختصر یہ کہ اس انتہائی دانش مند بڑھیا نے ہسپانوی سرداروں اور حسین بابا سے سازش کر کے فرار ہونے کا سارا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ بڑی شہزادی فوراً اس پر عمل کرنے پر راضی ہو گئی اور اُس کے طرزِ عمل نے حسبِ معمول چھوٹی بہنوں کے ارادے میں بھی پختگی پیدا کر دی۔ یہ صحیح ہے کہ سب سے چھوٹی نے پہلے بہت پس و پیش کیا اس لئے کہ اُس کا دل نازک اور کمزور تھا ——— وہ دیر تک کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا۔ پدرانہ محبت اور احساسِ شباب میں جنگ ہوتی رہی اور بالآخر حسبِ معمول شباب کے احساس نے فتح پائی اور ننھی شہزادی خاموش آنسوؤں اور دبی ہوئی آہوں کے ساتھ فرار کے منصوبے میں شریک ہو گئی۔

الحمرا کی سنگین پہاڑی میں شاہی زمانے میں بہت سی سُرنگیں کھودی گئی تھیں اور قلعے اور شہر کے مختلف حصّوں کے درمیان آمد و رفت کا کام دیتی تھیں۔ انھیں سرنگوں میں ہو کر حدرہ و شنیل کے دُور افتادہ ساحلی بندرگاہوں تک پہنچنا بھی آسان تھا۔ ان سرنگوں میں سے بعض اب باقی نہیں رہیں، کچھ اب بھی اُسی طرح قائم ہیں اور عرب حکمرانوں کی دُور اندیشی اور حکمتِ عملی کی شہادت دے رہی ہیں۔ حسین بابا نے شہزادیوں کو انھیں سرنگوں میں سے ایک کے راستے شہر کے باہر دریا کے ایک بندرگاہ تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا اور یہ طے تھا کہ

ہسپانوی سردار بہیں اپنی حسین محبوباؤں کے منتظر رہیں گے اور فوراً صبا رفتار گھوڑوں کے ذریعے انھیں ایک مملکت سے دوسری مملکت میں پہنچا دیں گے۔

مقرّرہ رات آگئی۔ شہزادیوں کے مسکن کو حسبِ معمول ہر طرف سے مقفّل کر دیا گیا اور الحمرا نیند کی خاموشیوں میں ڈوب گیا۔ آدھی رات کے قریب دانش مند خدیجہ نے شہ نشین کے دریچے میں سے باغ میں جھانکا۔ حسین بابا پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اُس نے مقرّرہ اشارہ کیا۔ خدیجہ نے شہ نشین سے ایک کمند باغ میں لٹکائی اور اُس کے ذریعے نیچے اُتر گئی۔ بڑی اور منجھلی شہزادی نے دھڑکتے ہوئے دلوں سے کمند میں پاؤں رکھا اور آہستہ آہستہ نیچے اُتر گئیں۔ لیکن جب سر بتیہ کی باری آئی تو وہ جھجکی اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ کئی بار اُس نے اپنے نازک قدم کمند کی طرف بڑھائے اور کھینچ لئے۔ وہ کسی طرح اپنے دل کو مضبوط نہ کر سکی۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اُس کے طائرِ دل کی پھڑپھڑاہٹ تیز ہوتی جاتی۔ اُس نے اُس ایوان پر حسرت بھری نظر ڈالی جس میں اُس نے بہت سے شب و روز بسر کئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اِس ایوان کی حیثیت ایک قفس کی تھی۔ اس قفس میں وہ آزاد تو نہیں تھی لیکن محفوظ ضرور تھی، اور کسے خبر قفس سے پھڑپھڑا کر نکلنے جانے والے طائر کے لئے دُنیا میں کیسے جال بچھے ہوئے ہیں! دُنیا کے خطروں کے ساتھ اُسے اپنے بہادر عاشق کا خیال آیا اور اُس نے فوراً کمند پر پیر رکھ دیا، لیکن فوراً ہی باپ کی شفقت یاد آئی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ایک نازک، ناتواں، بے تجربہ اور محبّت کرنے والے دل میں پیدا ہونے والی کشمکش کی مصوّری کتنی دُشوار ہے۔

سر بتیہ کی بہنیں نیچے کھڑی التجا کر رہی تھیں، خادمہ بُرا بھلا کہہ رہی تھی اور حسین بابا پیچ و تاب کھا رہا تھا، لیکن نازک، ناتواں اور معصوم حسینہ اُمید و بیم کے بھنور میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ گناہ کی لذّت اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، لیکن اُس کے خطرے پیروں میں بیڑیاں ڈال رہے تھے۔

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ افشائے راز کا خطرہ بڑھ رہا تھا —— یہاں تک کہ کہیں دُور سے آتی ہوئی ٹاپوں کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ حسین بابا نے گھبرا کر کہا "سپاہی گشت کے لئے نکل آئے۔ ہم نے ذرا بھی دیر کی تو ہماری جانوں کی خیر نہیں —— شہزادی نیچے اُترو، ورنہ ہم تمھیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔"

سر بتیہ کے دل میں ایک طوفان اُٹھا۔ اُس نے کمند کی رسّی کھولی اور ایک آہنی عزم کے ساتھ اُسے نیچے

پھینک دیا اور اُوپر سے چلائی :

" میں نے اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا۔ بھاگنا میری طاقت سے باہر ہے۔ پیاری بہنو! اللہ تمھارا حافظ و نگہبان !"

بڑی بہنوں کے دل چھوٹی بہن کو تنہا چھوڑنے کے خیال سے لرز گئے۔ وہ ابھی سوچ رہی تھیں کہ روندا کے سپاہیوں کی آوازیں اور قریب آگئیں۔ حسین بابا غصے سے دیوانہ ہو گیا اور وہ تیزی سے سُرنگ کے اندر داخل ہو گئیں۔ وہ سُرنگ کی خوفناک اور پیچ در پیچ راہوں میں اُلجھتی اور ٹھوکریں کھاتی، بالآخر سُرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ گئیں اور شہر پناہ کے باہر ایک آہنی دروازے کی راہ دریا کے کنارے جا پہنچیں۔ ہسپانوی سردار اُن کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے اور عرب سپاہیوں کی وردی میں ملبوس تھے۔

سربیترہ کے عاشق کو معلوم ہوا کہ وہ نہیں آئی تو اُسے بے حد رنج ہوا، لیکن وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ شہزادیوں کو نوجوان سرداروں کے پیچھے سوار کیا گیا، خدیجہ حسین بابا کے ساتھ اُس کے گھوڑے پر بیٹھی اور یہ چھوٹا سا قافلہ تیزی سے درہ لوپہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ اُنھیں الحمرا کی فصیلوں سے قرنا کا شور سُنائی دیا۔ حسین بابا نے گھبرا کر کہا "ہمارا راز فاش ہو گیا"!

" ہمارے گھوڑے صبا رفتار ہیں اور رات اندھیری ہے کسی کا ہم تک پہنچنا دشوار ہے" نوجوان سردار یک زبان ہو کر بولے۔

اُنھوں نے گھوڑوں کو ایڑ دی اور وہ سچ مچ ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ بہت جلد وہ جبال البیرہ کے نیچے پہنچ گئے۔ حسین بابا نے کان لگائے اور اطمینان ظاہر کرتے ہوئے کہا "کوئی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا اس لئے ہم آسانی سے پہاڑ کو عبور کر لیں گے۔" ابھی اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ الحمرا کے حفاظتی مینار سے ایک شعلہ بجلی کی طرح ہر طرف کوند گیا۔

حسین بابا چلایا "یہ ظالم شعلہ چوکیوں کے حفاظتی دستوں کو خبردار کر دے گا ــــ بھاگو! بھاگو! دیوانوں کی طرح بھاگو! ــــ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔"

اور وہ دیوانوں کی طرح بھاگے۔ اُن کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز چٹانوں میں گونجتی رہی اور وہ جبال البیرۃ کے نیچے سے گزرتی ہوئی شاہراہ کو روندتے ہوئے بجلی کی طرح آگے بڑھتے رہے۔ الحمرا کے شعلے کا جواب ہر سمت سے دیا گیا۔ پہاڑوں کے سب حفاظتی میناروں پر مشعلیں فروزاں ہوگئیں۔

"بڑھو! بڑھو! جلدی کرو" حسین بابا چیخا ——— قبل اس کے کہ پل کی چوکی والے خبردار ہوں پل کو عبور کرلو۔"

اُنھوں نے قدم اور تیز کئے، اور بہت جلد نہر جارف کے مشہور پل کے سامنے پہنچ گئے ——— نہر جارف جس کا تیزی سے بہتا ہوا پانی بارہا مسلمانوں اور عیسائیوں کے خون سے سرخ ہوا ہے۔ لیکن پل پر مشعلیں روشن تھیں اور اس روشنی میں زرہ بکتریں اور تلواریں بجلی کی طرح کوند گئیں۔ حسین بابا نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں، رکابوں پر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے ہر طرف نظر دوڑائی ——— سرداروں کو رُخ بدلنے کا اشارہ کرکے شاہراہ چھوڑی اور دریا کے کنارے آگیا۔ کچھ دُور کنارے کنارے چل کر اُس نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔ شہزادیوں نے سرداروں کی کمر زیادہ مضبوطی سے پکڑلی اور اُن کے گھوڑے بھی آناً فاناً پانی میں کود پڑے۔ تھوڑی دُور تک وہ پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہتے رہے۔ طوفانی لہریں اُن کے گرد حلقہ بناتی رہیں، شہزادیاں عیسائی سرداروں سے چمٹی بیٹھی رہیں اور اُن کے لبوں پر سکوت کی مُہر لگی رہی۔ گھوڑے موجوں سے لڑتے لڑاتے تھوڑی دیر میں دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور بخیر یہ کار حسین بابا سنسان، ویران پہاڑوں راستوں سے گزارتا اُنھیں قرطبہ لے آیا۔ وہ قرطبہ پہنچے تو اُن کے عزیزوں نے خوشی میں خوب جشن منائے، اور حسین شہزادیوں کی شادی نوجوان سرداروں سے ہوگئی۔

شہزادیوں کو دریا پار اُتارنے کی جلدی میں ہم نے بڑھی خدیجہ کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ گھوڑوں کے اس طوفانی سفر میں وہ برابر حسین بابا سے چمٹی بیٹھی رہی۔ ہر چھلانگ اور ہر جھٹکے پر وہ چیختی چلّاتی اور حسین بابا کی ڈانٹ ڈپٹ سُنتی رہی۔ لیکن جب حسین بابا نے گھوڑا پانی میں ڈالا تو اُس کے خوف کی حد نہ رہی اور اُس نے حسین بابا کی کمر پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے پکڑلی۔ اس پر حسین بابا چیخا "مجھے اتنے زور سے مت پکڑو۔ بس میری پیٹی کو مضبوطی سے تھام لو اور نڈر ہو کر بیٹھ جاؤ۔" اُس نے پیٹی مضبوطی سے پکڑلی۔ لیکن جب مفروروں کا یہ قافلہ دم لینے کے لئے پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہرا تو حسین بابا کو پتہ چلا کہ خدیجہ گھوڑے پر نہیں ہے۔

شہزادیاں غم سے چلا اٹھیں "خدیجہ کو کیا ہوا؟"

حسین بابا نے جواب دیا "خدا بہتر جانتا ہے۔ جب ہم دریا پار کر رہے تھے تو میری پیٹی کھل گئی اور خدیجہ دریا میں گر پڑی اور لہریں اسے نہ جانے کدھر بہا لے گئیں۔ اللہ کی یہی مرضی تھی! لیکن میری پیٹی جڑاؤ تھی اور بہت قیمتی تھی۔"

غموں میں وقت ضائع کرنے کی فرصت نہ تھی، گو شہزادیوں کو اپنی دانش مند خادمہ کی جدائی کا سخت ملال تھا۔ لیکن خوش قسمت خدیجہ کو بھی بلی کی طرح اللہ نے ۹ جانیں دی تھیں۔ طوفانی لہروں نے اگر آٹھ جانیں ختم بھی کر دی ہوں تو نویں جان باقی رہ گئی۔ دریا کے بہاؤ پر ایک مچھیرے نے جال ڈال رکھا تھا۔ اس نے جال کھینچا تو اس میں خدیجہ بھی مگرمچھ کی طرح نکلی۔ مچھیرا اسے دیکھ کر سخت متحیر ہوا۔ اس نے خدیجہ کے ساتھ کیا کیا اور خدیجہ کا اس کے بعد کیا حشر ہوا ——— اس کا حال داستانوں میں بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن یقین کے ساتھ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ خواہ اور کہیں بھی گئی ہو اس کی دانش مندی اور دور اندیشی نے اسے کبھی بائیں ہاتھ والے محمد الیحبری کی دسترس سے دور رکھا ہو گا۔

اسی طرح داستان طرازوں نے یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ جب دور بین و دور اندیش بادشاہ کو اپنی بیٹیوں کے فرار ہونے کی اطلاع ملی تو اس کا کیا حال ہوا ——— زندگی میں صرف ایک بار اس نے کسی مشکل کے وقت کسی دوسرے کا مشورہ لیا تھا اور وہ موقع یہی تھا۔ اس کے متعلق یہ ضرور معلوم ہے کہ اپنی زندگی میں پھر کبھی وہ اس غلطی کا مرتکب نہیں ہوا۔ لیکن اس نے اپنی تیسری بیٹی کی حفاظت میں پہلے سے بھی زیادہ اہتمام کیا، حالانکہ اس کے معاملے میں یہ احتیاط اس لئے غیر ضروری تھی کہ اس میں کسی کے ساتھ فرار ہونے کی ہمت نہ تھی۔ گو سنا گیا ہے کہ اپنی بہنوں کے ساتھ نہ جانے پر وہ کبھی کبھی پچھتاتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ برج کی فصیل پر کھڑی افسردہ نگاہوں سے قرطبہ کی طرف دیکھے جا رہی ہے۔ اور پھر کبھی کبھی اس کے ایوان سے بانسری کے درد بھرے نغمے بھی سنائی دیتے تھے اور لوگوں کا اندازہ ہے کہ ان نغموں میں درد کی جو کسک تھی وہ بہنوں کی جدائی اور محبوب کے فراق کی پیدا کی ہوئی تھی۔ معصوم شہزادی نے کچھ عرصے تک سوگ کی یہ تنہا زندگی بسر کی اور جوانی ہی میں مر گئی۔ اسے برج کے نیچے ایک گنبد کے نیچے دفن کیا گیا۔ لیکن الحمرا کے ویرانوں میں اب بھی بعض ایسی داستانیں

گونج رہی ہیں جن میں اُس کی بدنصیبی کی غم انگیز کہانی دُہرائی گئی ہے۔

---

# طلسمی سپاہی

سلمانکا میں سینٹ سپرین کے غار کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا؟ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ایک ساحر گورکن یہاں پوشیدہ طور پر ہیئت، علم الارواح اور دوسرے علوم مظلمہ اور فنونِ خبیثہ کی تعلیم دیا تھا —— بلکہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ اس ساحر گورکن کے بھیس میں خود ابلیس تھا۔ اس غار کا منہ مدتیں ہوئیں بند کر دیا گیا اور لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کا محل وقوع کیا تھا، گو عام روایت یہ ہے کہ یہ غار اس جگہ تھا جہاں مدرسۂ قروجل کے مختصر صحن میں پتھر کی صلیب نصب ہے۔ اور ہم اس وقت جو داستان سنا رہے ہیں اس سے اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں سلمانکا میں ایک طالب علم پڑھتا تھا جس کا نام ڈان وِسنتے تھا۔ یہ طالب علم بے فکرے طلباء کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو خالی ہاتھ اور خالی کیسے لے کر علم کی رہ گزر پہ گامزن ہو جاتے ہیں اور مدرسے کی تعطیل کے زمانے میں قریہ قریہ، دیار دیار پھر کر دریوزہ گری کرتے اور اپنی تعلیم کے لئے فلوس و درم فراہم کرتے ہیں۔ چھٹیاں ہوئیں تو وِسنتے نے بھی یہ مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے موسیقی سے تھوڑا بہت لگاؤ تھا اس لئے اپنا سفر شروع کرنے سے پہلے اس نے اپنے کندھے پر ایک ستار رکھ لیا کہ سادہ دل دہقانیوں کو خوش کر کے اپنے لئے زادِ راہ حاصل کرتا رہے۔

وہ مدرسے کے صحن میں لگی ہوئی پتھر کی صلیب کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اُس نے اپنی ٹوپی اُتاری اور سینٹ سپرین سے اپنی مُہم کی کامیابی کی دعا مانگنے لگا۔ وہ دُعا مانگ رہا تھا کہ صلیب کے قریب زمین پر اُسے کوئی چیز چمکتی دکھائی دی۔ اُس نے جھک کر وہ چمکدار چیز اُٹھائی تو وہ کسی کی مُہر تھی جو سونے چاندی کے میل سے بنائی گئی تھی۔ مُہر پر دو مثلث اس طرح بنے ہوئے تھے کہ اُن کے کٹنے سے ایک ستارے کی شکل بن جاتی تھی۔ ستارے کے اس نمونے کو قوت کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے، جو حضرت سلیمان کا اختراع تھی اور جسے سحر و طلسم میں بڑی اہم چیز خیال کیا جاتا ہے، لیکن سیدھا سادا طالب علم نہ ولی تھا نہ ساحر اور اس لئے اس علامت کی اہمیت سے واقف نہ تھا۔ اُس نے انگوٹھی کو سینٹ سپرین کا انعام سمجھ کر اُنگلی میں ڈال لیا اور صلیب کو تعظیم دے کر ستار کے تاروں پر اُنگلیاں مارتا خوشی خوشی اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔

اسپین میں اس طرح کے گداگر یا وظیفہ خوار طالب علموں کی زندگی بڑے مزے سے گزرتی ہے بشرطیکہ وہ دوسروں کو خوش کرنے کا ہُنر جانتے ہوں۔ وہ اپنے من کی موج میں گاؤں گاؤں، شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں۔ گاؤں کے چھوٹے پادری، جو اپنی طالب علمی کا دور اسی طرح گزار چکے ہوتے ہیں رات کی رات ان سیاح طالب علموں کی میزبانی کرتے ہیں اور صبح کو دو چار سکّوں سے اُن کی مٹھی گرم کر کے اُنھیں رخصت کر دیتے ہیں۔ شہر کی گلیوں میں دربدر پھرنے والے ان طالب علموں کو نہ کوئی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور نہ اُن سے بے رُخی برتتا ہے اس لئے کہ علم کے حصول کی خاطر یہ دریوزہ گری کوئی معیوب چیز نہیں۔ یوں کہ ہسپانیہ کے اکثر اربابِ علم و فضل کی علمی زندگی کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے — لیکن اگر طالب علم ایسا ہو جیسا کہ ڈان وسینتے تھا — خوش رو اور خوش مزاج اور ستار بجانے کے ہُنر سے واقف، تو دہقان اُس کا بڑا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہیں اور اُن کی بہو بیٹیاں اُس پر تبسم کے پھول نثار کرتی ہیں۔

غرضیکہ علم و دانش کے اس شکستہ حال اور موسیقی داں فرزند نے اسپین کی مملکت کا نصف سے زیادہ حصّہ طے کر لینے بعد یہ تہیہ کیا کہ واپسی سے پہلے غرناطہ کی زیارت ضرور کرے گا۔ اپنی اس طالب علمانہ سیاحت میں اُسے کبھی گاؤں کے پادری کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا اور کبھی کسی دہقان کی سادہ لیکن پُرخلوص جھونپڑی کی آغوش میں پناہ ملتی۔ جب وہ دہقانوں کی جھونپڑیوں کے دروازے پر بیٹھ کر ستار بجاتا اور سادہ دُھن میں کوئی دلکش نغمہ چھیڑتا

تو سادہ دل دہقانوں کے دل کنول کی طرح کھل جاتے اور کبھی کبھی گاؤں کے چراغوں کی مدھم روشنی میں دہقانوں کے معصوم بچے اور بچیاں اُس کی دھنوں پر رقص کرنے لگتیں۔ صبح کو وہ میزبان اور اُس کی بیوی کی دعاؤں اور اُن کی غزالیں چشم بیٹی کی مہربان نظروں کا تحفہ لے کر وہاں سے رخصت ہو جاتا۔

بالآخر ہوتے ہوتے وہ اپنی اس پُر ترنم آوارگی کی منزلِ مقصود، یعنی غرناطہ کے مشہور و معروف شہر میں پہنچ گیا اور حیرت سے عربوں کے تعمیر کیے ہوئے بُرجوں اور میناروں، اُس کے حسین مرغزاروں اور بہار کی فضا میں چمکتے ہوئے برفانی پہاڑوں پر نظر ڈال کر خوش ہونے لگا۔ یہ بتانا لاحاصل ہے کہ وہ کس فرطِ شوق سے غرناطہ کے پھاٹک میں داخل ہوا اور اُس کی شاہراہوں پر گھوم پھر کر مشرقی تعمیر کی شاندار یادگاروں کا کس حیرت و استعجاب سے مشاہدہ کیا۔ ہر دریچے سے جھانکتے ہوئے چہرے یا شہ نشین پر جھکتی ہوئی نظر میں اُسے زبیدہ کا روئے تاباں اور زاہدہ کی چشم ناز کی جھلک دکھائی دی۔ شہر کی شاہراہ سے گزرتی ہوئی ہر حسینہ کو اُس کی نظر نے کوئی عرب شہزادی جانا اور اپنی طالب علمانہ گلیم اُس کے قدموں میں بچھا دی۔

وضع کے بوسیدہ و فرسودہ لباس کے باوجود، اُس کی موسیقی کی مہارت، اُس کی زندہ دلی، اُس کی کمسنی اور اُس کے مردانہ حسن نے اُسے شہزادیوں کا محبوب بنا دیا اور اُس نے غرناطہ کی گلیوں اور اُس کے نواح میں کئی دن بڑے لطف اور بڑی آسائش سے بسر کیے۔ غرناطہ میں اُس کا سب سے پسندیدہ مستقر وادی حدرہ کا مشہور فوّارہ تھا۔ یہ فوّارہ غرناطہ کی سب سے پُر لطف سیر گاہ ہے، جو عرب حکمرانوں کے زمانے میں اتنی ہی پسندیدہ تھی جتنی آج کل۔ یہاں ہمارے نوجوان طالب علم کو نسوانی حسن کے مشاہدے اور مطالعے کا موقع سب سے زیادہ ملتا تھا، اور علم کے اس شعبے کی طرف اُس کا میلان ذرا زیادہ تھا۔

فوّارے پر پہنچ کر وہ اپنے لیے ایک گوشہ تلاش کر لیتا اور یہاں بیٹھ کر، اپنے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو جانے والے مدّاحوں کو محبت کے گیت سُناتا۔ ایک شام وہ اسی طرح مردوں اور عورتوں کے حلقے میں بیٹھا ستار بجا رہا تھا کہ اُس نے ایک پادری کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ پادری کے قریب آتے ہی سب نے احتراماً اپنی ٹوپیوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے سلام کیا۔ بظاہر وہ کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا اور اُس کا چہرہ مقدس زندگی کا نہ سہی، پُر آسائش زندگی کا آئینہ دار یقیناً تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا ہوا تھا اور اُس پر خون کی سُرخی جھلک رہی تھی۔ موسم کی حدّت اور پیادہ پائی

کی مشقت سے اُس کا جسم پسینے میں تر بتر تھا۔ پادری سڑک پر سے گزرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی جیب سے کوئی سکہ نکالتا اور کرم گستری کی ایک خاص شان سے کسی گداگر کے ہاتھ پہ رکھ دیتا۔ یوں فقیروں پر جود و سخا کی یہ بارش کرتا پادری آگے بڑھتا اور لوگوں کی دعائیں لیتا رہا ــــ "خدا پادری صاحب کو بڑی عمر دے اور جلدی بڑے پادری کا عہدہ عطا کرے۔"

پہاڑی کے سنگلاخ راستے سے اُترتے ہوئے وہ کبھی کبھی شفقت و نرمی سے اپنے ساتھ چلتی ہوئی حسین خادمہ کے ہاتھ کا سہارا لیتا۔ جس کے لئے بظاہر اس مہربان پادری کے خانۂ دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ اُف! وہ حسین دوشیزہ! سر سے پیر تک اندلسی حسن کا مجسمہ، بالوں میں گندھے ہوئے گلاب سے لے کر نازک چمکیلے جوتوں اور کڑھے ہوئے موزوں تک اندلس کی تصویر! ہر جنبشِ قدم میں تنِ نازک کے ہر لوچ میں اندلس کا عکسِ رنگیں ــــ شاداب، شیریں اور پگھلتا، مچلتا ہوا اندلس! اور اس فتنہ سامانی کے باوجود شرم و حیا کی دیوی! نیچی نظریں، متوجہ گوش ــــ کبھی کبھی بے خیالی میں اوپر اُٹھ کر چار ہو جاتے اور پھر تیزی سے زمین کی طرف جھک جانے والی نظریں۔

شفیق پادری نے فوارے کے قریب والے مجسمے پر شفقت کی نظر ڈالی اور اطمینان سے ایک پتھر کی تپائی پر بیٹھ گیا۔ حسین خادمہ نے فوراً ہی ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے شفاف پانی کا ایک گلاس اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پادری نے پانی ایک ایک گھونٹ کر کے مزے لے لے کر پی لیا اور ہر گھونٹ سے پہلے تلے ہوئے انڈے کا ایک خوش ذائقہ ٹکڑا منہ میں رکھ کر مسرور ہوتا رہا۔ خالی گلاس حسین خادمہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اُس نے اُس کے نازک رخسار پر ایک ہلکی سی چٹکی لے لی ایسی چٹکی جو بے اندازہ شفقت و مہر کی مظہر تھی۔

ستار بجاتے ہوئے طالب علم حسرت سے دل ہی دل میں سوچنے لگا "کتنا خوش نصیب ہے یہ مہربان پادری بھی، جسے ہر وقت اِس جیسی حسینہ کی ہم نشینی و ہم جلیسی کی مسرت حاصل ہے!"

لیکن یہ قابلِ رشک مسرت اُس کے نصیب میں نہ تھی۔ اُس نے وہ سارے افسوں جن سے وہ دہقان دوشیزاؤں کو بارہا اپنا مفتوں و گرویدہ بنا چکا تھا، آج بھی آزمائے لیکن پادری کی قابلِ رشک مسرت اُس کے حصے میں نہ آئی۔ اُس نے اپنے ستار کے تاروں کو کبھی اس مہارت سے نہ چھیڑا تھا اور کبھی اُس کے سینے سے اتنے دل دوز نغمے نہ نکلے تھے، لیکن افسوس! آج اُس کے حریف گاؤں کے پادری اور دہقانی دوشیزائیں نہیں تھیں۔

شفیق پادری کو غالباً موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور شرمیلی دوشیزہ نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی نظریں زمین سے نہ ہٹائیں۔ پادری نے پتھر کی تپائی پر بہت تھوڑی دیر بیٹھ کر پھر غرناطہ کا رُخ کیا۔ حسین خادمہ نے چلتے ہوئے ایک اچٹتی سی شرمیلی نظر طالب علم پر ڈالی، لیکن یہی ایک نظر اُس کا دل چھیننے کے لئے کافی تھی۔

دونوں چلے گئے تو اُس نے لوگوں سے اُن کا اتا پتا پوچھا۔ پادری ٹامس غرناطہ کے پادریوں میں سے ایک تھا ——— پابندیٔ اوقات کا مکمل نمونہ۔ اُس کے سو کر اٹھنے، ناشتہ کرنے، کھانا کھانے، قیلولہ کرنے، بچوں کے معصوم کھیل کھیلنے، شام کو ٹہلنے، رات کو گرجے کے مخصوص حلقوں میں گپ بازی کرنے اور سونے کے اوقات مقرر تھے۔ وہ ان کی پوری پابندی کرتا اور اگلے دن پھر انھیں معمولات کے وظیفے کے لئے تر و تازہ بیدار ہوتا۔ سواری کیلئے اُس کے پاس ایک چکنا چپڑا اسپک رو خچر تھا، اُس کے پسندیدہ کھانے پکانے کے لئے ایک مستعد خادمہ، اور رات کو اُس کے تکیئے کی شکن دُرست کرنے اور صبح کے لئے چاکلیٹ کی پیالی مہیا کرنے کے لئے حسین اندلسی دوشیزہ۔

اے طالب علم کی آزاد اور بے غم زندگی تیرا خدا حافظ! ایک چشم مست کی اچٹتی ہوئی نظر اُس سے سب کچھ چھین کر لے گئی۔ کسی لمحے اُس کے دل سے اِس شرمیلی حسینہ کی تصویر کا نقش محو نہ ہوتا۔ اُس نے پادری کے مسکن تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن وہ اُس جیسے کوچہ گرد طالب علموں کی رسائی سے باہر تھا۔ پادری کو اُس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے کہ اُسے کبھی اپنی نانِ شبینہ کے لئے نادوں کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ دن کو وہ دُور سے پادری کے گھر کا طواف کرتا اور کبھی کبھی دریچے میں سے اُسے حسین خادمہ کی جھلک نظر آجاتی لیکن یہ جھلک اُمید کی کوئی کرن دکھانے کے بجائے محبت کے شعلے کو اور بھڑکاتی۔ اور وہ رات کو پادری کی شہ نشین کے نیچے اپنا نغمۂ محبت سناتا۔ ایک دن کھڑکی میں کسی سفید چیز کے جلوے سے اُس کے دل میں دھڑکن پیدا ہوئی، لیکن افسوس! یہ پادری کی شب خوابی کی سفید ٹوپی کی جھلک تھی۔

محبت شاید اتنی صادق کبھی نہیں ہوئی اور حسن نے شاید اتنا شرمیلا پن کبھی نہیں دکھایا۔ غریب طالب علم مایوسی کی تصویر بن گیا۔ اور آخر ہوتے ہوتے سینٹ جان کا تہوار آپہنچا، جب غرناطہ کے غریب مرد، عورتیں اور بچّے دیہاتوں کا رُخ کرتے ہیں، شام کا وقت رقص و نغمے میں گزارتے ہیں اور راتیں حدرہ اور شنیل کے ساحلوں

پر بسر کرتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں اُس وقت جب آدھی رات کو گرجا کی گھنٹیاں بجتی ہوں حدرۃ و شنیل کے بہتے ہوئے پانی میں منہ دھونے کا موقع مل جائے ـــ اس لئے کہ اِس خاص لمحے پانی میں چہرے کو حسین بنانے کی طلسمی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ کوچہ گرد طالب علم کی بے شغلی اُسے بھی غرناطہ کے سیلانیوں کے ساتھ حدرۃ کی تنگ وادی میں لے آئی اور اُس نے اپنے آپ کو بلا ارادہ الحمرا کے سُرخ برجوں کے زیر سایہ پہاڑی کے دامن میں کھڑا پایا۔ دریا کی خشک ترائی، اُسے اپنے حلقے میں لینے والی سنگلاخ چٹانیں اور ان چٹانوں کا حاشیہ بنانے والے مرغزار سیلانیوں کی گہما گہمی اور چہل پہل سے معمور تھے اور انگوروں اور انجیروں کے سائے میں ستار اور جھانجھ اور رقص کی جھنکار گونج رہی تھی۔

طالب علم حدرۃ کے تنگ پُل کے ایک بھدّے اور بھاری پتھر کے سہارے کھڑا غم کے بھنور میں ہچکولے کھاتا رہا۔ اُس نے اس ہشاش بشاش مجمعے پر حسرت بھری نظر ڈالی جس میں ہر نوجوان کے ہاتھ میں ایک حسینہ کا ہاتھ تھا اور وہ اپنی تنہائی کے احساس سے، غمگین، اُس چشم مست کے تصوّر میں غرق تھا جس تک اُس کی رسائی نہ تھی۔ اُسے اپنا بوسیدہ لباس محبت کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا نظر آ رہا تھا۔

اتفاق سے اُس کی نظر ایک اور آدمی پر پڑ گئی، جو اُسی کی طرح یکہ و تنہا اُس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ یہ یکّہ و تنہا شخص خاکستری داڑھی اور سنجیدہ چہرے والا ایک طویل قامت سپاہی تھا جسے بظاہر انار کے درخت کے پاس سنتری بنا کر کھڑا کیا گیا تھا۔ زمانے نے اُس کے چہرے کو سنولا دیا تھا۔ اُس کے جسم پر ایک قدیم ہسپانوی زرہ بکتر، کندھے پر ڈھال اور ہاتھ میں نیزہ تھا اور وہ اپنی جگہ بُت بنا کھڑا تھا۔ یہ بات طالب علم کے لئے باعثِ حیرت تھی کہ گو سپاہی کے جسم پر ایسا عجیب لباس تھا لیکن گزرنے والوں میں سے کوئی اُس کی طرف دھیان نہ دیتا۔ وہ اُس کے جسم کو چھوتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔

طالب علم نے اپنے دل میں سوچا "یہ شہر قدیم زمانے کے عجائبات کا شہر ہے، اور یقیناً یہ سنتری بھی اس شہر کا ایسا عجوبہ ہے جس سے یہاں کے باشندے اچھی طرح مانوس ہیں اور اس لئے اُس کی یہاں موجودگی اُن کے لئے باعث استعجاب نہیں"، لیکن اس کے ذوقِ تجسّس نے اُس کے قدموں کو جنبش دی اور طبعاً ملنسار ہونے کے سبب وہ سپاہی کے قریب گیا اور اُسے یوں مخاطب کیا۔

"اجنبی دوست! تم نے کتنا عجیب زرہ بکتر پہن رکھا ہے؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس فوجی دستے کے سپاہی ہو؟"

سپاہی نے اُن جبڑوں کو ہلا کر جو یقیناً زنگ آلود ہو چکے تھے بہ مشکل جواب دیا:-

"فرڈیننڈ اور اشابیلا کا محافظ شاہی دستہ!"

"اللہ تم پر رحم کرے! لیکن یہ فوجی دستہ تو اب سے تین صدی پہلے تھا۔"

"اور تین صدیوں سے میں سنتری کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب میرے گشت کی مدت ختم ہونے والی ہے ـــ لیکن بتاؤ تمھیں دولت چاہیئے؟"

طالب علم نے جواب میں اپنا بوسیدہ لبادہ اُس کے آگے پھیلا دیا۔

"میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن تم میں ہمت اور ایمان ہے تو میرے ساتھ آؤ اور سمجھ لو کہ تمھارے دن پھر گئے۔"

"دوست! ذرا آہستہ آہستہ بولو۔ جس کے پاس ایک جان اور ایک ٹوٹے پھوٹے ستار کے سوا کھونے کو کچھ اور نہ ہو اُسے تمھارے ساتھ چلنے کے لئے زیادہ ہمت کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ میرے لئے ان دونوں چیزوں کی قیمت یکساں ہے۔ لیکن میرا ایمان؟ اُس کی صورت ذرا مختلف ہے۔ اُسے طمع کا شکار بنانا آسان نہیں۔ اگر میرے دن کوئی جرم کر کے پھرنے والے ہیں تو ہرگز مت سمجھو کہ میرا یہ بوسیدہ لباس مجھے کسی جرم پر آمادہ کر سکے گا۔"

سپاہی نے طالب علم پر سخت غصّے کی نظر ڈالی اور بولا "میں نے تلوار دین اور تاج کی حمایت کے سوا کبھی کسی اور مقصد سے نہیں اُٹھائی۔ میں سچّا عیسائی ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرو اور بے خوف ہو کر میرے ساتھ چلو۔"

طالب علم حیرت سے اُس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ گزرنے والوں میں سے کسی نے اُن کی گفتگو میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لی اور سپاہی سیلانیوں کے گروہوں میں سے اس طرح گزر رہا تھا جیسے وہ کسی کو نظر ہی نہیں آ رہا۔

پُل پار کر کے، سپاہی ایک تنگ اور سنگلاخ راستے سے ہوتا ہوا مسلمانوں کے زمانے کی ایک پن چکی کے پاس پہنچا اور وہاں اُس نالے کے اوپر چڑھ گیا جو الحمرا اور جنت العریف کی حد بندی کرتا ہے۔ سورج کی آخری کرنیں الحمرا کی قرمزی فصیلوں پر پہنچ کر اپنا دن کا سفر ختم کر رہی تھیں اور گرجا کی گھنٹیاں تیوہار کی مسرتوں کا پیام سُنا رہی تھیں۔ انجیر کے درختوں، انگور اور حنا کی شاخوں اور قلعے کے بیرونی برجوں اور دیواروں کا سایہ نالے پر پڑ رہا تھا۔ فضا تاریک اور سُنسان تھی اور کہیں کہیں چمگادڑوں کے پیروں کی سنسناہٹ سُنائی دینے لگی تھی۔ سپاہی چلتے چلتے ایک دُور اُفتادہ اور ویران بُرج کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ اس نے اپنی برچھی کا دستہ زور سے زمین پر مارا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور سنگلاخ زمین میں دروازے کے برابر چوڑا ایک شگاف پیدا ہو گیا۔

سپاہی نے طالب علم سے کہا "مقدس تثلیث کا نام لے کر اندر داخل ہو جاؤ اور ڈرو مت"!

طالب علم کا کلیجہ کانپ گیا لیکن اُس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اپنے پُر اسرار رہنما کی قیادت میں ایک گہرے تہ خانے میں داخل ہوا جو چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ تہ خانے کی دیواروں پر ہر طرف عربی عبارتیں کندہ تھیں۔ سپاہی نے تہ خانے کے ایک طرف بچھی ہوئی ایک پتھر کی تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طالب علم سے کہا "تین سو سال سے یہی پتھر میری نشست گاہ ہے" حیرت زدہ طالب علم نے سپاہی پر ایک فقرہ چست کرنے کی کوشش کی "سینٹ انتھونی کی قسم! اس نرم و نازک بستر پر تمھیں نیند تو خوب گہری آتی ہو گی"!

"تمھارا خیال درست نہیں۔ یہ آنکھیں نیند کی رفاقت سے بیگانہ ہیں۔ تین سو سال سے مسلسل نگہبانی میرا مقسوم رہی ہے۔ تم چاہو تو میری داستان سن لو ــــــ جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں میں فرڈینینڈ اور اشابیلا کے شاہی محافظ دستے کا ایک سپاہی تھا۔ عربوں کے ایک دھاوے میں گرفتار ہوا اور اس برج میں قید کر دیا گیا۔ جب عیسائیوں کا اقتدار شروع ہوا اور اس قلعے کو اُن کے حوالے کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں تو ایک عرب درویش نے، جس کا نام الفقیہہ تھا، میری مدد سے ابی عبداللہ کا کچھ خزانہ اِس تہ خانے میں منتقل کر دیا۔ مجھے اس جُرم میں شرکت کی سزا ملی۔ الفقیہہ نے جو حقیقت میں ایک افریقی ساحر تھا، اپنے سحر کی تاثیر سے مجھے اس خزانے کا پاسبان بنا دیا۔ یہ خدمت میرے سپرد کر دینے کے بعد بوڑھا ساحر پھر کبھی یہاں نہیں آیا۔ خدا جانے اُس کا کیا

حشر ہوا۔ میں اُسی وقت سے اس تہہ خانے میں زندہ درگور ہوں۔ صدیاں گزر گئیں۔ زلزلوں نے پہاڑ کو تہ و بالا کر دیا۔ برج اور قلعے کے پتھر ایک ایک کر کے زمین کی سطح پر آتے رہے۔ زمانے کی فطری دستبرد نے گرد و پیش کی ہر چیز کو نیست و نابود کر دیا، لیکن تہ خانے کی سحر زدہ دیواریں زلزلے اور وقت کے حوادث سے بے خبر مضبوطی سے اپنی جگہ کھڑی ہیں۔

" ہر سو سال کے بعد سینٹ جان کے تیوہار کے دن طلسم کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے اور مجھے اس غار سے حدرۃ کے پل پر جا کر اُس جگہ کھڑے ہونے کی اجازت ملتی ہے، جہاں آج تم نے مجھے دیکھا تھا۔ میں اُس جگہ کھڑا ہو کر اُس شخص کا انتظار کرتا ہوں جس کے ہاتھوں یہ طلسم ٹوٹنے والا ہے۔ آج سے پہلے میں نے سینٹ جان کے دو تیوہار وہاں کھڑے ہو کر گزارے لیکن مجھے میرے طلسم سے رہائی دینے والا نہ آیا، اور میں انسانوں کی نظر سے اوجھل اس طرح یہاں واپس آ گیا جیسے بادلوں نے مجھے پردے میں چھپا رکھا ہو۔ تم پہلے شخص ہو جس نے تین سو سال بعد آج مجھ سے بات کی اور اس کا سبب مجھے معلوم ہے۔ تمھاری اُنگلی پر حضرت سلیمان کی انگوٹھی ہے جس کی تاثیر پہننے والے کو ہر طلسم کے اندیشوں سے بے خطر اور محفوظ کر دیتی ہے۔ اب یہ تمھارے ہاتھ میں ہے کہ مجھے اس قید سے رہائی دلواؤ یا سو برس کے لیے اور اسی قید میں چھوڑ جاؤ۔"

طالب علم حیرت سے سکوت میں مستغرق یہ داستان سنتا رہا۔ اُس نے اس سے پہلے بھی الحمرا کے تہ خانوں میں چھپے ہوئے طلسمی دفینوں کے افسانے سنے تھے لیکن انھیں ہمیشہ محض افسانہ سمجھ کر اُن پر یقین نہ کیا تھا۔ اُسے اب اُس مہر کی قیمت کا اندازہ ہوا جو اُسے سینٹ سیپرین سے انعام میں ملی تھی۔ گو وہ ایسے قوی اور مؤثر طلسم سے مسلح تھا لیکن اس طرح ایک طلسمی غار کے تہ خانے میں قید ہونا اور ایک ایسے طلسمی انسان سے باتیں کرنا جسے قوانین قدرت کے مطابق اب سے تین سو برس پہلے اپنی قبر میں دفن ہونا چاہیے تھا اُسے بڑا عجیب معلوم ہوا۔

اس طرح کا انسان زندگی کے عام انداز سے بالکل مختلف تھا لیکن اُسے محض مذاق یا افسانہ سمجھ کر نہیں ٹالا جا سکتا تھا، اس لئے اُس نے طلسمی سپاہی کو یقین دلایا کہ وہ اُس کی دوستی پر بھروسا کر سکتا ہے۔ وہ اُس کی رہائی کے لئے جو کچھ ہو سکے گا اُس سے دریغ نہ کرے گا۔

طالب علم کی زبان سے دوستی کی بشارت کے جواب میں سپاہی بولا "میں دوستی سے زیادہ کسی اور چیز کا

قائل ہوں۔"

وہ فولاد کے ایک بے حد وزنی صندوق کی طرف جس میں کئی قفل پڑے ہوئے تھے اور جس پر ہر طرف عربی کی عبارتیں کندہ تھیں، اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس صندوق میں بے شمار سونے کے سکّے، جواہرات اور بیش بہا زیورات بند ہیں۔ اگر تم اس طلسم کو توڑ دو جس میں میں قید ہوں تو اِس خزانے میں سے آدھا تمہارا ہوگا۔"

"لیکن میں اس طلسم کو کیسے توڑ سکتا ہوں؟"

"اس کام کے لئے ایک عیسائی پادری اور ایک عیسائی دوشیزہ کی مدد درکار ہے۔ عیسائی پادری طلسم کے الفاظ پڑھنے کے لئے اور دوشیزہ اس آہنی خزانے کو مُہر سلیمانی سے چھُونے کے لئے۔ اور یہ کام آج ہی رات کو کرنے کا ہے۔ اس کی سنجیدگی اور اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہ پاکیزہ صفت لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے۔ پادری کو صحیح قسم کا دین دار اور تقدس کا مجسمہ ہونا چاہیئے اور یہاں آنے سے پہلے ایک دن روزہ رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح دوشیزہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ اُس کی سیرت معصیت سے پاک ہو اور آسانی سے نفس پرستی کا شکار نہ ہو جائے۔ تمہیں ایسے دو آدمیوں کی مدد حاصل کرنی ہے۔ لیکن کام ایسا ہے کہ اس میں تاخیر کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ تین دن کی فرصت ہے۔ اگر تین دن کے اندر مجھے رہائی نہ ملی تو میری ایک صدی پھر اس قید خانے میں بسر ہوگی۔"

"گھبرائیے مت!" طالب علم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "ایسا پادری اور ایسی دوشیزہ میری نظر میں ہے۔ لیکن اپنی مُہم کی تکمیل کے بعد میں اس تہ خانے میں کیسے پہنچوں گا؟"

"مُہر سلیمانی تمہاری رہنمائی کرے گی۔ تہ خانے کا راستہ تمہارے لئے کھل جائے گا۔"

طالب علم تیزی سے تہ خانے سے نکلا۔ اُس کے باہر نکلتے ہی سنگین راستہ بند ہو گیا اور زمین پہلے کی طرح ہموار ہو گئی۔

اگلے دن علی الصبح وہ پادری کی حویلی پہنچ گیا۔ آج اس کے قدم جرأت و استقامت سے اُٹھ رہے تھے۔ آج وہ کوچہ گرد طالب علم کی حیثیت سے، پادری کے پاس نہیں جا رہا تھا جس کا مقسوم ستارہ بجانا اور دریوزہ گری کرنا تھا۔ آج وہ طلسمی دنیا کا سفیر بن کر اُس کے پاس آیا تھا اور اُس کے پاس زمین کے پُراسرار طلسمی خزانوں کی بشارت تھی۔ اس سفارت کی تفصیل داستان میں بالکل نہیں بتائی گئی ——— سوائے اس کے کہ ایک دیندار سپاہی کو بچانے

اور ایک بیش بہا خزانے کو شیطان کے قبضے سے نکالنے کے خیال نے پادری کو فوراً اس مہم کے لئے راضی کر دیا کہ دولت کتنے غریبوں کی غریبی دور کرنے، کتنے کلیسا تعمیر کرنے اور کتنے دوستوں اور عزیزوں کو متموّل بنانے کے کام آئے گی!

رہی نیک دل اور معصوم خادمہ تو وہ بھی خوشی سے اس مقدّس مہم میں شریک ہونے پر راضی ہو گئی ——— اور اگر کبھی کبھی اٹھ جانے والی نظر پر اعتبار کیا جا سکے تو یہ کہنا بھی درست ہے کہ طلسمی دنیا کے سفیر کے لئے شرمیلی آنکھوں میں اب تھوڑی سی جگہ بھی پیدا ہو گئی تھی۔

لیکن وہ روزہ جو پادری کو اس مہم کے سلسلے میں رکھنا تھا اس کے لئے بڑا عذاب ثابت ہوا۔ دو بار اس نے روزہ شروع کیا اور دونوں بار جسم کی ضرورتیں روح کے تقاضوں پر غالب آئیں۔ تیسرے دن بڑی مشکل سے اس نے اپنے اوپر یہ جبر گوارا کیا، لیکن سوال یہ تھا کہ طلسم ٹوٹنے تک اس جبر کی سختی برداشت ہو سکے گی یا نہیں!

رات کا خاصا حصّہ گزر جانے پر یہ قافلہ لالٹین کی روشنی میں بھٹکتا اور ٹھوکریں کھاتا ٹاور کے اوپر چڑھتا نظر آیا۔ خادمہ کے ہاتھ میں کھانے پینے کے سامان کی ایک ٹوکری تھی کہ جب ایک شیطان سمندر کی گہرائیوں میں غرق ہو چکے تو دیوِ اشتہا کی تواضع کی جا سکے۔

مہرِ سلیمانی کی تاثیر نے انھیں برج کے تہ خانے میں داخل کر دیا۔ طلسمی سپاہی آہنی صندوق پر ان کا منتظر بیٹھا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق طلسم توڑنے کے سب رسمی مرحلے طے کئے گئے اور آخر دوشیزہ نے مہرِ سلیمانی آہنی قفلوں سے لگا دی۔ مہر لگتے ہی صندوق کا ڈھکن ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور سونے کے سکوں، بیش بہا ہیروں اور نایاب جواہرات کی آب و تاب نے سب کی نظریں خیرہ کر دیں۔

"یہ ہے معاملے کی بات!" طالبِ علم خوشی سے چلّا اٹھا اور جلدی جلدی اپنی جیبیں بھرنے لگا۔

"جلدی اور گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں" سپاہی نے نرمی سے کہا "چلو! پہلے صندوق کو باہر نکال لیں اور پھر اس کے حصّے بخرے کریں!"

اس مشورے پر سب آگے بڑھے۔ لیکن کام آسان نہ تھا۔ صندوق بے حد وزنی تھا اور صدیوں سے اس جگہ رکھا تھا۔ سب تو صندوق کو باہر نکالنے میں مصروف تھے اور نیک دل پادری ایک کونے میں بیٹھا دونوں ہاتھوں سے کھانے

کی ٹوکری پر حملہ کر رہا تھا کہ کسی طرح دیوِ اشتہا کو تسکین دے جس نے اُس کی انتڑیوں میں آگ لگا رکھی تھی۔ آن کی آن میں ایک فربہ بھنا ہُوا مرغا اور ہسپانوی شراب کا ایک شیشہ آنتوں میں اُتر گیا اور دیوِ اشتہا تسکین پا چکا تو پادری نے اظہارِ تشکّر کے طور پر معصوم دوشیزہ کے رخساروں پر ایک شفقت آمیز بوسہ کی مُہر ثبت کر دی۔ یہ سب کچھ تہ خانے کے ایک گوشے میں بڑی خاموشی سے ہُوا تھا لیکن کان اور زبان رکھنے والی دیواروں نے جیسے بڑی فتح مندی کے ساتھ اس کا پُرزور اعلان کر دیا۔ اور ایک معصوم بوسے نے جو طوفان آج اُٹھایا وہ شاید آج سے پہلے کبھی نہیں اُٹھایا ہو گا۔ بوسے کی آواز پر سپاہی مایوسی سے چلّا اُٹھا۔ صندوق، جسے آدھا اُٹھایا جا چکا تھا ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر گرا اور پھر مقفّل ہو گیا۔ پادری، خادمہ اور طالب علم تینوں نے اپنے آپ کو غار سے باہر کھڑا پایا اور اُس کی دیوار بادل کی گرج کے ساتھ بند ہو گئی۔ افسوس! نیک دل پادری نے اپنا روزہ وقت سے ذرا پہلے کھول لیا تھا۔

خوف و حیرت کا غلبہ کم ہُوا تو طالب علم نے پھر بُرج کے تہ خانے میں گھسنے کا ارادہ کیا، لیکن حیف! معصوم خادمہ جلدی میں مُہرِ سلیمانی تہ خانے کے اندر ہی چھوڑ آئی تھی۔

مختصر یہ کہ گرجا کے جرس نے بارہ بجائے اور طلسم کا اثر پھر شروع ہو گیا۔ ابھی بے چارے سپاہی کی قسمت میں ایک صدی کی قید اور لکھی تھی ——— ایک صدی کی یا اس کے بعد آنے والی کئی صدیوں کی۔ وہ شاید آج بھی اُسی تہ خانے میں قید ہو ——— محض اس لئے کہ نیک دل پادری نے حسین خادمہ کے رخساروں کا ایک معصوم بوسہ لیا تھا۔ "افسوس! شفیق بزرگ، افسوس!" واپس آتے ہوئے طالب علم نے پادری کو مخاطب کر کے کہا۔ اور سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "شاید اُس بوسے میں رُوح کم تھی اور نفس زیادہ۔"

طلسمی سپاہی کی داستان کا جتنا حصّہ مُستند سمجھا جاتا ہے وہ اِس جگہ آ کر ختم ہو جاتا ہے لیکن روایت نے اس میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ طالب علم اپنی جیبوں میں اتنے سکّے اور جواہرات بھر لایا تھا کہ اُس کی باقی زندگی آسائش اور آسودگی سے گزری اور نیک نفس پادری نے اُس غلطی کی تلافی کے لئے جو اُس سے تہ خانے میں سرزد ہوئی تھی اپنی حسین خادمہ کی شادی اُس کے ساتھ کر دی۔ حسین خادمہ جتنی اچھی خادمہ تھی اُس سے بھی اچھی بیوی ثابت ہوئی اور اپنے شوہر کے گھر کو اولاد کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ پہلی اولاد ایک لڑکا تھا اور اس لحاظ سے حیرت انگیز تھا کہ گو ست ماہا تھا لیکن سب بچّوں میں فربہ اور تندرست تھا۔

طلسمی سپاہی کی داستان غرناطہ کی داستانوں میں سب سے زیادہ دلچسپی سے بیان کی جاتی ہے، گو اس کی تفصیلات میں جا بجا اختلاف ہیں۔ لیکن ایک بات جس پر عوام پوری طرح متفق ہیں یہ ہے کہ سینٹ جان کے تیوہار کے دن وہ اب بھی حدرۃ کے پُل پر سنگین انار کے قریب کھڑا ہو کر سنتری کی خدمت انجام دیتا ہے —— گو سوائے اُن معدودے چند خوش نصیب لوگوں کے جن کے پاس خاتم سلیمانی ہو، کسی کو نظر نہیں آتا۔

---

# الحمرا کا گلاب

غرناطہ عرب بادشاہوں کے قبضے سے نکل کر عیسائی حکمرانوں کے ہاتھ میں آگیا تو مدتوں تک انھوں نے اس دلفریب شہر کو اپنا مسکن رکھا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب زلزلوں کے پیہم صدمات نے یہاں کے شاندار محلوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ شاہی زمانے کے برج و مینار سربسجود نظر آنے لگے۔ اور عیسائی حاکموں نے خوفزدہ ہو کر ان شاہی مسکنوں کو خیرباد کہہ دیا۔

اس کے بعد سالہا سال غرناطہ کی خاک کسی شاہی مہمان کے قدم سے محروم رہی۔ شاہی ایوانوں پر خاموشی اور ویرانی مسلط رہی۔ اور اس خاموشی و ویرانی میں الحمرا کا قصر ایک مہجور حسینہ کی طرح اپنے بے برگ و گیاہ گلستانوں میں گھرا، سوگ کے دن گزارتا رہا۔ برج الامیرات جو کسی زمانے میں تین حسین شہزادیوں کا مسکن تھا، اس عام بربادی و ویرانی اور غفلت کا شکار رہا۔ اس کے طلائی محرابوں پر مکڑیوں نے جالے تن لئے اور جو ایوان کبھی زاہدہ، زبیدہ اور سربتہ کی جلوہ گاہِ ناز تھے ان پر چمگادڑوں اور الوؤں کا قبضہ ہو گیا۔ اس حسین برج کی بربادی اور اس کی طرف سے لوگوں کی غفلت شعاری کا ایک سبب کسی حد تک وہ اوہام بھی تھے جن میں غرناطہ

کے رہنے والے مبتلا تھے ۔ عام طور پر مشہور تھا کہ نوجوان سرینہ کی روح اب بھی اُن ایوانوں میں منڈلاتی پھرتی ہے جنہوں نے اُسے موت کی آغوش میں سلایا تھا ۔ اب بھی چاندنی راتوں میں سرینہ انھیں مرمریں فوارے کے قریب بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی اور اب بھی راتوں کو وادی میں سے گزرنے والے مسافروں کو اُس کے نقرئی بربط کے نغمے سُنائی دیتے تھے ۔

لیکن ایک دن ایسا آیا کہ غرناطہ کی ویرانیوں میں پھر بہار آئی ۔ فلپ پنجم نے کچھ عرصے کے لئے الحمرا کو اپنے قیام کا شرف بخشا ۔ اس نامور شہنشاہ اور اُس کی حسین ملکہ ازابیلا کے خیر مقدم کے لئے الحمرا کو ایک بار پھر سنوارا اور سجایا گیا ۔ ویران اور سنسان قصر میں ایک بار پھر ہر طرف آوازیں گونجنے لگیں ۔ طبل و قرنا کے شور اور گھوڑوں کی آمد و رفت سے روشوں اور میدانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی ۔ بُرجوں اور فصیلوں پر اسلحوں کی چمک دمک اور پرچموں اور پھریروں کی پھڑک نے ایک بار پھر قصر کے شاہانہ ماضی کی یاد تازہ کردی ۔

قصر کے بیرونی حصّوں میں شاہانہ عظمت و شکوہ کا یہ جلوہ تھا ۔ لیکن قصر کے اندرونی گوشوں میں ایک خاص طرح کی نزاکت و نفاست اور نرمی تھی ۔ وہاں کے ایوانوں اور شہ نشینوں میں خلعتوں کی پُرسحر سرسراہٹ اور مہذّب و مؤدّب درباریوں کی دھیمی دھیمی سرگوشیاں تھیں ، باغوں کی روشوں اور کنجوں میں اِدھر سے اُدھر آنے جانے والی کنیزوں اور غلاموں کے قدموں کی چاپ تھی اور دریچوں میں سے چھُپ چھُپ کر نکلنے والے نغموں کی صدا کا طلسم و سحر ۔

اس شاہانہ جلوس کے ساتھ جن بے شمار لوگوں نے الحمرا کے قصر کو رونق بخشی اُن میں شہزادی کا مقرّب ایک غلام بھی تھا جس کا نام روئیس اد کرنی تھا ۔ اس غلام کی تعریف میں صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ شہزادی کا مقرّب خاص تھا اس لئے کہ پُرشکوہ ازابیلا کے غلاموں میں سے ہر ایک نفاست ، حُسن اور تہذیب کا مجسمہ تھا ۔ اد کرنی کی عمر ابھی مشکل سے اٹھارہ سال کی تھی ۔ شہزادی سے وہ بے حد ادب و احترام سے پیش آتا تھا لیکن حقیقت میں وہ شوخیوں اور شرارتوں کا پُتلا تھا ۔ محل کے نسائی حُسن و جمال نے اُس کی ساری معصومیت ختم کردی تھی اور اُسے اس کم سنی میں بھی عورتوں کی دُنیا کا غیر معمولی تجربہ تھا ۔

یہ آزاد منش غلام ایک دن جنت عریف کے کنجوں میں گل گشت کر رہا تھا ۔ دل بہلانے کے لئے وہ شہزادی کا ایک باز اپنے ساتھ لیتا آیا تھا ۔ ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نظر ایک چڑیا پر پڑی جو ایک جھاڑی میں سے نکل کر

اُوپر جا رہی تھی - غلام نے باز کو چڑیا کے پیچھے چھوڑ دیا - باز تیزی سے پرواز کرتا ہوا اُوپر چڑھ گیا اور بلندی سے اپنے شکار پر جھپٹا - لیکن اُس کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا اور وہ اسے چھوڑ کر اونچا اُڑتا چلا گیا - غلام نے اُسے واپس بلانے کے ہزار جتن کئے لیکن وہ نیچے نہ اُترا - غلام نظر سے اُس کا پیچھا کرتا رہا - اُس نے دیکھا کہ اُوپر جانے جانے باز نے نیچے اُترنا شروع کیا اور الحمرا کی بیرونی فصیل سے دُور ایک ایسے بُرج پر جا بیٹھا جو قصر الحمرا اور جنّت عریف کو ایک دوسرے سے الگ کرتا تھا - حقیقت میں یہی بُرج تھا جسے لوگ "برج الامیرات" کہتے تھے -

غلام وادی میں سے گزر کر اس بُرج کے قریب پہنچ گیا - لیکن اُسے بُرج میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا - اور اُس کی بلندی اُس کے لئے قطعی ہمّت شکن تھی - اس لئے ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ بُرج کے اُس رُخ کی طرف پہنچ گیا جو قصر کی دیواروں کی طرف تھا -

بُرج کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جو سرکنڈے اور حنا کے ایک جنگلے سے گھرا ہوا تھا - پھولوں کی کیاریوں اور گلاب کی جھاڑیوں میں ہوتا ہوا، غلام بُرج کے دروازے تک جا پہنچا - دروازہ بند اور مقفل تھا - دروازے میں ایک باریک سی جھری تھی جس میں سے بُرج کے اندر کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی تھی - جھری میں سے اُسے ایک کشادہ دالان نظر آیا، جو نازک مرمریں ستونوں کے سہارے قائم تھا - دالان میں سنگِ سیاہ کا ایک فوّارہ تھا، جس کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں - دالان کے وسط میں ایک سونے کا پنجرہ ٹنگا ہوا تھا جس میں ایک گانے والی چڑیا بند تھی - پنجرے کے عین نیچے ایک چوکی پر ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک بلّی بیٹھی تھی - بلّی کے پاس زچہ خانہ کا پورا سامان رکھا ہوا تھا اور فوّارے کے سہارے ایک ستار رکھا تھا جسے رنگین فیتوں سے سجایا گیا تھا -

اِس دُور افتادہ اور بظاہر ویران بُرج میں نسوانی ذوق کی یہ نازک اور نفیس چیزیں دیکھ کر وہ بس لالا کر کوئی متحیّر رہ گیا - ان چیزوں کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں وہ پُر اسرار داستانیں گردش کرنے لگیں جو وہ الحمرا کے متعلق لوگوں سے سُنا کرتا تھا - وہ سوچنے لگا کہ ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی یہ بلّی کہیں کوئی شہزادی تو نہیں -

اُس نے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک دی - بُرج کی بالائی منزل کے ایک دریچے میں سے ایک حسین چہرہ دکھائی دیا اور فوراً ہی نظر سے اوجھل ہو گیا - وہ کچھ دیر منتظر رہا کہ شاید کوئی دروازہ کھولنے آئے - لیکن کوئی نہ آیا

اندر بھی قدموں کی آہٹ نہ سنائی دی۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ وہ سوچنے لگا کہیں میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا؟ کہیں یہ حسین سایہ برج کی پری کا سایہ تو نہیں تھا؟ اُس نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا اور اس مرتبہ پہلے سے زیادہ زور سے کھٹکھٹایا۔ چند لمحوں کے بعد حسین چہرہ پھر دریچے میں چمکا۔ یہ حسین چہرہ شباب و رعنائی سے مخمور ایک پانزدہ سالہ دوشیزہ کا تھا۔

دوشیزہ کو دیکھتے ہی روڈیس نے اپنی پَر دار ٹوپی پر ہاتھ رکھا اور بڑے برج میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔

اُس کی مودبانہ التجا پر حسین دوشیزہ نے شرما کر جواب دیا" جناب! میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ میری چچی نے مجھے منع کر رکھا ہے۔"

" حسین خاتون! میں آپ سے پھر التجا کرتا ہوں — میں جس باز کی تلاش میں جا رہا ہوں وہ ملکہ الزبتھ کا چہیتا باز ہے، اور میری مجال نہیں کہ میں اُسے لئے بغیر محل میں داخل ہو سکوں۔"

" تو جناب! کیا آپ شاہی دربار کے سردار ہیں؟"

" ہاں! حسین خاتون! آپ کا خیال درست ہے۔ لیکن اگر مجھے یہ باز نہ ملا تو مجھ پر ملکہ کا عتاب نازل ہوگا اور مجھے شاہی دربار سے الگ کر دیا جائے گا۔"

" معصوم مریم کی قسم! اور میری چچی نے مجھے خاص طور سے ہدایت کی ہے کہ شاہی دربار کے سرداروں کیلئے برج کا دروازہ ہرگز نہ کھولوں۔"

" کی ہوگی! لیکن اُن کی یہ ہدایت بد اطوار سرداروں کے لئے ہوگی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہرگز ویسا نہیں ہوں۔ میں تو ایک سیدھا سادا بے ضرر سا غلام ہوں اور اگر آپ نے میری یہ معمولی سی درخواست رد کر دی تو بالکل تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔"

غلام کی پریشانی دیکھ کر دوشیزہ پسیجی۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگی کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرے اس معمولی سے انکار سے اُس پر تباہی آجائے اور پھر یہ نوجوان یقیناً اُن خطرناک سرداروں جیسا نہیں جنھیں چچی جان شیطان کی نسل بتاتی ہیں، اور جو ہر وقت معصوم دوشیزاؤں کو اپنے فریب کے جال میں پھنسانے کی فکر

میں لگے رہتے ہیں۔ یہ نوجوان تو سیدھا اور بھولا بھالا ہے، اور مجھ سے بڑے ادب سے التجا کر رہا ہے اور پھر دیکھنے میں حسین بھی ہے۔

عیار نوجوان کو دوشیزہ کے سینے میں اٹھتے ہوئے ہلکے سے طوفان کا پتہ چل گیا اور اس نے اپنی التجاؤں میں ایسی رقت پیدا کی کہ حسین دوشیزہ کے لئے انکار ممکن نہ رہا۔ برج کی وہ ننھی شرمیلی پاسبان نیچے اتری اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے برج کا دروازہ کھول دیا۔ نوجوان غلام جس روئے زیبا کی ایک ہلکی سی جھلک پر فریفتہ ہوا تھا، اس کے قدِ رعنا کے نظارے نے اسے دیوانہ بنا دیا۔

دوشیزہ کی اندلسی کرتی اور چست فراک نے اس کے جسم کے تناسب کو نمایاں کر دیا تھا اور ایک ہی نظر میں یہ معلوم کر لینا مشکل نہ تھا کہ حسن شباب کی منزل میں قدم رکھنے والا ہے۔ اس کے بال چمک دار تھے اور مانگ میں کہکشاں کی سی راستی و ہمواری تھی۔ اس کے حسین جوڑے میں، اندلس کے عام دستور کے مطابق ایک تازہ و شگفتہ گلاب لگا ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے چمپئی رنگ میں سنہرے پن کی ہلکی سی جھلک تھی، لیکن اس سنہرے پن سے اس کے رخساروں کی شادابی زیادہ بڑھ گئی تھی، اور اس کی رسیلی آنکھوں کے نور میں زیادہ چمک پیدا ہو گئی تھی۔

روئیس کی عیار نظروں نے ایک ہی آن میں حسن کے مجسمے کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ لیکن وہاں ٹھہرنے کے بجائے اس نے منہ ہی منہ میں توصیف کے کچھ کلمات کہہ کر تیزی سے برج کی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا چند لمحوں میں وہ باز کو اپنے ہاتھ پر بٹھائے نیچے آ گیا۔ اتنی دیر میں دوشیزہ فوارے کے قریب بیٹھ کر ریشم لپیٹنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ لیکن جلدی اور گھبراہٹ میں ریشم کی چرخی فرش پر گر پڑی۔ غلام نے ایک جست لگائی، چرخی اٹھائی اور اپنے ایک گھٹنے کے بل جھک کر اسے بڑے ادب سے دوشیزہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دوشیزہ نے چرخی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنے لب دستِ نازک پر رکھ کر بڑے جوش اور اعتقاد سے اسے چوم لیا۔

گھبراہٹ اور پریشانی سے دوشیزہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ سلام و پیام کے اس انداز سے قطعی ناآشنا تھی۔ اس نے چلا کر کہا "جناب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

منکسر مزاج غلام مجسم معذرت بن گیا اور دوشیزہ کو یقین دلایا کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ احترام و عقیدت کے اظہار کا درباری طریقہ ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

دوشیزہ کا غصّہ، اگر واقعی اُسے غصّہ کہا جا سکے، فوراً دُور ہو گیا۔ لیکن اُس کی اُلجھن اور پریشانی کم نہ ہوئی۔ اُس کے شرمیلے چہرے کی سُرخی برابر بڑھتی رہی۔ نظریں نیچی کئے وہ ریشم کو سلجھانے کے بجائے اُسے اُلجھاتی رہی۔

عیّار غلام کو حریف کی صفوں کے انتشار کا پتہ چل گیا۔ وہ یقیناً اس انتشار سے پُورا فائدہ اُٹھاتا، لیکن دل میں پیدا ہونے والی شاعری اُس کے لبوں تک نہ آ سکی۔ اظہارِ محبّت کے سارے حربے اُسے اوچھے اور بے اثر معلوم ہونے لگے۔ اور میدانِ عاشقی کا وہ جاں باز جو دربار اور محل کی حد درجہ تجربہ کار اور عشوہ ساز خاتونوں سے بازی لے جاتا تھا، پندرہ سال کی ایک سادہ و معصوم دوشیزہ کے سامنے بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ وہ مرعوب تھا۔ وہ شرما رہا تھا کتنی حیرت کی بات تھی۔

سادہ دل اور معصوم دوشیزہ کی سادگی و معصومیت اُن آہنی سلاخوں اور مُقفّل دروازوں سے زیادہ اُس کی محافظ و نگہبان تھی جن میں اُس کی دُور اندیش چچی نے اُسے قید کر رکھا تھا۔ لیکن دل جب پہلے پہل محبت کی سرگوشی سُن لے تو کوئی بڑے سے بڑا نگہبان بھی اُس کا محافظ نہیں بن سکتا۔ سادہ و معصوم دوشیزہ کے نادان و بے خبر دل نے نہ جانے کیسے وہ ساری باتیں سُن لیں جو غلام کے دل سے اُس کے لبوں تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ اور اُس کا طائرِ دل، پہلی مرتبہ اپنے قدموں میں ایک عاشق کو، ایسے حسین عاشق کو دیکھ کر، سینے کے قفس میں پھڑپھڑا اُٹھا۔

غلام پر اب تک جو بے خودی طاری تھی وہ رفتہ رفتہ دُور ہو رہی تھی اور آہستہ آہستہ اُس کا سویا ہُوا اعتماد بیدار ہو رہا تھا کہ دُور سے آنے والی ایک کرخت آواز نے اُسے چونکا دیا۔

دوشیزہ نے گھبرا کر کہا "میری چچی آ گئیں۔ جناب! خدا کے لئے آپ چلے جائیے"۔

"صرف اس شرط پر کہ جوڑے میں لگا ہُوا گلاب مجھے نشانی کے طور پر مل جائے"۔

دوشیزہ نے تیزی سے گلاب اپنے جوڑے میں سے نکالا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کے ہاتھ پر رکھ کر چلائی "یہ لیجئے اور خدا کے لئے فوراً چلے جائیے"۔

نوجوان نے گلاب لے لیا اور گلاب دینے والے حسین ہاتھ پر بوسوں کی بارش کر دی۔ گلاب اپنی ٹوپی میں لگایا، باز کو اپنی مُٹھی پر بٹھایا اور ایک جست میں جھاڑیوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ لیکن جاتے ہوئے وہ دوشیزہ کا دل اپنے ساتھ لیتا گیا۔

چچی کی تیز نظروں نے آتے ہی بھتیجی کے چہرے پر بکھری ہوئی حیرانی اور دالان کی فضا میں پھیلی ہوئی پریشانی کو دیکھ لیا۔ لیکن بھتیجی کے اس جواب نے سارے شبہے دُور کر دیئے "ایک باز ایک چڑیا کا پیچھا کرتا ہوا یہاں گھس آیا تھا"

"اللہ رحم کرے! بھلا کبھی کسی نے سُنا ہے کہ باز گھروں کے اندر گھستے پھریں۔ کیسا زمانہ ہے۔ بھلا ایسی حالت میں پنجرے کی چڑیاں بھی کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں!"

دُور اندیش و دُور بین فریدہ چند لمسے زیادہ دبھی بڑھیا تھا یہ ہی وتیا میں کوئی ہو۔ اُس کے دل میں "جنسِ غیر" کی طرف سے حد درجہ کا خوف اور بے اعتمادی تھی اور ایک طویل مدت کی راہبانہ زندگی نے رفتہ رفتہ اس میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ خوف اور بے اعتمادی کا سبب یہ ہرگز نہیں تھا کہ اُسے اِس "جنسِ غیر" کے ہاتھوں کوئی تکلیف پہنچی ہو، اس لئے کہ قدرت نے اُسے ایسا حسنِ ظاہر عطا کیا تھا کہ اس کی نگہبانی میں وہ ہر طرح کے بیرونی حملے سے محفوظ تھی۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جو خاتونیں خود اس طرح کے حملوں سے قطعی محفوظ ہوتی ہیں وہ اپنے زیادہ دلکش اور حسین ہمسایوں کی پاسبانی کا فرض اپنے ذمے لے لیتی ہیں۔

دُور اندیش چچی کی یہ حسین و معصوم بھتیجی ایک فوجی افسر کی بیٹی تھی جو میدانِ جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ اُس کی تعلیم ایک کانونٹ میں ہوئی تھی۔ اُسے حال ہی میں اُس مقدس پناہ گاہ سے چچی کے گھر منتقل کیا گیا تھا اور وہ اُس کے سایۂ عاطفت میں اسی طرح پرورش پا رہی تھی جیسے جھاڑیوں میں چھپی ہوئی گلاب کی کلی۔ یہ تشبیہہ محض اتفاقی نہیں اس لئے کہ حقیقت میں اس دوشیزہ کا تازہ اور اُبھرتا ہوا حسن، اس گوشۂ تنہائی میں بھی لوگوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہا تھا اور اندلس کے نظربازوں نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اُس کے حسنِ مجسّم کو "الحمرا کا گلاب" کا لقب دیا تھا۔

جب تک شاہ فلپ اور اُس کے درباری غرناطہ میں رہے دُور اندیش چچی نے اپنی حسین اور دلربا بھتیجی پر خوب گہری نظر رکھی اور اُسے اِس بات کی خوشی تھی کہ اُس کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس نیک دل خاتون کو جب کبھی چاندنی راتوں میں بُرج کے نیچے والے کنجوں میں سے ستار کی جھنکار اور محبت کے نغموں کی پکار سنائی دیتی تو وہ بے حد پریشان ہوتی لیکن اُس نے بھتیجی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ اِن آوازوں کی طرف دھیان نہ

وہ اس لئے کہ ستار کے نغمے اور محبت کے گیت پُرفن مردوں کے بنائے ہوئے ایسے فریب ہیں جو سادہ دل عورتوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس! نیک دل خاتون کو شاید اس کی خبر نہیں تھی کہ سادہ دل دوشیزاؤں کے لئے چاندنی راتوں کے گیت پند و وعظ سے کہیں زیادہ شیریں و دلکش ہوتے ہیں۔

شاہ فلپ تھوڑے دن غرناطہ میں رہ کر اپنے امیروں وزیروں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا۔ باخبر وجند لنے شاہی قافلے کو باب العدل سے نکلتے اور شاہراہ کے راستے شہر کی طرف جاتے دیکھا جب قافلے کا آخری پرچم بھی اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ خوش خوش بُرج کے اندر آئی کہ آج اُس کی پریشانیوں کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اُسے ایک بات دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ باغ کے دروازے کے قریب ایک شاندار عرب گھوڑا کھڑا تھا اور گلاب کی جھاڑیوں کی آڑ میں، زرتار خلعت میں ملبوس ایک نوجوان اُس کی بھتیجی کے قدموں میں جھکا ہوا تھا۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی نوجوان سردار نے اُس کی بھتیجی کو خدا حافظ کہا اور سرکنڈے اور حنا کے جنگلے پر جست لگاتا ہوا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور آن کی آن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

نازک دل دوشیزہ، شدتِ غم میں ہر بات بھول گئی اور چچی کے غصّے کی پروا کئے بغیر اُس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی "ہائے اللہ! وہ چلا گیا! وہ چلا گیا! وہ چلا گیا! اور اب میں اُس سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔"

"چلا گیا! —— کون چلا گیا؟ —— یہ کون نوجوان تھا جو تیرے قدموں میں جھکا ہوا تھا؟"

"چچی جان! وہ ملکہ الزبتھ کا ایک غلام تھا اور مجھے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"ملکہ کا غلام!" چچی نے چیخ کر اُس کے لفظ دُہرائے "اور ملکہ کے اس غلام سے تمھاری ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟"

"جس دن باز بُرج میں آیا تھا۔ وہ باز ملکہ کا تھا اور یہ نوجوان غلام اُسے پکڑنے یہاں آیا تھا۔"

"افسوس! نادان لڑکی! یاد رکھ کہ باز اتنے خطرناک ہرگز نہیں ہوتے جتنے یہ آوارہ گرد غلام۔ اور تم جیسی بھولی بھالی چڑیاں ہیں جو اُن کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں۔"

پہلے تو چچی کو اس بات پر بے حد غصّہ آیا کہ اُس کی احتیاط اور نگرانی کے باوجود اُس کی بھتیجی محبت

کا معصوم کھیل کھیلتی رہی ہے ۔ لیکن جب اُسے پتہ چلا کہ بظاہر "جنسِ غیر" کے مکر و فریب کی آگ میں گرنے کے باوجود بھتیجی کا دامن اُس کے شعلوں سے محفوظ رہا ہے تو اُس نے اپنے دل کو یہ سوچ کر تسکین دے لی کہ اُس کی یہ پاکدامنی نیکی کے اُن اُصولوں کا نتیجہ ہے جن سے چچی نے اُسے سرتاپا مسلح کر دیا تھا ۔

چچی اپنے احساسِ فخر کے زخم پر یہ مرہم رکھ کر سکون حاصل کر رہی تھی اور بھتیجی نوجوان عاشق کی زبان سے بارہا سُنے ہوئے وفاداری کے وعدوں کو ایک بیش بہا خزانے کی طرح اپنے سینے میں محفوظ رکھ کر مسرور و شادماں تھی۔ لیکن مرد کی بے قرار اور ہرجائی محبت کی حقیقت کیا ہے ؟ ایک بہتی ہوئی ندی جو تھوڑی دیر ساحل پر لگے ہوئے ہر پھول سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے اور پھول فراق کے غم میں آنسو بہاتے رہ جاتے ہیں۔

دن، ہفتے، مہینے گزرتے چلے گئے اور کسی نے غلام کی کوئی خبر نہ سُنی - انار پک گئے، انگوروں کی بیل گچھوں سے لد گئی، خزاں کی بارشوں کے طوفانوں نے پہاڑوں سے میدانوں کا رُخ کیا، سرانوادا کی پہاڑیوں نے برفانی فرغل اوڑھے، اور سرد ہواؤں کا شور الحمرا کے ایوان اور دالانوں میں گونجا ―― لیکن وہ نہ آیا۔ سردیاں رخصت ہوئیں اور حیات آفریں بہار، نغموں، پھولوں اور خوشبوؤں کے قافلے کے ساتھ ایک بار پھر لوٹ کر آئی - پہاڑوں کی سفید برف پگھلی اور نوادا کی بلند و بالا چمکتی ہوئی چوٹیوں کے سوا اُس کا نام و نشان نہ رہا۔ پھر بھی کسی نے اُس بھولنے والے کی کوئی خبر نہ سُنائی -

معصوم اور ننھی دوشیزہ کے چہرے پر زردی چھا گئی - وہ ہر وقت کسی خیال میں گم رہنے لگی - اُس نے اپنے پچھلے مشغلے ترک کر دیئے، پچھلی دلچسپیوں کی طرف سے منہ موڑ لیا - اُس کا ریشم اُلجھا پڑا رہا، اُس کے ستار کے تار ڈھیلے پڑ گئے، پھولوں کو اپنی توجہ سے شگفتہ رکھنے والا اور خوش نوا بلبل کے نغمے سُننے والا کوئی نہ رہا۔ لگاتار بہنے والے آنسوؤں نے اُس کی آنکھوں کی چمک مدھم کر دی - اگر فرقت زدہ دوشیزہ کے غم کی پرورش کے لئے کوئی گوشہ منتخب کیا جا سکتا تھا تو وہ الحمرا تھا، جہاں کے ذرّے ذرّے میں محبت کے نرم و شیریں تصوّرات کو بیدار رکھنے کی خاصیت ہے - الحمرا محبت کرنے والوں کی بہشت ہے - اس بہشت میں تنہا رہنا کتنا بڑا ستم ہے ―― محبوب سے دور اور اُس کے وصال سے مایوس:

نیک دل چچی اُسے اس حال میں دیکھ کر اُس سے کہتی "ناداں بچی! کیا میں نے تجھے مردوں کے مکر و فریب سے

آگاہ نہیں کر دیا تھا؟ تجھے —— جو یتیم ہے اور غریبوں کے ایک بدحال گھرانے کی بیٹی ہے —— امیری کی گود میں پلے ہوئے کسی نوجوان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ میری بچی! اچھی طرح سمجھ لے کہ اگر تیرا نوجوان عاشق سچا بھی ہوتا تو اُس کا باپ، جو شاہی دربار کا ایک بڑا مغرور امیر ہے، کبھی یہ بات گوارا نہ کرتا کہ اُس کی بیٹا ایسی کم حیثیت اور نادار لڑکی کو اپنی بیوی بنائے جیسی کہ تو ہے۔ اس لئے میری بچی! ہمّت سے کام لے اور نادانی کے یہ خیال اپنے دل سے دُور کر۔"

چچی کی نصیحتیں بھتیجی کے غم کو اور بھی بڑھاتیں اور وہ تنہائی میں پہلے سے بھی زیادہ آنسو بہاتی۔ گرمی کی ایک رات کا ذکر ہے، جب چچی کو نیند آگئی اور بھتیجی برج کے دالان میں تنہا رہ گئی تو وہ فوارے کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ یہی جگہ تھی جہاں بے وفا غلام نے پہلی مرتبہ اُس کے قدموں میں گر کر اُس کے ہاتھ کو چوما تھا۔ یہی جگہ تھی جہاں اُس نے بار بار وفاداری کی قسمیں کھائی تھیں۔ ننھی اور معصوم دوشیزہ کا دل محبت کی غمگین یادوں سے اُبل رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ایک ایک کر کے فوارے کے پانی میں ٹپکنے لگے۔ آنسو کے قطروں سے شفاف پانی میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھنے لگیں —— لہریں بُلبلے بنیں، بُلبلے بھنور بن گئے اور اُبلتے ہوئے پانی کی تہ میں سے ایک نسوانی مجسمہ اُبھرنا شروع ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے بیش بہا عربی ملبوسات سے مزیّن ایک پری جمال عورت سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

دوشیزہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگی اور پھر وہاں لوٹنے کی ہمّت نہ کی۔ صبح کو اُس نے یہ ساری بات اپنی چچی کو سنائی لیکن چچی نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ سب کچھ محض اُس کی پریشاں خیالی کا نتیجہ ہے یا شاید اُس نے رات کو کوئی خواب دیکھا ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہی ہے۔ اُس نے اپنی بھتیجی سے کہا "بیٹی! تمہارے دماغ میں شاید تین عرب شہزادیوں کی داستان چکّر لگا رہی تھی، وہی تمہیں خواب میں نظر آئی۔"

"چچی جان! کون سی داستان؟ میں نے وہ کبھی نہیں سُنی۔"

"نہیں بیٹی! تم نے زاہدہ، زبیدہ اور سربتہ کے نام ضرور سُنے ہوں گے۔ ان تین عرب شہزادیوں کے باپ نے یہ برج انھیں کے لئے بنوایا تھا۔ یہیں اُنھیں تین عیسائی سرداروں سے محبت ہوئی۔ ان میں سے دو اپنے محبوبوں کے ساتھ اُن کے ملک کو چلی گئیں لیکن تیسری شہزادی کسی طرح اپنے آپ کو جانے پر آمادہ نہ کر سکی اور فراق کے دِن

بسر کر کے اسی برج میں اُس کا انتقال ہوا۔"

"جی ہاں! مجھے یاد آیا۔ میں نے یہ کہانی سُنی ہے، اور اِس بدنصیب شہزادی کے حال پر بارہا روئی بھی ہوں۔"

"تمہارا شہزادی کی قسمت پر رونا ٹھیک ہی ہے اس لئے کہ اُس بدنصیب شہزادی کا عاشق تمہارے عاشق کے خاندان کا ایک بزرگ تھا۔ اُسے بھی بہت دن تک اُس کی عرب محبوبہ کی محبّت ستاتی رہی لیکن وقت نے آخر اُس کے زخم پر مرہم رکھ دیا۔ اُس نے ایک ہسپانوی خاتون سے شادی کر لی اور تم اُسی کی اولاد ہو۔"

دوشیزہ چچی کی باتوں پر جھنجھلا اُٹھی اور اپنے دل میں سوچنے لگی "جو کچھ میں نے کہا ہے وہ وہم ہرگز نہیں مجھے اپنی بات پر پورا یقین ہے۔ جس حسین شہزادی کو میں نے دیکھا ہے اگر وہ بدنصیب سر بیتر کی رُوح ہے تو مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں آج رات کو پھر فوارے کے پاس جاکر بیٹھوں گی۔ ممکن ہے کہ شہزادی مجھے آج بھی نظر آجائے۔"

آدھی رات کے قریب جب ہر طرف سناٹا چھا گیا وہ فوارے کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔ جب الحمرا کے گھنٹہ گھر میں بارہ بجے تو فوارے کے پانی میں پھر کل کی طرح بُلبلے اُٹھے اور بھنور کے بیچ میں سے حسین عرب شہزادی اُبھر کر اُوپر آگئی۔ شہزادی جوان تھی، حسین تھی اور اُس کا جسم بیش بہا ملبوسات و زیورات سے آراستہ تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک نقرئی بربط تھا۔

وہ اس حسین مجسّمے کو دیکھ کر کانپی اور بے ہوش ہو گئی۔ لیکن شہزادی کی نرم اور شیریں آواز نے اُسے ہوشیار کیا اور اُس کا زرد، اُداس اور پیارا چہرہ دیکھ کر اُس کا سارا خوف جاتا رہا۔

شہزادی کی رُوح نے اُسے مخاطب کیا "اے انسان کی بیٹی! تمہیں کیا دُکھ ہے؟ تم اپنے آنسوؤں سے میرے فوارے میں کیوں تلاطم پیدا کرتی ہو؟ اور کیوں اپنی سرد آہوں سے رات کے سکون اور خاموشی میں خلل ڈالتی ہو؟"

"شہزادی! میں روتی ہوں اس لئے کہ ایک مرد نے مجھ سے بے وفائی کی اور میں آہیں بھرتی ہوں کہ تنہا اور بے یار و مددگار ہوں۔"

"اے معصوم دوشیزہ گھبرا مت! شاید تیرے غموں کا خاتمہ ہو جائے۔ دیکھ! ایک عرب شہزادی تیرے سامنے

موجود ہے۔ اُسے بھی، تیری طرح، اُس کی محبت نے دُکھ دیا۔ ایک عیسائی سردار نے، جو تیرے ہی گھرانے کا ایک بزرگ تھا، میرے دل پر قبضہ کیا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے اپنے دلیس لے جاتا اور میں بھی اُسی کی طرح عیسائی ہو جاتی دل سے تو میں یوں بھی عیسائی تھی، لیکن مجھ میں ہمت کی کمی تھی اور میں آخر دم تک کوئی فیصلہ نہ کر سکی، یہاں تک کہ وقت نکل گیا۔ اِسی جرم کی سزا میں میں آج بُری رُوحوں کے قبضے میں ہوں اور اُس وقت تک اِس برج میں قید رہوں گی جب تک کوئی سچا عیسائی مجھے اِس طلسم سے رہائی نہ دلائے۔ کیا تم میری خاطر یہ کام کرو گی؟"

"ضرور کروں گی" دوشیزہ نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آگے بڑھو! اور ڈرو مت۔ اپنی انگلیاں حوض میں ڈالو اور مجھ پر اس طرح پانی چھڑکو جیسے کسی کو عیسائی بناتے وقت چھڑکتے ہیں۔ اس طرح یہ طلسم ٹوٹ جائے گا اور میری بے چین رُوح کو سکون حاصل ہو گا۔

دوشیزہ کانپتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی، اپنی انگلیاں فوارے کے پانی میں بھگوئیں اور اُسے شہزادی کی رُوح کے زرد چہرے پر چھڑک دیا۔

شہزادی کے چہرے پر احسان مندی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اپنا نقرئی بربط اپنی محسنہ کے پیروں میں ڈال دیا اور اپنے مرمریں بازوؤں کو اپنے سینے پر رکھ کر نظر سے اوجھل ہو گئی اور یوں محسوس ہوا جیسے فوارے کے پانی میں اوس کے قطروں کی بارش ہوتے ہوتے تھم گئی۔

دوشیزہ متحیر اور خوف زدہ فوارے کے پاس سے آئی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ لیکن اُس کی آنکھ ایک منٹ کو بھی نہ جھپکی۔ جب صبح کے وقت وہ اپنے بستر سے اُٹھی تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس نے ایک حسین خواب دیکھا ہے۔ لیکن جب دالان میں جا کر اُس نے دیکھا کہ نقرئی بربط فوارے کے پاس پڑا چمک رہا ہے، تو اُسے یقین ہو گیا کہ جسے وہ خواب سمجھ رہی ہے وہ حقیقت ہے۔

وہ دوڑی ہوئی اپنی چچی کے پاس گئی اور رات کی ساری رُوداد اُسے سنائی۔ فوارے کے قریب پڑے ہوئے بربط نے اُس کی تصدیق کی، اور جب اُس نے بربط کے تاروں کو چھیڑا تو اُس میں سے ایسے دل آویز نغمے پھوٹ پڑے کہ چچی کے بے حس سینے میں بھی تلاطم برپا ہو گیا۔ اُس کا یخ بستہ دل بھی نغموں کی گرمی سے پگھلنے لگا اور یہ تاثیر صرف ایسے ہی نغمے میں ہو سکتی ہے جس کی اصل ارضی نہیں سماوی ہو۔

بربط کی ساحرانہ تاثیر روز بروز زیادہ نمایاں ہوتی گئی ۔ برج کے قریب سے گزرنے والے راہگیر چلتے چلتے تھم جاتے اور دم بخود ہو کر نغموں کے سحر میں گم رہتے ۔ خوش نوا طائر آس پاس درختوں پر آ بیٹھتے اور اپنی خوش نوائی بھول کر خاموشی سے بربط کے نغمے سنتے رہتے ۔

بربط کے نغموں کی خبر آہستہ آہستہ عام ہوئی اور غرناطہ کے رہنے والے الحمرا کی چار دیواری کے گرد اکٹھے ہونے لگے کہ شاید امیرات کے برج سے باہر نکلنے والے آسمانی نغمے کبھی اُن کے کانوں میں بھی پڑ جائیں ۔

اور بالآخر یہ ہوا کہ ننھے بربط نواز کو اپنے گوشۂ تنہائی سے باہر نکلنا پڑا ۔ غرناطہ کے امیر اور بااثر رئیس اُس کی مہمانی کو اپنے لئے باعثِ شرف جانتے ۔ وہ شہر کے معززین کو دعوت دیتے کہ اُن کے قصروں اور حویلیوں میں آکر اُس کی بربط کے ساحرانہ نغموں سے لطف اندوز ہوں ۔ ننھی مطربہ جب کسی امیر یا رئیس کے گھر جاتی تو اُس کی چچی اُس کے ساتھ رہتی اور اُسے پرستاروں کے اُس ہجوم سے دُور رکھتی جو اُس کے نغموں پر دیوانہ وار سر دھنتا تھا ۔ اِن نغموں کی ساحرانہ تاثیر کا شہرہ دُور دُور پھیلا ۔ طلیطلہ ، اشبیلیہ ، قرطبہ سب ایک ایک کر کے اس طلسم کے اسیر ہوئے ۔ الحمرا کی بربط نواز حسینہ پورے اندلس کا واحد موضوعِ سخن بن گئی ۔ اور اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا ؟ —— اندلسی موسیقی کے دیوانے اور رومان پرست ، بربط کی تاثیر ساحرانہ اور بربط نواز محبت کے نشے سے مخمور !

اندلس کی پوری سرزمین تو نغمہ کے ساحرانہ طلسم میں مبتلا تھی لیکن اسپین کے دربار کا رنگ کچھ اور ہی تھا ۔ فلپ پنجم کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ بے چارہ بُری طرح وہم کے پھندے میں گرفتار تھا اور یہ وہم ہر آن ایک نئی صورت اختیار کرتا تھا ۔ کبھی ایسا ہوتا کہ طرح طرح کی بیماریوں کا وہم اُسے ہفتوں صاحبِ فراش رکھتا ۔ کبھی اُس کے دل میں یہ سودا سماتا کہ تخت و تاج سے کنارہ کش ہو جائے ۔ مختصر یہ کہ فلپ پر وہم کے یہ زہریلے دورے برابر پڑتے رہتے اور موسیقی کا تریاق اُن کا واحد علاج تھا ۔ اس لئے ملکہ الزبتھ کی کوشش ہوتی کہ اچھے سے اچھے مطرب و نغمہ نواز دربار سے وابستہ رکھے جائیں ۔

لیکن جن دنوں کا ذکر ہم کر رہے ہیں اُن دنوں یہ نامور بادشاہ وہم کے ایسے دورے میں مبتلا تھا جو پچھلے ہر دورے سے زیادہ شدید تھا اور دربار کے بڑے سے بڑے مطرب اور نغمہ نواز کا طلسم بے اثر ثابت ہوا تھا ۔ یہاں تک کہ

بادشاہ نے ایک طویل ذہنی علالت کے بعد اپنے آپ کو مُردہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

یہ صورتِ حال ملکہ اور درباریوں کے لئے بڑی سہولت کی ہوتی اگر فلپ اپنے آپ کو مُردہ سمجھ کر وہی طرزِ عمل اختیار کرتا جو مُردوں کے شایانِ شان ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ بادشاہ کو اِس بات پر اصرار تھا کہ اُس کے جسم کو تجہیز و تکفین کی سب منزلوں سے گزارا جائے۔ اس احمقانہ خواہش کی تعمیل نہیں ہوئی اور فلپ کو دفن نہیں کیا گیا تو وہ سختی سے لوگوں کو غفلت اور بے ادبی کا مجرم ٹھہرانے لگا۔ لیکن آخر کیا کیا جائے؟ درباریوں کی نظر میں بادشاہ کی عدول حکمی ناقابلِ معافی جرم تھا، لیکن اُس کے حکم کی تعمیل کر کے اُسے زندہ دفن کر دینا سر تا سر دیوانگی!

فلپ کی ملکہ اور اُس کے درباری اس ہولناک معمّے کا حل تلاش کرنے میں حیران و سرگرداں تھے کہ پورے اندلس کو دیوانہ بنانے والی اس مُطربہ کی خبر دربار تک پہنچی۔ ملکہ نے فوراً ہی شاہی قاصد بھیج کر اس طلسمی مطربہ کو دربار میں طلب کیا۔

چند دن بعد، جب ملکہ اپنی کنیزوں کے ساتھ قصرِ شاہی کے خیابانوں میں مصروف گل گشت تھی معروف مطربہ اُس کے حضور میں لائی گئی۔ ملکہ النزبتھ بڑی دیر تک اُس کم سن اور سادہ رنگ مطربہ کو حیرت سے دیکھتی رہی جس کے نغموں پر ایک دُنیا دیوانی ہو رہی تھی۔ مخصوص دیسی وضع کا خوبصورت اندلسی لباس اُس کے زیب تن تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں نقرئی بربط تھا۔ وہ اپنی معصوم نظریں جھکائے ملکہ کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن اُس کے حُسنِ سادہ میں ایک ایسی تازگی و شگفتگی تھی کہ اُس پر "الحمرا کا گلاب" کا لقب پوری طرح پھبتا تھا۔

آج بھی اس کی چچی اُس کے ساتھ تھی۔ وہ ملکہ کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ اُس کی شخصیت میں بجائے خود اتنی کشش تھی کہ ملکہ پہلی ہی نظر میں اُس کی گرویدہ ہو گئی تھی، لیکن جب اسے پتہ چلا کہ کمسن مطربہ ایک اچھے، گو غریب، گھرانے کی لڑکی ہے اور اُس کا باپ بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا، تو وہ اور بھی خوش ہوئی اور اُس نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا "اگر تمہارے نغموں میں ویسی ہی تاثیر ہے جیسی کہ مشہور ہے اور اس کی تاثیر سے بادشاہ کو وہم کے بھوت سے نجات مل گئی تو آئندہ سے تمہاری فکریں میری فکریں بن جائیں گی، اور عزت، شہرت اور دولت تمہارے قدم چومے گی"۔

ملکہ مطربہ کے نغمہ کی آزمائش کے لئے بے چین تھی اس لئے اُسے لے کر فوراً وہیں بادشاہ کے کمرے کی

طرف چلی۔ شرمیلی مطربہ آنکھیں نیچی کئے اُس کے پیچھے ہولی اور محافظوں اور درباریوں کے ہجوم میں سے گزر کر دونوں بادشاہ کے وسیع کمرے میں پہنچے۔ کمرے میں ہر طرف سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں بند تھیں کہ سورج کی روشنی اندر نہ آسکے۔ چاندی کے شمعدانوں میں زرد موم کی شمعیں روشن تھیں اور کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ اس دھیمی روشنی میں ماتمی لباسوں میں لپٹے ہوئے خادموں کے سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ درباریوں کے چہروں پر غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اُن کے بے آواز قدم اُنھیں اِدھر اُدھر لئے پھر رہے تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک تابوت پر شاہ فلپ کی زندہ لاش سینے پر ہاتھ رکھے، دفن ہونے کے انتظار میں پڑی تھی۔ اُس کی لمبی ناک کی پھنگی کے سوا ہر چیز "کفن" کے اندر چھپی ہوئی تھی۔

ملکہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے ایک اندھیرے کونے میں پڑی ہوئی تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مطربہ سے بیٹھنے اور بربط کے نغمے شروع کرنے کو کہا۔

اُس نے بربط کے تاروں پر پہلے تو کانپتی ہوئی اُنگلیاں پھیریں لیکن آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوا اور بربط کے تاروں میں سے ایسی نرم، شیریں اور فردوسی موسیقی نکلنی شروع ہوئی کہ سُننے والوں کو یقین ہو گیا کہ یہ موسیقی ارضی نہیں سماوی ہے۔ رہا بادشاہ! تو اُسے تو یقین ہی تھا کہ وہ رُوحوں کی دُنیا میں پہنچ چکا ہے اس لئے اُس نے ان نغموں کو حوروں کے نغمے اور آسمانوں کی موسیقی سمجھ کر سُنا۔ مطربہ نے نغموں کی لے بدلی اور ساز کی سُریلی جھنکار میں اپنی شیریں آواز بھی شامل کر دی۔ اُس نے ایک ایسا گیت گانا شروع کیا جس میں الحمرا کی دیرینہ عظمتوں اور رعب حکمرانوں کے پرشکوہ کارناموں کا ذکر کیا گیا تھا۔ گیت کے لفظوں میں گانے والے کی رُوح بھی گھُل گئی تھی، اس لئے کہ الحمرا کی یاد کے ساتھ اصل میں اُس کی محبت کی یاد وابستہ تھی۔ بادشاہ کے ماتمی ایوان میں نغمے نے زندگی کی لہر دوڑا دی۔ نغمہ بادشاہ کے محزون سینے میں جذب ہو گیا۔ اُس نے اپنی گردن اُٹھائی، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور اپنی سیج پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں —— اور بالآخر وہ ایک جست میں کمرے کے فرش پر آگیا اور فوراً تلوار اور ڈھال طلب کی۔

موسیقی کی فتح، یا طلسمی بربط کی فتح مُسلّم ہو گئی۔ غم کا بھیانک سایہ رخصت ہوا اور ایک مُردہ انسان کو نئی زندگی ملی۔ شاہی قیام گاہ کے دریچے کھول دیئے گئے۔ تاریک، محزون ایوان میں ہسپانوی دھُوپ کا شاندار نور

جگمگانے لگا۔ اور اچانک ایک سب نظریں حسین مغنیہ کی طرف اُٹھ گئیں —— بربط اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا، وہ خود ڈگمگا کر زمین پر آرہی تھی اور دوسرے لمحے اُس کا نازنین جسم ادلیس ارکونی کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں تھا۔

چند ہی دن بعد مسرور و شادماں جوڑے کی شادی بڑی دھوم دھام سے رچائی گئی اور "الحمرا کا گلاب" شاہی دربار کی زینت و مسرت بن گیا۔ "لیکن ذرا ٹھہرو —— اتنی تیزی اچھی نہیں" میرے کانوں میں قاری کی یہ آواز گونج رہی ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے" اس طوفانی رفتار سے کہانی کے انجام تک پہنچنا تو بڑا عجیب سا ہے۔ پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ عشق نے حسن کے سامنے اپنی اِس طویل سرد مہری کا کیا عذر پیش کیا؟"

جواب بڑا آسان ہے۔ وہی پرانا اور قابلِ قبول عذر کہ اُس کے مغرور اور ندامت پسند باپ نے کسی قیمت پر اُس کی بات نہیں مانی۔ اور پھر یہ کہ جب دو دل سچ مچ ایک دوسرے کے گرویدہ ہوں تو اُن میں بڑی آسانی سے صلح ہو جاتی ہے محبت پہلی ہی ملاقات میں سارے گلے شکوے بھلا دیتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مغرور، ندامت پسند بوڑھا باپ آخر اب شادی پر کیسے راضی ہو گیا؟

اس کا جواب بھی آسان ہے۔ ملکہ کی بس ایک دو باتیں ہی اُس کے سارے اصولوں اور ضابطوں کو مغلوب کرنے کے لئے کافی تھیں —— خاص کر اس صورت میں کہ اُس کی ہونے والی بہو بادشاہ اور ملکہ کی توجہ اور محبت اور شاہی انعام و اکرام کا مرکز بن چکی تھی۔ اور پھر یہ کہ اُس کے بربط میں ایک ایسی طلسمی تاثیر تھی کہ سنگین دلوں کو موم بنا لینا اور سر پھروں پر قابو پا لینا اُس کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اور طلسمی بربط کا انجام آخر کیا ہوا؟

اس بات کا جواب داستان کا سب سے عجیب و غریب حصہ ہے اور اس سے کہانی پر صداقت کی مُہر لگ جاتی ہے۔ بربط کچھ عرصے تک ارکونی کے خاندان کی ملکیت رہا۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ کسی نہ کسی طرح، اطالیہ کے ایک مشہور مغنی نے محض حسد کی بنا پر اسے غائب کر لیا اور اپنے ساتھ اٹلی لے گیا۔ اُس کے مرنے پر بربط ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آیا جو اُس کی طلسمی تاثیر سے قطعی ناواقف تھے۔ انھوں نے بربط کی چاندی تو پگھلالی اور اُس کے تار ایک پرانے رباب میں کس دیئے۔ رباب کے تاروں میں پہلی جیسی تو نہیں، لیکن تھوڑی بہت طلسمی خوبیاں اب بھی باقی ہیں۔

اور اب ایک بات آپ کے کان میں کہنے کی ہے لیکن دیکھئے یہ بات کسی اور سے نہ کہیئے گا —— یہ ساری دُنیا اب بھی اس رباب کی طلسمی تاثیر میں مبتلا ہے —— اب بھی محبت کا سودا ہر سر میں سمایا ہوا ہے۔

---

# سیاحت کے آخری لمحے

# الحمرا کے باشندے

میں نے یہ بات اکثر محسوس کی ہے کہ کسی مقام کو اپنے عروج کے دنوں میں جتنے پرشکوہ و شاندار مکین میسر آئے ہوں اُسے زوال کے دنوں میں اُتنے ہی کمتر اور حقیر مکینوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ شاہوں کے محل عموماً آخر کار فقیروں کا مسکن بنتے ہیں۔

الحمرا کا قصرِ شاہی بھی اس وقت زوال کے اِسی دَور سے گزر رہا ہے۔ جب کوئی برج منہدم ہوتا ہے تو کوئی نادار اور خستہ حال گھرانا ان منقش ایوانوں میں آ کر چمگادڑوں اور اُلوؤں کا ہمسایہ بن جاتا ہے اور قصر کے دریچوں اور روشندانوں پر پھٹے پرانے چیتھڑوں کے پرچم لہرانے لگتے ہیں۔

میں نے اُن عجیب و غریب ہستیوں کو جنھوں نے اس قدیم شاہانہ مسکن پر قبضہ جما رکھا ہے اکثر بڑی دلچسپی سے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے کہ شاید یہ منظر انسانی غرور کے ڈرامے کا مضحکہ خیز انجام ہے۔ اور منظر کے مضحکہ خیز تاثر کی تکمیل اُن کرداروں سے ہوتی ہے جو ان ایوانوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں میں سے ایک کا نام میریا انطونیہ سالونیا ہے، جس نے اپنے آپ کو اس اُجڑی ہوئی سلطنت کی بے تاج ملکہ بنا رکھا ہے۔

بہ پستہ قامت بڑھیا قد میں عام انسانوں سے اتنی چھوٹی ہے کہ بظاہر بالشتیوں اور پریوں کی سرزمین کی مکین معلوم ہوتی ہے اور عجب نہیں کہ اُس کا سلسلہ پریوں کے کسی گھرانے سے ملتا ہو اس لئے کہ اُس پاس کے لوگوں میں سے کسی کو اُس کی اصل نسل کا پتہ نہیں۔ الطونیہ ساودنیا قصر کے بیرونی زینے کے نیچے ایک کوٹھری میں رہتی ہے۔ وہ پتھر کے سرو چھتے کے نیچے بیٹھی صبح سے شام تک کچھ نہ کچھ سیتی اور کوئی نہ کوئی گیت گاتی رہتی ہے۔ سیتے ہوئے گاتے رہنا اور ہر راہگیر پر کوئی مزے دار فقرہ چُست کرنا ہی اُس کی زندگی کے مشاغل ہیں —— اس لئے کہ میریا الطونیہ جتنی زیادہ غریب ہے اُتنی ہی زیادہ خوش مزاج ہے۔ فطرت نے اُسے داستان گوئی کے فن کی اتنی مہارت عطا کی ہے کہ بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔ الف لیلہ کی مشہورِ عالم شہرزاد کے سوا شاید ہی اُس کا کوئی ہمسر ہو۔ تائی الطونیہ کی شبینہ مجلسوں میں مجھے کبھی کبھی اس کی داستان سرائی سے لطف لینے کا موقع ملا ہے۔

اس پُراسرار پستہ قد بڑھیا کے قبضے میں پریوں کی دُنیا کا کوئی نہ کوئی طلسم ضرور ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنی انتہائی پستہ قامتی، بدصورتی اور مفلسی کے باوجود اُسے ساڑھے پانچ شوہروں کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہُوا ہے۔ ساڑھے پانچ اس لئے کہ ایک نوجوان شادی کا وعدہ کر کے اُس کی تکمیل کرنے سے پہلے ہی اس دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

اس مٹتی ہوئی شاہی دُنیا میں اگر کوئی الطونیہ کا حریف ہے تو وہ ایک اُونچی ناک والا بوڑھا ہے جو ایک بوسیدہ فرغل، نوکیلا کسیج کا طرہ دار سُرخ ہیٹ پہنے اِدھر سے اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔ وہ جائز طور پر الحمرا کا فرزند ہے اور اس نے اپنی ساری زندگی، کبھی ایک منصب پر اور کبھی دوسرے پر، الحمرا کی دیواروں کے سائے میں بسر کی ہے۔ گو وہ چوہے سے بھی زیادہ فاقہ مست ہے لیکن اس فاقہ مستی اور مفلوک الحالی میں بھی اپنی عالی نسبی پر نازاں۔ وہ اپنا سلسلہ اُجیلار الشہیر سے ملاتا اور اپنے آپ کو قرطبہ کے فاتح الونسو اجیلار کے خاندان سے بتاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنا نام بھی الونسو اجیلار رکھ چھوڑا ہے۔ حالانکہ قصر کے بے فکروں نے اُسے اپنی طرف سے پادری سانتو کا لقب دے رکھا ہے —— اور مجھے قسمت کی ستم ظریفی پر ہنسی آتی ہے کہ اُس نے اندلسی شجاعت کے علمبردار الونسو اجیلار کے نام اور منصب کا محافظ اس دریوزہ گر کو بنایا جو قصر کے سربلند و مغرور سایہ میں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن قسمت کے کھیل شاید ہمیشہ سے ایسے ہی رہے ہیں۔ شاید ٹرائے

کے کھنڈروں میں اجامنون اور اُخیلو کے وارثوں نے بھی حیرانی و سرگرانی کے ایسے ہی دن بسر کیے ہوں گے۔

الحمرا کے باشندوں میں میرے باتونی مصاحب ماتیو اکیمین کے گھرانے والوں نے محض اپنی تعداد کی بنا پر مقام پیدا کر لیا ہے۔ ماتیو کا یہ دعوٰے کہ وہ فرزندِ الحمرا ہے سراسر بے بنیاد نہیں۔ اُس کا خاندان فتحِ الحمرا کے فوراً بعد سے یہاں آباد ہے اور اس کے افراد کو نسلاً بعد نسلٍ قدامت کے اس امتیاز کے ساتھ غریبی بھی ترکے میں ملتی رہی ہے۔ ماتیو کا باپ، الحمرا کے معروف تاریخی درزی کا فرزندِ ارجمند اور اس نادار گھرانے کا بزرگ ہے۔ اُس کی عمر اس وقت تقریباً ستر سال کی ہے اور اُس نے قصر کے آہنی پھاٹک کے عین اوپر اپنے رہنے کے لیے سرکنڈوں اور مٹی کی ایک تنگ سی جھونپڑی بنالی ہے۔ اس مختصر سی جھونپڑی کی کُل کائنات ایک پُرانا پلنگ، ایک معمولی سی میز، دو تین کرسیاں اور ایک لکڑی کی الماری ہے، جس میں اس تاریخی خاندان کا یہ بزرگ اپنے گنے چُنے کپڑوں کے علاوہ اپنے "خاندان کے تبرکات" محفوظ رکھتا ہے۔ تبرکات کا یہ سرمایہ اُن کاغذات پر مشتمل ہے جو مختلف نسلوں میں مقدمہ بازی کے سلسلے میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اور ان کاغذات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے ظاہری انکسار اور خوش مزاجی کے باوجود اس خاندان کے لوگ مقدمہ بازی کے شائق و دلدادہ رہے ہیں۔ یہ مقدمے ماتیو کے اسلاف اُن بدلگام پڑوسیوں پر دائر کرتے رہے تھے جنھوں نے اس خاندان کی شرافت و نجابت کو شُبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ اور سچ پوچھیے تو اس گھرانے کی عسرت و ناداری کا سبب بھی اُن کا یہی حد سے بڑھا ہوا خاندانی افتخار ہے۔ اس تنگ و تاریک کُٹیا کی سب سے بڑی دولت وہ ڈھال ہے جو اس کی ایک دیوار پہ آویزاں ہے۔ ڈھال پر اُن سب رئیسوں اور امیروں کے خاندانی اسلحوں کے نقش کندہ ہیں جن سے غریبوں کا یہ گھرانا اپنا ناتا جوڑتا ہے۔

رہا خود ماتیو، جس کی عُمر اس وقت کوئی ۴۵ سال کی ہے، تو اُس نے پوری کوشش سے خاندانی عسرت و ناداری کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ اُس کی بیوی اور اُس کے بے شمار بچے گاؤں کی ایک بوسیدہ و فرسودہ جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ وہ کیا کھا کر جیتے ہیں، اس کا علم صرف اُسے ہے جو سب داناؤں کا دانا ہے۔ یہ مسئلہ میرے لئے ہمیشہ معمہ رہا ہے۔ یہ بات البتہ ظاہر ہے کہ وہ سب زندہ ہیں اور اسی حال میں زندہ رہ کر بظاہر خوش اور مطمئن ہیں۔ میں نے ماتیو کی بیوی کو غرناطہ کی شاہراہ پر اکثر اس طرح مصروفِ خرام دیکھا ہے کہ ایک بچہ اُس کی گود میں ہے اور آدھے درجن سے کچھ زیادہ بچے اُس کے آگے پیچھے ہیں، اور اُس کی بڑی لڑکی، جو اب آہستہ آہستہ شباب کی

منزل میں قدم رکھ رہی ہے۔ اپنے گندھے ہوئے بالوں میں پھول لگائے اس بے غم طائفے کے ساتھ رقص کناں ہے۔

لوگوں کی دو قسمیں ہیں جن کے لئے زندگی ایک مسلسل تفریح و تماشا ہے ——— جو بہت غریب ہیں اور جو بہت امیر ہیں۔ ایک کے لئے یوں کہ انھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اور دوسرے کے لئے یوں کہ ان کے پاس کچھ کرنے کو نہیں۔ لیکن دنیا میں شاید کوئی طبقہ ایسا نہیں جو کچھ نہ کرنے اور کچھ نہ کرکے جینے کا فن اسپین کے غریب طبقے سے بہتر جانتا ہو۔ اس تن آسانی و سہل انگاری میں آدھا کام آب و ہوا کرتی ہے اور آدھا ان کی ازلی فطرت۔ ایک ہسپانوی کو گرمیوں میں سایہ دے دیجئے اور سردیوں میں دھوپ اور اس کے علاوہ تھوڑی سی روٹی، تھوڑی سی شراب، ایک پیاز، ایک پرانا فرغل اور ایک ستار اور اس کے بعد اسے اس سے غرض نہیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔ اس سے مفلسی و ناداری کی باتیں کیجئے تو وہ یہ باتیں بڑی بے نیازی سے سنے گا۔ مفلسی و ناداری بھی اسے اتنی ہی عزیز ہے جتنا اپنا پرانا فرغل۔ وہ صحیح معنوں میں حال مست ہے۔

اور "الحمرا کے فرزند" زندگی کے اس عملی فلسفے کے بہترین مظہر ہیں۔ جس طرح الحمرا کے مسلمان حکمران سمجھتے تھے کہ الحمرا ان کے لئے جنت ارضی ہے اسی طرح ان حال مست "فرزندان الحمرا" کو دیکھ کر بارہا میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ وہ اب بھی اس جنتِ ارضی میں رہتے ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے، ان کے کیسے خالی ہیں لیکن وہ مگن ہیں۔ وہ پورے ہفتے بیکار رہتے ہیں لیکن چھٹی کے دن جی کھول کر تفریح کرتے ہیں جیسے ہفتہ بھر کام کرتے کرتے شل ہو گئے ہوں۔ غرناطہ میں اور اس کے گرد و نواح میں کوئی تقریب ہو، کوئی میلا ٹھیلا ہو اس میں ان کی شرکت ضروری ہے۔ وہ تہواروں کو پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر الاؤ جلاتے ہیں، اور جب خرمن اکٹھے کرنے کا زمانہ آتا ہے تو فصل اور خرمن سے محروم رہ کر بھی چاندنی راتیں رقص و سرود میں گزار دیتے ہیں۔

الحمرا کے ساکنوں کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں یہاں کی ایک عجیب و غریب تفریح کا حال بیان کر دوں۔ میں نے ایک لمبے اور دبلے پتلے آدمی کو کئی بار الحمرا کے برجوں میں سے ایک برج کی چوٹی پر اس طرح پھرتے دیکھا تھا جیسے وہ مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے ہاتھ میں دو تین بنسیاں ہوتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ چھت پر کھڑا تاروں کا شکار کر رہا ہے۔ میں اس ہوائی مچھیرے کو دیکھتا اور اس کی حرکتوں کا راز میری سمجھ میں نہ آتا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دوسرے برجوں کی کھونٹوں پر بھی کئی بار اسی طرح کی بنسیاں الجھتی دیکھیں۔

لیکن بالآخر میرے رہنما نے میری پریشانی دُور کی۔

قصہ یوں ہے کہ الحمرا کی ویرانی نے اُس کے برجوں کو چڑیوں اور ابابیلوں کی تفریح گاہ بنا دیا ہے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں ہر وقت ان کے ارد گرد مصروفِ پرواز رہتی ہیں۔ ان چڑیوں اور ابابیلوں کا شکار کرنے کے لئے الحمرا کے فرزند اپنی بنسیوں میں کانٹے اور چارہ لگا کر چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں گویا اُن کی بے شغل و بے مصرف زندگی نے اُنھیں آسمان پر مچھلیوں کا شکار کھیلنے کا فن سکھا دیا ہے۔

---

# ایک دلچسپ مہم

الحمرا کی خانگی زندگی کا شاید سب سے دلچسپ واقعہ تائی انطونیہ کے بھتیجے مینول کا وہ سفر ہے جو اُس نے طب کی سند حاصل کرنے کے سلسلے میں کیا تھا۔ جیسا کہ میں اپنے ناظر کو ماتیو کی روایت کی بنا پر بتا چکا ہوں کہ انطونیہ کی بھانجی ڈولرس کے ساتھ اُس کی ہونے والی شادی اور اِن دونوں کی آئندہ قسمت کا انحصار بڑی حد تک مینول کی اِس سند کے حصول پر تھا۔ اور مینول اور ڈولرس دونوں بڑے شوق سے اس مبارک دن کے منتظر تھے۔

چنانچہ مینول کی روانگی کے کئی دن پہلے سے ننّھی ڈولرس نے بڑی تن دہی سے اُس کا رختِ سفر تیار کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے اُس کا سارا ضروری سامان بڑے اہتمام اور صفائی سے باندھنے کے علاوہ اپنے ہاتھ سے مخصوص اندلسی انداز کی ایک سفری صدری بھی تیار کی۔ روانگی کی صبح کو الحمرا کے پھاٹک پر ایک مضبوط خچّر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ مینول کو اسی خچّر پر اپنا سفر کرنا تھا۔ خچّر کا نگران چچا پپو نام کا ایک بوڑھا سپاہی تھا۔ یہ بوڑھا سپاہی بھی الحمرا کے عجائبات میں سے ایک تھا۔ گرم خطّوں میں مدّتوں کے قیام سے اُس

کے چہرے پر ایک خاص طرح کی سختی اور سیاہی آگئی تھی۔ اُس کی اُونچی ناک اور چھوٹی سی سیاہ آنکھ اُس کے چہرے کی دوسری اہم نشانیاں تھیں۔

میں نے اس بوڑھے سپاہی کو بارہا انتہائی دلچسپی کے ساتھ ایک موٹی سی پرانی کتاب پڑھتے دیکھا تھا، جس پر کپڑے کی جلد چڑھی ہوئی تھی۔ جب وہ یہ کتاب پڑھتا تو اُس کے دوسرے بوڑھے ہم پیشہ ساتھی اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے، کچھ پتھر کی فصیل پر اور کچھ گھاس پر۔ وہ رُک رُک کر اور لفظوں پر زور دے دے کر کتاب کا کوئی نہ کوئی حصّہ پڑھتا اور اُس کے ساتھی پوری توجہ سے اُسے سُنتے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے کبھی بوڑھا پولو رُک جاتا اور پڑھی ہوئی عبارت کی تشریح و توضیح کر کے آگے بڑھتا۔

اتفاق سے ایک دن مجھے اس کتاب پر نظر ڈالنے کا موقع مل گیا۔ اس عجیب کتاب کا مصنّف پادری بنٹو گرو نیمو فیجو تھا۔ ہسپانیہ کے سحر و طلسم، سلامنکا اور طلیطلہ کے پُر اسرار غار، سینٹ پیٹرک کا کفر و الحاد اور بعض دوسرے صوفیانہ مطالب اس کتاب کا موضوع تھے۔ کتاب کو ایک نظر دیکھنے کے بعد سے اس کے قاری میں میری دلچسپی بہت بڑھ گئی اور میں اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے لگا۔

اس خاص موقع پر یہ چیز میرے لئے بڑی دلچسپی کی تھی کہ پولو نے مینول کے خچّر کو کس سپاہیانہ مہارت سے سفر کے سامان سے آراستہ کیا تھا۔ اُس نے بڑے اہتمام سے اور خاصی دیر کی محنت کے بعد خچّر کی پیٹھ پر ایک وزنی کاٹھی جمائی جس کا اگلا اور پچھلا حصّہ خاصا اُبھرا ہوا تھا۔ کاٹھی کی رکابیں پھاوڑے کی طرح چوڑی چکلی تھیں اور انھیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ الحمرا کے قدیم اسلحہ خانے کی باقیات صالحات میں سے ہیں۔ کاٹھی کے درمیانی حصّے میں ایک نرم بال دار بھیڑ کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ کاٹھی کے پچھلے حصّے میں ڈولرس کے ہاتھوں کا بندھا ہوا ایک بنڈل آویزاں تھا اور ان سب چیزوں کے اوپر ایک چادر پھیلی ہوئی تھی جس سے بچھانے اور اوڑھنے، دونوں کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اس ساز و سامان کا سب سے اہم جزو دو خورجیاں تھیں جن میں کھانے پینے کا طرح طرح کا سامان بھرا ہوا تھا، اور اس کے ساتھ چمڑے کی ایک بوتل جس میں حسبِ ضرورت پانی یا شراب رکھی جا سکے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ایک زنبیل جو بوڑھے سپاہی نے اپنے کندھے میں لٹکا رکھی تھی۔ مختصر یہ کہ خچّر کو ہر طرح کے ضروری ساز و سامان سے اس طرح آراستہ کیا گیا تھا جیسے کوئی

عرب جانباز کسی بڑی مہم پر روانہ ہو رہا ہو۔ خچر پر سامان لد رہا تھا اور قلعے کے بہت سے بے فکرے جن میں بعض بوڑھے سپاہی بھی شامل تھے اس کے اردگرد اکٹھے ہو کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک کام میں ہاتھ بٹانے اور ایک نیا مشورہ دینے کی کوشش کرتا اور اس پر چچا پولو کو سخت طیش آتا۔

جب تیاری مکمل ہو گئی تو مینول گھر والوں سے رخصت ہوا جب وہ خچر پر بیٹھنے لگا تو پولو نے اس کی رکاب تھام لی اور اس کی کاٹھی کو ایک بار پھر جگہ پر جما دیا۔ اور بالآخر مینول کو فوجی انداز میں خیر باد کہا۔ مینول چل پڑا تو ڈولرس کی طرف مخاطب ہو کر بوڑھے پولو نے اس کے کان میں کہا "ڈولرس! اس صدری میں مینول کتنا شاندار لگ رہا ہے" ننھی ڈولرس اس فقرے پر مسکرا دی اور شرما کر گھر میں گھس گئی۔

مینول کو گئے کئی دن گذر گئے لیکن اس کا کوئی خط نہ آیا اور بے چاری ڈولرس کے دل میں طرح طرح کے شبہے پیدا ہونے لگے۔ کہیں راستے میں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟ کہیں وہ امتحان میں فیل تو نہیں ہو گیا؟ اسی دوران میں گھر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ڈولرس کی بے چینی بڑھ گئی اور اس نے اسے اپنے لئے ایک بڑا شگون سمجھا۔ اس کی پالتو بلی ایک رات گھر سے نکل کر الحمرا کی کھپریلوں والی چھت پر چڑھ گئی۔ رات کے اندھیرے میں طرح طرح کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ کسی کتے نے اس بلی پر گستاخانہ حملہ کر دیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی۔ کھپریل پر دیر تک نوچ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر دونوں غنیم الحمرا کی چھت سے لڑھکتے ہوئے خاصی بلندی سے کھڈ میں جا گرے۔ اس کے بعد بلی کا پتہ نہ چلا اور ننھی ڈولرس اس واقعہ کو آنے والے مصائب کا پیش خیمہ سمجھ کر افسردہ ہو گئی۔

لیکن دس دن کے بعد مینول ہنستا کھیلتا آ دھمکا۔ اسے حسب دلخواہ مارنے یا جلانے کی سند مل گئی تھی اور یہ سند ڈولرس کی فکروں کا خاتمہ ثابت ہوئی۔ اس شام کو تائی انطونیہ کے سب بڑو سیوں نے اس پر مبارکباد کی بارش کی اور اس سند یافتہ طبیب کی خدمت میں اپنا خراج عقیدت پیش کیا جس کے ہاتھ میں اب ان کی زندگی اور موت کی باگ ڈور تھی۔

---

# خدا حافظ غرناطہ!

غرناطہ کی پُر مسرت مشرقی فضا میں عشرت کے دن بسر کرتے مجھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گھر سے آنے والے خطوں نے میری اِس پُرسکون حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اِس بہشتی پناہ گاہ سے رُخصت ہو کر مجھے پھر غبار آلود دُنیا کی گہما گہمی اور چہل پہل میں گُم ہو جانا تھا۔ سکون و راحت کی اِس خواب آور زندگی کے بعد میں اپنی دُنیا کے شور و شغب کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا؟ الحمرا کی شاعرانہ فضا کے بعد میں مادّی دُنیا کے غیر شاعرانہ ماحول میں کیسے جی سکوں گا؟

لیکن ایک دُنیا سے دوسری دُنیا میں جانے کے لئے مجھے زیادہ تیاری اور زیادہ ساز و سامان کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اور میرے ایک نوجوان انگریز ہم سفر کو ایک دو پہیوں والی گاڑی کے ذریعے مرشیا، القنت اور ولنشیا کے علاقوں میں سے ہو کر فرانس پہنچنا تھا۔ اور اس سفر میں ایک طویل الاعضا خادم کو، جو اپنی ہر بات میں کسی قزاق یا رہزن سے مشابہ تھا، ہمارا رہبر اور محافظ ہونا تھا۔ سفر کا سامان جلد ہی تیار ہو گیا لیکن روانگی کسی نہ کسی بہانے سے ملتوی ہوتی رہی۔ اور میں ٹھہرنے کا کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر کے اپنی پسندیدہ

سیر گاہوں کا گشت لگاتا رہا جن میں مجھے اب وہ حسن نظر آ رہا تھا جس پر اس سے پہلے میری نظر نہیں پہنچی تھی۔

وہ مختصر سی خانگی اور معاشرتی دنیا جس میں میں نے اتنی مدت گزاری تھی اب مجھے پہلے سے زیادہ حسین اور دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اور میرے میزبان میرے جانے کے تصور سے جتنے آزردہ و افسردہ تھے اُسے دیکھ کر مجھے یقین ہو رہا تھا کہ میرا جذبہ محبت رائگاں نہیں گیا۔ آہستہ آہستہ میری رخصت کا دن آ پہنچا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں تائی انطونیہ کے گھر جا کر اُن سے رخصت ہونے کی باقاعدہ اجازت لوں۔ میں کئی دن سے دیکھ رہا تھا کہ ننھی ڈولرس کا دل جذبات سے لبریز ہے اور ذرا ایک ذرا سی ٹھیس میں چھلک پڑے گا۔ اس لئے میں نے قصر سے خاموشی کے ساتھ رخصت ہو جانا مناسب سمجھا اور وہاں سے اس طرح شہر کی طرف چلا جیسے تھوڑی دیر بعد واپس آ جاؤں گا۔ میری گاڑی اور میرا رہبر پہلے سے وہاں موجود تھے۔ اور ان دونوں چیزوں کی موجودگی نے میرا راز فاش کر دیا تھا۔ مینول، ماتیو اور الحمرا کے دو تین بوڑھے سپاہی جن سے میں فرصت کے وقت میں گپ لڑایا کرتا تھا مجھے الوداع کہنے کے لئے شہر میں موجود تھے۔

اسپین کی بہت سی پرانی اور محبت آمیز رسموں میں سے ایک رسم یہ ہے کہ کوئی دوست باہر سے آتا ہو تو دو تین میل پہلے اُس کے خیر مقدم کے لئے پہنچتے ہیں اور اسی طرح جب کوئی دوست رخصت ہوتا ہو تو اُسے دو تین میل تک رخصت کرنے آتے ہیں۔ اس لئے جب ہماری گاڑی شہر سے روانہ ہوئی تو ہمارا طویل القامت رہنما اور محافظ گاڑی کے آگے آگے چل رہا تھا، مینول اور ماتیو اُس کے دائیں بائیں تھے اور بوڑھے سپاہی پیچھے پیچھے۔

غرناطہ کے شمال میں تھوڑی دور چل کر سڑک آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھنے لگتی ہے۔ اس جگہ پہنچ کر میں گاڑی سے اُتر پڑا اور مینول کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ مینول نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے دل کے بھید کھولنے شروع کر دیئے اور اپنی اور ڈولرس کی وہ داستانِ محبت دہرانے لگا جو میں ماتیو کی زبانی اس سے پہلے سُن چکا تھا۔ مینول نے مجھے خوش ہو کر بتایا کہ طب کی سند حاصل کر لینے کے بعد اب اُس کے اور ڈولرس کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہی اور بہت جلد پادری کے چند کلمات اُن کے رشتۂ محبت کو استوار کر دیں گے۔ مینول اس تصور سے انتہائی شاداں تھا کہ ڈولرس سے شادی کرنے اور قلعہ کا سرکاری طبیب بن جانے کے بعد اُس کی زندگی کی مسرتیں مکمل ہو جائیں گی۔ میں نے مینول کو اُس کے حسنِ انتخاب پر جی کھول کر داد دی اور یہ اُمید ظاہر کی کہ

شادی ہو جانے کے بعد ننھی ڈولرس کی وہ محبت جو اب تک کبوتروں اور بلبلوں کے حصے میں آتی تھی صرف اس کے لئے مخصوص ہو گی۔

جدائی کا وہ سماں واقعی غم انگیز تھا جب ایک ایک کر کے میں اپنے ان محبت کرنے والے میزبانوں سے رخصت ہوا۔ وہ سب آہستہ آہستہ پہاڑی سڑک کے نیچے اتر رہے تھے اور تھوڑی دیر میں پیچھے مڑ کر مجھے ہاتھوں کے اشارے سے الوداع کہہ رہے تھے۔ مینول کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا اس لئے اس نے جدائی کے اس صدمے پر غلبہ پا لیا لیکن غریب ماتیو کی حالت واقعی غیر تھی۔ وہ غالباً بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ مصاحب اور رہنما کے جو معتبر منصب میں نے اسے عطا کئے تھے وہ اس سے چھین لئے گئے ہیں اور اب اس کے پرانے فرغل اور تنہائی کے لمحوں سوا کوئی اس کا شریکِ غم نہیں۔ وہ شاید یہ بھی سوچ رہا تھا کہ محبت کی وہ بارش جو میں نادانستہ اس پر کرتا رہا تھا میرے جاتے ہی رک جائیگی۔ لیکن اس وقت مجھے بھی اس کی خبر نہیں تھی کہ اس کا مستقبل اتنا تاریک نہیں جتنا میں اور خود ماتیو سمجھ رہا تھا۔

ہوا یہ کہ میں نے اپنے الحمرا کے قیام میں ماتیو کی داستانوں اور اس کی جھوٹی سچی کہانیوں کو جتنا معتبر اور مستند سمجھا تھا اور اپنی سیاحت میں اسے رہنما کا جو درجہ دیا تھا اس سے ماتیو خود اپنی نظر میں بڑا معتبر ہو گیا تھا اور احساسِ نفس اور خود شناسی کے اس جذبے نے اس کے لئے زندگی کی ایک نئی راہ کھول دی تھی۔ میرے الحمرا سے رخصت ہونے کے بعد ماتیو نے الحمرا آنے والے سیاحوں کے لئے ایک باقاعدہ سیاح کی حیثیت حاصل کر لی اور اس تغیرِ حال کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسے پھر کبھی اپنے بھورے فرسودہ فرغل کو اپنا ہم جلیس بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

مغرب کے قریب ہماری گاڑی سڑک کے اس حصے پر پہنچی جہاں سے وہ پہاڑوں میں گم ہو جاتی ہے۔ یہاں ٹھہر کر میں نے غرناطہ پر آخری نظر ڈالی۔ جس پہاڑی پر میں کھڑا تھا وہاں سے غرناطہ، اس کے پاس کا وسیع و شاداب میدان اور اس میدان کو حلقہ کرنے والی پہاڑیاں پوری طرح نظر آ رہی تھیں۔ یہ جگہ اس مقام کے عین مقابل تھی جسے عرفِ عام میں "آنسوؤں کی پہاڑی" کہا جاتا ہے اور جہاں کھڑے ہو کر ابی عبداللہ نے الحمرا کی جنتِ ارضی پر آخری حسرت بھری نظر ڈالی تھی۔

غروب ہوتا ہوا سورج حسبِ معمول الحمرا کے سرخ برجوں پر غمناک کرنوں کا سایہ ڈالتا ہوا رخصت ہو رہا تھا۔ رخصت ہوتی ہوئی کرنوں کی دھندلی روشنی میں مجھے برجِ قمارش کا وہ دریچہ نظر آ رہا تھا جہاں میں بارہا اپنے آپ کو شیریں

خوابوں میں گم ہو چکا تھا۔ سورج کی آخری شعاعیں شہر کے کنجوں اور بوستانوں پر فیاضی سے اپنا سونا نچھاور کر رہی تھیں۔ گرمی کی نشیلی شام کا قرمزی دھندلکا میدان کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ ہر چیز حسن کی رنگینی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن میری وداعی نظر کو اس حسن میں سوگ کی ایک جھلک دکھائی دی اور میں نے اپنے دل میں سوچا "مجھے اس حسنِ سوگوار کو اپنی آنکھوں میں لبسائے یہاں سے فوراً رخصت ہو جانا چاہیئے۔ میں اپنے تصور کو سدا اس حسن و رعنائی سے رنگین رکھوں گا"۔

یہ سوچا اور تیزی سے نظریں اس حسین منظر کی طرف سے ہٹا لیں۔ گاڑی چند قدم آگے بڑھی اور غرناطہ اور الحمرا کا حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس طرح میری زندگی کا سب سے حسین خواب تمام ہوا۔ ممکن ہے کہ میرے قاری میرے اس حسین خواب کو محض خواب سمجھ رہے ہوں۔

---